جملہ حقوق ۱۹۲۲ء محفوظ

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نوید دورِ خوشکامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

# ہمایوں

مرتبۂ

میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء ایڈیٹر
مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضلِ دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

# فہرست مضامین بابت ماہ جولائی ۱۹۲۳ء

| جلد ۴ | حصۂ نثر | حصۂ نظم | نمبر ۱ |
|---|---|---|---|



انور کاتب

**مغربی اختراعات اور چین**۔ ایک فرانسیسی مقالہ نگار لکھتا ہے کہ چینی اکثر اُن ایجادات کے بانی ہیں جو یورپ کے لئے مائہ ناز ہیں مثلاً بحری کمپاس۔ چھاپہ۔ مُعلق پل۔ پکی سڑکیں مصنوعی کھاد۔ سرابی کل۔ جرمن چاندی۔ مختلف قسم کے رنگ۔ چینی غازہ۔ بارود وغیرہ + چین کی سرزمین میں معدنی تیل کی بہتات ہے یہاں تک کہ اپنے شہروں میں چینی اس کے ذریعے سڑکوں پر روشنی کرتے تھے + ایک قسم کی بیہوش کرنے کی دوائی یہاں ۲۲۰ء میں مستعمل تھی۔ نظریۂ نبض بھی چینیوں ہی کا خیال ہے +

**طویل العمری**۔ ڈاکٹر چارلس ایلیٹ جو امریکہ کے دارالعلوم ہارورڈ میں ۱۸۶۹ء سے ۱۹۰۹ء تک برابر چالیس سال صدارت کے عہدۂ جلیلہ پر قائم رہے اس وقت نوّے برس کے ہونے کو ہیں + مُبارکبادوں کے جواب میں نوجوانوں کو لکھتے ہیں کہ اگر آپ دیر تک زندہ رہنا چاہتے ہیں تو مفصلہ ذیل ہدایات پر کاربند ہوجئے۔ تھوڑا کھائیے۔ کم ازکم سات گھنٹے سوئیے اور کمرے کی کھڑکیوں کو رات بھر کھُلا رکھئے۔ ہر روز باقاعدہ طور پر کھُلی ہوا میں ورزش کیجئے۔ نشّی اشیاء سے پرہیز ہو لیکن تمام قدرتی مسرتوں سے بغیر زیادتی کئے حظ اُٹھائیے۔ اور سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ اپنی طبیعت کو ہر وقت حتی المقدور خوش اور بشاش رکھئے! کم ازکم مشرق میں خدا پر بھروسہ کرنا بھی لابدی ہے!

**دُنیا کا سب سے امیر آدمی**۔ غالباً راک فیلر کے بعد دُنیا کا سب سے متمول مسٹر ہنری فورڈ ہے جو مشہور موٹر فورڈ کا موجد ہے + دو برس ہُوئے فورڈ نے اعتراف کیا کہ اُسے روپے کی ضرورت آپڑی ہے مہاجن جی ہی جی میں خوش ہُوئے کہ شاید اس کی تباہی کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ لیکن اُس نے بجائے اُن سے قرض لینے کے اعلان کردیا کہ میرے موٹر اب کم قیمت پر بکیں گے بشرطیکہ بھیجنے والے روپیہ جلد سے جلد ادا کردیں۔ ان لوگوں نے تھوڑے عرصے میں تقریباً پونے تین کروڑ پونڈ مسٹر فورڈ کے خزانے میں بھیج دیئے + آج اُس کے پاس پندرہ سولہ کروڑ پونڈ کی جائداد ہے اور وہ ساٹھ لاکھ موٹر کار بنا کر بیچ چکا ہے!

# نسوانی دُنیا

ٹوکیو میں ایک مشہور جاپانی ماہر تعلیم ڈاکٹر سوایا ناگی کی زیر سرپرستی ایک مشترک زنانہ مردانہ سکول کھُلنے والا ہے۔ جس میں فی الحال پندرہ کم سن لڑکیاں اور پندرہ لڑکے داخل کئے جائینگے ؛

جزیرۂ فلپائن کی سینٹ نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ وہاں کی عورتوں کو حق رائے دیا جائے۔ لیکن اس فیصلہ پر اُس وقت عمل کیا جائے جب وہاں کی عورتیں خود متفقہ طور پر اِس حق کو حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کریں ؛

لندن میں اکثر شادی شدہ عورتیں بھی معلمہ گری کا کام کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سی کنواری لڑکیوں کو کام کی قلت کے باعث بیکار رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ حال میں لندن کی کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ سب شادی شدہ عورتوں کی جگہیں کنواری عورتوں کو دے دی جائیں۔ اِس فیصلے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لندن میں چار ہزار شادی شدہ عورتیں بیکار ہو جائینگی۔ اور بن بیاہی لڑکیاں اُن کی جگہ کام کرینگی۔ لیکن اگر کوئی عورت یہ ثابت کرسکے کہ اُس کے خاوند نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یا وہ بہت غریب ہے تو ایسی صورت میں اُس پر یہ قانون عائد نہ ہوگا ؛

جزیرۂ باڈوین جو آبنائے ٹورس میں واقع ہے اس وقت ایک عورت مسز زیحل نامی حکومت کر رہی ہے۔ نو سال کے عرصہ میں جو ترقی اُس جزیرہ نے کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ مسز زیحل نہ صرف ایک منتظم ملکہ اور ایک مدبر حکمران ہے بلکہ وہ اپنی رعایا کی اتالیق اور مذہبی رہنما بھی ہے۔ تعلیم وغیرہ کا انتظام نہایت اعلےٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے تمام قسم کی نشہ آور اشیاء کی ممانعت کردی گئی ہے اور برے آدمیوں کو وہاں داخل ہونے کی مطلق اجازت نہیں ہے ؛

---

مس ٹاٹا صاحبہ جن کا پورا نام مس متحصن اردشیر ٹاٹا ہے حال ہی میں انگلستان سے

بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے ہندوستان واپس آرہی ہیں۔ سُنا ہے کہ وہ مدراس ہائیکورٹ میں داخل ہونا چاہتی ہیں۔ جہاں آج تک کسی عورت نے کام نہیں کیا۔

ڈاکٹر فواد بے نے جو انگورا پارلیمنٹ کے ممبر ہیں نیویارک میں ترکی قوانین کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ترکی میں شادی کے متعلق دو قسم کے قوانین رائج ہیں۔ ایک تو ملکی قانون ہے جس کی رو سے ایک مرد ایک ہی شادی کر سکتا ہے دوسرا مذہبی قانون ہے جو خاص حالات میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔ جو شخص ملکی قانون کے مطابق شادی کرنا چاہے وہ ایک سے زائد شادیاں نہیں کر سکتا۔ یہ افواہ کہ ترکی حکومت نے ایک سے زیادہ شادیوں کی ممانعت کر دی ہے غلط ہے۔

محمد رفیع بیگم

ہمایوں

جلد ۴　　　نمبر ۱

جولائی ۱۹۲۳ء

# "ایک نقاش کی موت"

ادیب نقاش، ــــــ کامیاب نقاش تھا اور با اختیار ادیب، اُس نے اپنے موقلم کی جنبشوں سے فلسفہ و حکمت کے دریا بہا دئے تھے، اُس کا موضوعِ تخیل ہمیشہ "تحسین خلقت" اور "ثبات حیات" ہوتا تھا اور اِن عنوانات پر اُسکو بارہا، اپنے افکار دماغی اور نوادر ذہنی پیش کرنیکا موقع ملا تھا ــــــ!

پھر اس کو اس بات پر بھی ناز تھا کہ وہ مصنف بھی ہے اور نقاش بھی، علمائے نفسیات جن مسائل کو ذہن نشین کرنے میں بہ دقت کامیاب ہوتے تھے، اُن کو یہ اپنے موقلم کی چند سحر طراز کششوں سے واضح تر کر دینے پر قادر تھا ــــــ"

اک زمانے میں یہ اپنے انہماک مشاغل اور مطالعہ فطرت میں گم تھا، اتفاق سے اُس شہر کے دار العلوم میں علمائے علم النفس کے درمیان طبائع انسانی کی بعض کیفیات پر ایک معرکتہ الآرا اختلافی مذاکرہ قایم ہو گیا۔ فسق، حیا، اطمینان اور انفعال اپنی تخلیق کے مد و جزر سے حیات انسانی کا بیڑا جو ٹھکانے سے لگنے نہیں دیتے، اُن کا تجزیہ و انشراح نہ ہو چکا تھا اور اصل مسئلہ اپنے اسلوبِ نشر اور ادائے نقد کے لحاظ سے ابھی مُغلق ہی تھا کہ یہ ادیب نقاش بھی اس طرف ملتفت ہو گیا ــــــ،

اس نے فوراً اپنی جانب سے ایک نمایشِ مُصوّرہ کا اعلان کیا، اور مقررہ تاریخ پر، مجمع عام کے سامنے، اپنی قوتِ فکر و ذہانت کے چند نقوش، ایسے پراگندہ نقاب کئے جس سے عوام مبہوت رہ گئے، اور علما، حیران ــــــ!!

چشم ناظر کو سب سے پہلے جس مرقع ہدایت نے اپنی جانب متوجہ کیا وہ ان خصوصیات

پر مشتمل تھا!

موسم برشگال کی اک ولولہ انگیز فضا، دُور تک سبزۂ خودرو، افق میں ایسے بادلوں کے چھوٹے، بڑے ٹکڑوں کا پھیلاؤ اور جماؤ، جو برس کر کھل جانیکے بعد اکثر دیکھے جاتے ہیں، پھولوں کے اک کنج کے پاس ایک نابینا پیکرِ نسوانی کا نقشِ رنگین کھینچا گیا تھا، کتان کی باریک چادر میں جسم کچھ ڈھکا کچھ کھُلا، ظاہر کیا تھا، تمام اعضاء و جوارح سے تکمیلِ نمو، ہویدا تھی اور نہایت قدرت کے ساتھ شہرتِ صحت کا رنگ بھرا گیا تھا ——— اور اسکے نیچے "التہابِ شباب" اور توسین میں (فسق) لکھا ہُوا تھا ـ !

دوسری تصویر کا منظر صرف اس نزاکت کو محیط تھا کہ "چھوئی موئی" کی ایک شاخ اپنی فطری حالت پر نمایاں کی گئی تھی، اہلِ نظر میں چرچا تھا، ادیب نقاش نے شاخ کی لچک اور پتیوں کی رعنائی اور اُس کی خوئے منفعلہ کو بڑی قابلیت سے ضبط کیا ہے.. اس تصویر کا موضوعِ تخیل کیا تھا ـ ؟

"عصمت" (حیا) ———"

تیسرے مرقع میں ایک معمر عابد کی غربی اور مفلوک الحالی کو درد انگیز اسلوب سے دکھایا گیا تھا اور اُس کے لبوں میں اس صنعتِ نگارش کو صرف کیا تھا کہ دیکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ لب اب جنبش کیا چاہتے ہیں ——— اس ہیئت متخیلہ کا عنوان "دعا" (اطمینان) تھا ——— !

چوتھے پیکرِ مُصوّر میں اک عجیب دلکش بات تھی، ایک معصوم، خوبصورت طفلِ نوخیز، کچھ کچھ سہما کچھ ڈرا، کچھ متلاشی و جویاء ایک میدان، اک وسعتِ خشک میں کھڑا ہے، گردن میں مائل نشیب اک خم، نظر میں آمادۂ عروج اک انکسار اور تھکاوٹ، لب تکلم سے بیزار مگر التجا کی تصویر الفاظ میں سادہ مگر تضرع کی تفسیر ——— اس کا عنوانِ نگارش "آنسو" (انفعال) ـ تھا!!" کچھ بیان نہیں کیا جاسکتا کہ اس سیلابِ استعارہ و تلمیح، اور اس تموّج کنایات و تشبیہ سے سارے مجمع میں کس قیامت کی اک روشن لہر اِدھر سے اُدھر دوڑ گئی!

---

نمائش ختم ہوگئی ـ اور ادیب نقاش کی شہرت میں مزید عزتوں کا اضافہ ہُوا، مگر وہ ہمیشہ محسوس کرتا تھا کہ میری جودت و ذہانت کے یہ تمام نقوش میری قدردانی کا ذریعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن میری

مشق فن کے لئے تکمیل کا باعث نہیں ـــــ اُسکی قوت متخیلہ ہمیشہ اسی فکر میں الجھی رہتی تھی کہ مجھ سے عالم کے اس سادہ سے ورق پر کوئی ایک نقش تو ایسا ثبت ہو جائے جو میری اصابتِ فکر، اور مشقِ بلیغ کے لئے سندِ تکمیل ہو ـــــ"

برس گذر گئے، فکریلوں ہی رائگاں رہی اور نقوش بے اثر و بیکار، اک شب وہ اپنے عہد ماضی کا جائزہ لے رہا تھا اور اُس کا خیال مصروفِ تصفیہ تھا کہ اُسکے مُنہ سے تاسف آمیز لہجہ میں نکلا، "تمام عمر افرادِ انسانی کی کیفیات کو لکھا، جذباتِ عمرانی کے خاکے کھینچے، آثارِ تہذیب و تمدن کو نمایاں کیا، اخلاق و فرائم کی شکلیں بنائیں ـــــ مگر حیف ثباتِ حیات، کا کوئی نقش میرے موقلم سے نہ بن پڑا، کاش میرے نگارخانہ میں کچھ نہ ہوتا ـــ لیکن اک نقش، جس سے میری جمعیت نفسی سبق لے سکتی ـــــ!!"

---

صبح کو اُس شہر کے تمام چھوٹے، بڑے اس جانکاہ خبر سے آگاہ تھے کہ رات کو، اس بستی کا سب سے بڑا فاضل ادیب، اور فلسفی نقاش مر گیا، اور ثباتِ حیات؟ کا وہ نقشِ آخرین جس کو یہ اپنی زندگی میں پُورا نہ کر سکا تھا اسکو آج اپنی موت کے رنگ سے مکمل کر گیا ـــــ!

---

اسکے آس پاس اربابِ علم جمع ہیں، بالین اور پائین پر قدردانی اور شہرت موجود، ادیب نقاش کے سیدھے ہاتھ کی جانب وہ دنیا ہے جو رفاقت اور معیت کی دُنیا کہلاتی ہے اور کھرے، کھوٹے کو پرکھتی ہے اور دستِ چپ کی جانب اک کھلا ہوا باقی منظر ہے جس میں اُدھر کچھ آثار تمدن و تہذیب نظر آتے ہیں اور اُدھر دُور کچھ کنگرہ ہائے ایوانِ امارت۔ اور یہ وہ عالم ہے جو بہرطور مٹ کر رہیگا ـــــ اسی جانب کا ہاتھ کھلا ہوا ہے اور دراز، جو استعارہ ہے قیامِ بے ثبات، اور تہی سامانی کا، سیدھے ہاتھ کے قریب اک تسبیح پڑی ہوئی ہے جو ادیب نقاش نے اپنے تمام عمر کے گدازِ قلب اور نمِ دیدہ سے مرتب کی ہے ـــ ابیہوش انسان!! اب اُسکے حضور پیش ہونیوالا ہے جہاں یہ متاعِ عزت، نقوشِ مادی یکسر نقطۂ بے آب و رنگ ہو جائینگے، اور پوچھا جائیگا کہ اگر اس دفتر میں کوئی نقش عمل صالح ہے تو پیش کر ـــــ آہ!

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا    کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

خلیقی دہلوی

# علم الجرائم

ایک جرمن مدبر کا قول ہے کہ قوموں کے تمدن و معاشرت اور اُنکی ترقی و تنزل کا راز اُنکی ادبیات میں مضمر ہے۔ کسی مُلک میں عمدہ اور مفید علمی و ادبی کتب کا شائع ہونا اُسکی رفتار ترقی کا بہترین مظہر ہے۔ کیا کہا جائے ہندوستان کی نسبت جسکے لٹریچر میں ہر سال مفید مطلب کتابوں کا نہایت کم اور ذلیل و غیر مفید لٹریچر کا اضافہ اسقدر ہوتا ہے کہ مجھے کہنا پڑیگا کہ اُنکی تعداد ۲ اور ۵۰ کے برابر ہے اور ایسا لٹریچر جسے بقول رسکن" اُن میں سے زیادہ تر تعداد ایسی کتب کی ہے جنکو صرف چھونا چاہیئے اور پھر عہد کر لینا چاہیئے کہ ہم دوبارہ اس کتاب کو ہاتھ نہیں لگائینگے"۔ لیکن ہندوستان کے ایسے لٹریچر کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ اس قابل بھی نہیں کہ اُسے ہاتھ سے چھوا جا سکے۔ ہندوستان کے تمام کتب خانوں (باستثنائے چند) کی چھان بین کریجئے آپکو ہزاروں من کی تعداد میں ایسی اخلاق سوز۔ بے معنی۔ لغو۔ لچر اور انسانیت کے زینہ سے گرے ہوئے خیالات سے لبریز کتابیں ملینگی۔ جنہیں ہاتھ لگانا بھی گناہ کبیرہ کے برابر ہے۔ صوبہ پنجاب کی مطبوعات کی سرکاری رپورٹ (بابت ۱۹۱۴ء) مظہر ہے کہ بلحاظ تعداد حالت نہایت اطمینان بخش ہے لیکن بلحاظ نوعیت و مضامین انتہا درجہ مایوس کن۔ چنانچہ ان کتابوں میں زیادہ تعداد ہیر رانجھا۔ سسّی پنوں۔ لیلیٰ مجنوں۔ سوہنی مہینوال جیسے پرانے اور عشق انگیز قصّوں کی ہے"۔ جب اس صوبہ کی یہ حالت ہے جس میں مَیں پیدا ہُوا۔ بڑھا اور اس قابل ہُوا کہ تحریر کے ذریعہ اپنے ابنائے وطن کی کچھ خدمت کر سکوں تو مجھے مایوسی ہوتی ہے لکھتے ہُوئے کہ جب مذاق عامیانہ کی یہ حالت ہے تو کوئی خالص علمی مضمون لکھنا نہ صرف تضیع اوقات بلکہ ایک قسم کی حماقت کا ارتکاب ہے بعینہٖ یہی حالت اُس صوبہ کی ہے جو اُردو زبان کا مولد و وطن ہے اور جسکے باشندوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ مندرجہ بالا مبحث پر بحث کرتے ہُوئے۔ ہے وے لوک ایلس اپنی کتاب "دی کرنل" میں لکھتا ہے"۔ ان معاملات میں موجودہ وقت کو مدنظر رکھتے ہُوئے ہم بہت پست حالت میں ہیں۔ اس فن پر کوئی کتاب سوائے کسی اخباری مضمون کے انگلستان میں نظر نہیں آتی"۔ یہ حالت ہے اُس ملک کے مصنفین کی جہاں اس فن پر

سینکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں موجود ہیں اور اُن ہزاروں کی تعداد کو وہ ناکافی سمجھتے ہوئے تجاہلِ عارفانہ سے "ایک کتاب نہ ہونے" کے برابر سمجھتے ہیں اور شاید اس موضوع پر ہندوستان میں کوئی ایک کتاب تو کیا کوئی مضمون بھی نہ لکھا گیا ہو۔ بہر حال میں نے اس پر مغز علمی مضمون کو دلچسپ اور جاذبِ توجہ بنانے کی کوشش کی ہے مگر نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اسی "ایڈونیچر" میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ یہ قارئین کرام کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

اقوام کی جنگ اختتام پذیر ہو چکی۔ لیکن مجرمین اور مہذب سوسائٹی کی کشمکش ابتدا سے چلی آئی ہے اور انتہا تک رہیگی۔ ممکن ہے کہ ایک ایسا زرّین وقت آجائے جس میں تمام جرائم پیشہ لوگ دیانتدار و نیک نیت شہری بن جائیں مگر موجودہ حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایسا خیال ابھی پیش از وقت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے اعداد و شمار اس بات کے شاہد ہیں کہ جرائم کی تعداد میں بجائے انحطاط کے نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔ سائنس اور تمدن کے دوش بدوش جو ترقی اس شعبہ میں ہوئی ہے۔ وہ حیرت انگیز ہے۔ بقول ایڈورڈ ایچ سمتھ[1] موجودہ زمانہ کا ایک مہذب و سائنسدان نقب زن ایسے آہنی صندوق کو جسے ازمنہ متوسطہ کا علم طبعیات سے بے بہرہ چور آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں کر سکتا تھا، آنِ واحد میں طبعی آلات سے توڑ کر رکھ دیگا۔ ایک مجرم کا جدت پسند دماغ کسی مدبر۔ مصنف یا موجد کے دماغ سے کم کام نہیں کرتا۔ اگر اراکین بلدیہ شہر کی صحت و صفائی اور اُسکی خوبصورتی کے لئے تجاویز سوچتے ہیں۔ اگر ایک انجنیر دو سمندروں کو آپس میں ملانے کے لئے دماغ سوزی کرتا ہے تو ایک مجرم بھی اُسی ہوشیاری، اُسی دانائی سے ارتکابِ جرم کا تہیہ کرتا ہے جس طرح ایک موجد کسی محیر العقول مشین کے خاکے تیار کرنے میں اپنی ذکاوتِ طبع کا ثبوت پیش کرتا ہے اسکے متعلق میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرونگا:-

دن[2] کسی کے اقبال کی طرح ڈھل چکا تھا۔ سلطانِ خاور گردشِ زمانہ سے تنگ آکر دامن

[1] علم الجرائم کا مشہور ماہر جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ امریکہ کے تقریباً ہر ایک نقب زن مجرم کو جانتا ہے۔ سیفس اینڈ سیف بریکرز۔ I ۔

[2] دی کلیوریسٹ کرائم آن دی ریکارڈ۔ سٹرینڈ۔

مغرب میں روپوش ہونے کو تیار تھا کہ واٹسن[۱] اینڈ سنز مشہور جوہریوں کی عالیشان و سربفلک عمارت کے دروازہ پر ایک دواسپہ فٹن آکر رُکی جس میں سے ایک فرنگی النسل رئیس جس کے خدوخال نہایت موزوں لیکن آنکھیں قدرے چمکدار تھیں۔ صاف ستھرے لباس میں ملبوس باہر نکل کر دکان کے وسیع ہال میں داخل ہوُا جہاں شاندار بلوری الماریوں میں بیش بہا جواہرات جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ معزز گاہک پر نظر پڑتے ہی ادھیڑ عمر بھاری بھرکم مینیجر اسکے استقبال کے لئے آگے بڑھا اور مودبانہ سلام کرکے اُس کی تشریف آوری کا سبب دریافت کرنے لگا۔ نوجوان رئیس زادہ نے لحیم و شحیم شلجم جیسی رنگت والے مینیجر کو از سرتا پا ایک ہی نظر میں بھانپ لیا پھر دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر کہنے لگا "میں کچھ عمدہ جواہرات دیکھنا چاہتا ہوں"

"بصد شوق، تشریف لائیے" یہ کہکر دن بھر کا تھکا ماندہ مینیجر اُسکے ساتھ ہولیا اور تقریباً تمام دُکان کی اُسے سیر کراتا رہا۔ آخر پندرہ بیس منٹ کی دیکھ بھال کے بعد نوجوان نے ایک ہیرا پسند کر کے کہا "اِسکی قیمت؟"

دن بھر کے نئے واقعات و تجربات سے پُر اُمید مینیجر کے چہرے پر شگفتگی و بشاشت کے آثار ہویدا ہوُئے۔ اُس نے دھندلی نگاہوں سے معزز امیرزادہ کے مکلف لباس پر نظر ڈالتے ہوئے نہایت اطمینان بھرے لہجہ میں جواب دیا "اسکا نام فخرِ ایشیا ہے۔ قیمت بیس ہزار روپیہ!"

بیس ہزار کی رقم کا نام سُن کر متمول نوجوان کا دل سینے میں پھڑنے لگا۔ اخر ایک لمحہ کے توقف کے بعد اُس نے ہیرا میز پر رکھ کر دھڑکتے ہوُئے دل سے کہا "میں اسے خرید ونگا مگر اس کے ساتھ کا ایک اور بھی چاہیئے کیونکہ مجھے جوڑا درکار ہے"

یہ سنتے ہی قوی الجثہ مینیجر کے منہ سے ہلکا سا قہقہہ نکل گیا اُس نے ہیرا ہاتھ میں اُٹھاکر جواب دیا "شاید آنجناب کو یہ معلوم نہیں کہ جواہرات کی تجارت میں یہی تو نقص ہے

---

۱۔ [illegible] تخیل [illegible] آمیز [illegible] سے اس واقعہ کو فسانہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

اول تو اس کے ساتھ کا ملیگا نہیں جو اگر کچھ شکل و شباہت۔ رنگ اور وزن میں ملتا جلتا ہاتھ لگ گیا تو اُس کی قیمت دگنی ہو جائیگی یعنی چالیس ہزار روپیہ"

"کچھ پروا نہیں" مدمغ امیر نے گردن بلند کر کے اور سینہ کو وسعت دیکر کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اپنی محبوبہ کی ایک ادنےٰ سی خواہش کی تکمیل کے لئے کسی شہزادہ کے واسطے چالیس ہزار روپیہ خرچنا بار گراں ہے"

مینجر کی آنکھیں کھل گئیں اور اس وقت تک اُس نے نوجوان کی طرف جو کچھ بے پروائی ظاہر کی تھی وہ عزت و تکریم سے مبدل ہو گئی، اُس کے چہرے پر ندامت کی سُرخی جھلکی پھر مود بانہ انداز میں کہنے لگا "یور ہائینس۔ میرا یہ خیال ہرگز نہ تھا بلکہ میں نے ایک ایسا نقص بیان کیا جس کا ہر جواہرات کے خریدار کو سامنا ہوتا ہے"

جہاندیدہ مینجر کی شرمیلی ادا اور خفت آب طرز کلام نے فرخندہ بخت شہزادے کے چہرے پر ایک لطیف تغیر پیدا کر دیا۔ اُس نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اُٹھا کر کہا "آپ میرا چالیس ہزار کے لئے آرڈر درج کر لیں اور ایک ہفتہ کے اندر مجھے دوسرا ہیرا خرید دیجئے۔ میں جمعہ کے روز آپکی دوکان پر آؤنگا۔ یہ بیس ہزار کا ہیرا میں لئے جاتا ہوں"

یہ کہکر اُس نے بیس ہزار کے نوٹ گن دئے۔ ہیرا اور رسید لیکر وہ چند قدم بڑھا لیکن پھر پلٹ کر مینجر سے مخاطب ہو کر بولا "غالباً آپ مختلف اخبارات میں اشتہار دینگے؟"

مینجر نے جو اس ہیرے کی فروخت کے متعلق اپنے رجسٹروں میں ضروری اندراج کر رہا تھا آہستہ سے سر اُٹھا کر کہا "جی ہاں۔ آپکا خیال درست ہے"

دوسرے روز مشہور اخبارات کی بعد از دوپہر اشاعت میں واٹسن اینڈ سنز جوہریان کی طرف سے کسی خاص قسم، وزن اور رنگت کے ہیرے کا اشتہار تھا جس کے لئے انہوں نے تیس ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ تقریباً تین دن صبح و شام متواتر یہ اشتہار مختلف جرائد میں شایع ہوتا رہا حتیٰ کہ ہر معروف و غیر معروف جوہری کی نظر سے گذر گیا۔ چوتھے روز صبح دس بجے کے قریب ولیم میز، بیکر سٹریٹ کے مشہور جوہری کی دکان میں ایک خوبصورت نوجوان داخل ہوا جسے دیکھتے ہی ایک عورت اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔ نوجوان

نے اُسکے سلام کا جواب دیکر کہا "میں مسٹر میز سے ملنا چاہتا ہوں"
ملازم لڑکی بغیر کسی مزید جرح قدح کے اُسکے ساتھ ہولی اور وسیع دکان کے غرب رویہ ایک کمرہ کے آگے جا کھڑی ہوئی جسکے باہر پیتل کے چمکتے ہُوئے حروف میں "ولیم میز" لکھا ہُوا تھا، پھر وہ نوجوان ملاقاتی کا کارڈ لئے کمرہ کے اندر چلی گئی اور ایک منٹ کے بعد باہر آکر بولی "تشریف لے جائیے"
دوسرے لمحہ میں نووارد ملاقاتی مشہور جوہری کے سامنے کھڑا تھا جس نے خندہ پیشانی سے ہاتھ ملاکر اُسے پاس کی کرسی پر بیٹھ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ نوجوان نے اُس کا شکریہ ادا کرکے اپنی جگہ بیٹھتے ہُوئے کہا "میں ایک ہیرا فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ کئی دن سے میں اپنے روپے کا انتظار کر رہا تھا مگر اسکی آمد میں غیر معمولی تاخیر کے سبب میں اپنے جواہرات بیچنے پر رضامند ہوگیا ہوں" یہ کہکر اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک خوبصورت مخملی ڈبیہ نکالی اور اُسکا ڈھکنا اُٹھا کر جگمگاتا ہُوا ہیرا جوہری کی میز پر رکھ دیا۔ ولیم میز نے نوجوان کے چہرے کی طرف بغور دیکھا جس کے خدوخال اس وقت پوری عریانی اور اصلی دلآویزی میں چمک رہے تھے پھر اُسکے کارڈ پر ایک نظر غائر ڈال کر کہنے لگا "کیا کوئی ایسی سخت ضرورت پیش آگئی جو آپ اس گرانبہا چیز کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں؟"
مستعد نوجوان کے دل میں بے چینی کا جذب متحرک ہُوا، اُسکے لبوں پر خفیف تبسم اور آنکھوں میں معصومیت کی حیا پیدا ہوگئی پھر وہ پختہ کار تاجر کے سینے پر اپنی شرمیلی نگاہیں گاڑکر بولا "میرا ایک خوبصورت رقاصہ کو آج روپیہ ادا کرنیکا وعدہ ہے۔ اگر میں آج بارہ بجے سے پیشتر اُسکے لواحقین کو مقررہ رقم نہ ادا کردوں تو وہ کسی اور سے شادی کر لیگی۔ کیونکہ اس حسن و محبت کے معرکے میں میرا حریف ایک بجے اُسے ساتھ لیکر امریکہ چلا جائیگا"۔
سالخوردہ جوہری کے دماغ میں چند متناقض خیالات پیدا ہُوئے مگر نوجوان کی شکل و شباہت، اُسکا مکلف لباس اور طرز تکلم اُسے معزز و بارسوخ امیر ظاہر کر رہا تھا۔ اُس نے خوبصورت ڈبیہ کو اُٹھا کر ہیرا ہاتھ میں لیکر اچھی طرح دیکھا بھالا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ اُسی قسم

کا پتھر تھا جس طرح کا واٹسن اینڈ سنز نے اپنے اشتہار میں تیس ہزار روپے پر طلب کیا تھا وہ مسرور و مطمئن ہو گیا۔ اُس کے دل سے جملہ شبہات و شکوک اس طرح دُور ہونے لگے جس طرح سیاہ بادل ہوا کے تیز و تند جھونکوں سے دھوئیں کی طرح پریشان ہو کر فضا میں اُڑنے لگتے ہیں۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر پچیس ہزار پر بھی یہ ہیرا خرید لیا جائے تو ایک ہی سودے میں پانچ ہزار کا منافع ہے، مگر دوسری طرف اُسکا تجربہ اُسے بتا رہا تھا کہ شاید ایسا عیاش و شوریدہ سر نواب زادہ اس گرانمایہ جواہر کو اونے پونے داموں پر پھینک کر چلا جائے۔ یہ سوچتے ہی اُس نے اپنی گھڑی کی طلائی زنجیر کو انگلی پر لپیٹ کر کہا" اچھا۔ اگر آپ اسے فروخت ہی کرنا چاہتے ہیں تو کیا دام لینگے؟"

یہ سنتے ہی بانکے امیر کی رگ رگ میں اُمید و آرزوؤں کا خون اُبل گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ کسی نے دفعتاً اُسے سمندر کی گہرائیوں سے باہر کھینچ لیا ہے۔ اُس نے متبسم و فہمیدہ نگاہوں سے چابک دست جوہری کی طرف دیکھا پھر سر نیچے ڈال کر کہنے لگا" تیس ہزار کی خرید ہے۔ آپ جو مناسب سمجھتے ہیں دیدیں مجھے اس وقت روپے کی سخت ضرورت ہے"۔

بالآخر جوہری کا خیال بالکل درست نکلا کیونکہ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا کہ اوباش و آشفتہ طبع عشاق ضرورت کے وقت روپے کی چیز دو آنہ میں دیکر بھی اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر یہ بھرایا ہوا نصیب آزما جوان یہاں سے بدظن ہو کر کسی اور جوہری کے پاس چلا گیا تو یقیناً وہ اس منفعت بخش ہیرے کو فوراً خرید لیگا۔ خیالات کی اس چند لمحہ جنگ کا فیصلہ کر کے اُس نے جواب دیا" میں پچیس ہزار سے زاید نہیں دے سکتا۔ اگر منظور ہو تو چک کاٹ دوں۔ نہیں تو آپ کی مرضی۔ دیکھ لیجئے شاید کوئی اس سے بھی زیادہ دینے والا آپ کو مل جائے"

بیدار بخت نوجوان ولیم مینز کے شریفانہ انداز گفتگو سے مرعوب ہو گیا۔ پھر اُسکی پُر جسارت آنکھوں سے منفعل ہو کر بولا" میں کہیں اور نہیں جا سکتا۔ وقت میرے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ آپ پچیس ہزار ہی دیں مگر چک میرے مصرف کا نہیں۔ آپ

جانتے ہیں۔ مجھے بارہ بجے سے پیشتر روپیہ ادا کرنا ہے۔ بینک سے روپیہ لینا میری تمام محنت رائیگاں کر دیگا، مہربانی کر کے نقد دلوا دیجئے"

سرد و گرم چشیدہ جوہری ایک گہری سوچ میں اُتر گیا مگر جلد ہی اپنے حواس درست کر کے کہنے لگا" نقد روپیہ تو آپ سمجھتے ہیں کاروباری آدمیوں کے پاس رہتا نہیں چونکہ آپ کی فوری ضرورت بھی میرے پیشِ نظر ہے اگر آپ نصف نقد اور بقیہ نصف کے لئے چک قبول کریں تو میں حاضر ہوں"

نوعمر رئیس کا دل مسکرانے لگا مگر نمایشی طور پر ایک ٹھنڈا سانس لیکر اُس نے کہا " آپکی مرضی لیکن جلد کیجئے۔ مجھے ابھی ایجنٹس سٹریٹ تک جانا ہے"

اس امر کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بقیہ کام کوئی دقت طلب امر نہ تھا، ولیم میز نے ہیرا جانچ تول کر ساڑھے بارہ ہزار کے نوٹ اور بقیہ رقم کا کاونٹی بینک کے نام چک کاٹ دیا۔ رسید لکھی گئی اور اطمینان بھرے طریق سے نوجوان نے اُس پر دستخط کر کے اپنی ٹوپی اُٹھالی۔ میز نے خندہ پیشانی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا" اُمید ہے کہ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے"۔

وجیہہ نوجوان کے چہرے پر عرقِ انفعال آگیا۔ اُس نے زمین کی طرف دیکھ کر کہا۔ " شکریہ۔ آپکی بروقت امداد کا ممنون ہوں" یہ چند الفاظ ادا کر کے وہ کمرہ سے باہر نکل گیا۔ ولیم میز نے اُس کے کارڈ پر دوبارہ ایک عمیق نگاہ ڈالی پھر ہیرا ہاتھ میں لیکر اُسے اچھی طرح جانچا اور اس بات سے مطمئن ہو کر کہ اُس نے صبح صبح کوئی بُرا سودا نہیں کیا مسرت و طمانیت کا سانس بھرتے ہوئے اپنے مضبوط جسم کو کرسی پر گرا دیا۔

× × × × × × × × × × × × ×

بعد از دوپہر ولیم میز وہی بیش بہا ہیرا لئے واٹسن اینڈ سنز کی دکان میں داخل ہوا اور ایک میز کے سامنے کھڑا ہو کر ایک پچپن سالہ آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو بڑی محویت سے اپنے کاغذات کی دیکھ بھال میں مصروف تھا آخر ایک لمحہ انتظار کرنے کے بعد اُس نے آہستہ سے کہا" ہیلو راجرس آج تو تم بے طرح مصروف ہو"!

راجرس نے چشمہ دار آنکھیں اُٹھا کر اپنے متکلم کی طرف دیکھا پھر شگفتہ آواز میں اُٹھ کر کہنے لگا "ہیلو میز آؤ، کیسے آئے، کیا تمہارے جیسے مصروف تاجر بھی کسی وقت فرصت کا منہ دیکھ سکتے ہیں؟"

میز نے ایک بلند قہقہہ لگا کر جواب دیا "دوست فرصت ہمیں کہاں نصیب۔ تمہارے ہی کام کو آیا تھا تم نے ایک ہیرے کا اشتہار دے رکھا ہے بس وہی لایا ہوں"

راجرس کے چہرے پر بہجت و شادمانی کی سُرخی دوڑ گئی اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "واللہ تم بھی غضب کے آدمی ہو۔ بر وقت لائے، ہمارا شہزادہ بھی اسکے متعلق ہر روز استفسار کرتا تھا۔ سچ کہنا اس سودے میں کتنے ہاتھ رنگے ہیں؟"

میز نے بغیر کسی جواب کے کوٹ کی جیب سے ڈبیہ نکال راجرس کے ہاتھ میں دیدی ڈبیہ کی ظاہری صورت دیکھتے ہی راجرس کے دل پر بدگمانی کا جھٹکا لگا۔ اُس نے آہستہ سے ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا پھر یکلخت اُس کے منہ سے نکلا، "توبہ۔ خدا کی پناہ۔ میز تم نے سخت دھوکا کھایا"

میز کے سفید فام چہرے پر معاً سیاہی پھیل گئی۔ اُس نے مجروح پرندہ کی طرح آنکھیں پھاڑ کر راجرس کی طرف دیکھا پھر دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھال کر کہنے لگا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"

راجرس نے خوفزدہ آنکھوں سے میز کے چہرہ کی طرف متجسس نگاہ ڈال کر کہا "خدا کے لئے یہ تو وہی ہیرا ہے جو ہماری دُکان سے بک چکا ہے۔ وہ شہزادہ تو کوئی بے ایمان ٹھگ معلوم ہوتا ہے، دیکھو کیسا جال بچھا کر تمہیں لُوٹ لے گیا"

میز کے دماغ میں غصہ اور ناامیدی کی چنگاریاں اُڑنے لگیں۔ اُس کا تمام جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ بلند ترین پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر رُوئی کے گالوں کی طرح محو پرواز ہے اور راجرس کا یہ سوال کہ "تم نے آخر یہ ہیرا کتنے داموں پر خریدا" اُسے اس طور سُنائی دیا جس طرح سمندر کے تیز و تند طوفان میں کوئی ہلکی سی آواز سُنائی دیتی ہے، لیکن اُسکی یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ وہ ایک پختہ کار جسم اور مضبوط اعصاب و دماغ کا آدمی تھا، چنانچہ تفکرات کا یہ غیر مترقبہ حملہ اُسکے قوائے ذہنیہ

نے آن کی آن میں پس پا کر دیا۔ اسکے دماغ سے خیالات مجتمع کی گرہ کھل گئی اور اُسے یاد آگیا کہ راجرس نے اُس سے کوئی بات پوچھی تھی جو ہجوم تردداتِ میں اُس کے ذہن سے محو ہو گئی۔ اپنی اس کمزوری پر اُسے ہنسی آگئی اور مسکراہٹ بھرے ہونٹوں سے اُس نے پوچھا "ہیں۔ تم نے کیا دریافت کیا تھا؟"

راجرس کے دل میں ہم پیشہ جوہری کے نقصان پر محبت و ہمدردی کی لہر دوڑ گئی اُس نے اپنے سوال کا اعادہ کرتے ہوئے کہا "تو کیا روپیہ نقد ادا کیا گیا تھا؟"

میز نے نہایت متانت بھرے لہجے میں جواب دیا "نہیں ساڑھے بارہ ہزار نقد اور ساڑھے بارہ ہزار کا چک!"

راجرس نے گھبرائے ہوئے دل سے شفقت مآب آواز میں کہا "اگر ساڑھے بارہ ہزار کا چک دیا ہے تو ہمیں فوراً بینک کو اطلاع دینی چاہیئے کہ روپیہ ہرگز ادا نہ کیا جائے"

اس معقول مشورہ نے میز کے دل میں اُمید و تقویت کی رُوح پھونک دی۔ راجرس جھپٹا ہوا ملحقہ میز سے ٹیلیفون اٹھا کر پوچھنے لگا "کونسے بینک پر چک کاٹا تھا"

میز نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "کاونٹی بینک کے نام"

لیکن فوراً ہی بینک کے مینجر سے معلوم ہو گیا کہ روپیہ گیارہ بجے کے قریب ادا کر دیا گیا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا دو تین گھنٹہ کا وقفہ ایک مجرم کے فرار ہونے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ میز اس نئی عیاری اور جدید طرز فریب کاری پر حیران ہیرا اُٹھائے اپنی دوکان کو لوٹ گیا۔

اسی قسم کے کچھ ہندوستانی واقعات بیان کرنے سے پیشتر میں متمدن ممالک کے مہذب اور تعلیم و تربیت یافتہ چوروں کے کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں جہاں اختراعات و اکتشافاتِ جدیدہ میں یورپ و امریکہ کا کوئی ہمسر نہیں وہاں فریب کاری میں بھی اُن کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ اسی سلسلہ میں یہ بیان کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ امریکہ[1] کے ایک بڑے شمال مغربی شہر میں کچھ دیر چوروں نے چوروں کے لئے حکومت

---

[1] یلننگ نگ کر امڑ۔ مندرجہ سائینٹفک امریکن، جولائی ۱۹۲۲ء۔ صفحہ ۳۸۸

کی کمشن طرز کی گورنمنٹ کے مروج ہونے سے پیشتر اشرار الناس کے چند ایک گروہوں نے باہمی مشورہ و اتفاق سے وہاں اکٹھا ہونا شروع کیا۔ ان مختلف القماش جماعتوں میں محنتی مزدور۔ جیب کترے، لوسر باز دکانوں سے چیزیں چرانے والے، مکار، قمار باز، ٹھگ، فریبی اور اسی قسم کے بیشمار پیشہ ور شامل تھے۔ انکے علاوہ عورتوں کی ایک ایسی جماعت جنہیں لایق قانون دانوں نے ہدایات دی تھیں، وہاں پہنچ گئی۔ یہ لوگ قدرتی طور پر نہایت خلیق و ملنسار تھے اور قلیل عرصہ میں دُوپال[1] کے گردونواح میں بھی ان نوواردوں نے اپنا حلقہ دوستی وسیع کر لیا۔ لیکن خدا معلوم شرافت و اخلاقیات کے ان بدترین دشمنوں نے سادہ لوح شہریوں پر کس طرح اتنا رسُوخ حاصل کر لیا۔ کہ بالآخر وہ ایک بدمعاش کو وہاں کا میئر مقرر کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ بدقماش میئر جس طرح بدچلن عورتوں اور لوٹ کے روپے کا شائق تھا اُسی طرح چوروں اور ہم پیشہ رہزنوں کا ہمدرد و محافظ بھی۔ بطور میئر اُسکا فرضِ اولیں یہ دیکھنا تھا کہ آیا پولیس کا افسر اعلےٰ اُس کے مطلب کا آدمی ہے یا نہیں۔ خود پولیس کا عملہ زیادہ تر مشتبہ چلن اشخاص۔ رذیل پیشہ اور آوارہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ اس عہدِ ہمایوں میں ایک سفید لڑکی اور سفید روپیہ ایسا ہی محفوظ تھا جس طرح کسی گرسنہ بلی کے پنجوں میں کوئی ننھی سی چوہیا۔

دُوپال کی کج رو جماعتوں کے لئے یہ دن نہایت پُر بہار اور آرام وسکون کے ایام تھے جہاں کی پولیس ہر وقت اُن مواقعات کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی جہاں لوٹ مچائی ہوتی تھی۔ اگر موقعہ واردات کے قریب کوئی گاڑی وغیرہ دستیاب نہ ہو سکتی تو شہر کی حفاظتی گاڑیاں لوٹ کا مال اُٹھانے کے لئے طلب کی جاتی تھیں۔ لوہے کے صندوق اُٹھا اُٹھا کر ریل کے صحنوں میں بھک سے اُڑا دئے جاتے تھے۔ اگر کوئی شریف النفس شہری موقعہ واردات پر پہنچ کر کسی قسم کی دخل اندازی کرتا تو فوراً ہی ایک اُچکا اُسکے

---

[1] مسٹر گائیلز نے اس شہر کا اصلی نام نہیں بتایا لیکن یہ واقعہ بیان کرنے کے لئے اس شہر کا فرضی نام دُوپال رکھ دیا ہے۔

گلے کا ہار ہو جاتا اور جب اُس غریب کی خوب مرمت ہو جاتی تو نقض امنِ عامہ کے جرم میں اُسے قید کر لیا جاتا۔ نواحی مواضعات بھی اُنکے حملوں سے نہ بچ سکے جہاں سے برسات کے اولوں کی طرح روپیہ اکٹھا کر کے جرائم کے دارالصدر میں لایا جانے لگا۔ تفریحی طور پر ریلگاڑیاں بھی لوٹی جانے لگیں چنانچہ صرف ایک ہی گریٹ نارون اکسپرس سے زائد از چالیس لاکھ روپیہ حاصل کیا گیا۔ یہ زرو جواہر شراب خانوں میں جمع اور قمار خانوں میں پوشیدہ رہنے لگا اور شیر مادر کی طرح اُڑایا جاتا تھا۔ لیکن تا بکے۔ آخر کار فیڈرل گورنمنٹ تحقیقات کے لئے اُس شہر میں گئی اور دیانتدار عنصر کی مدد سے شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں چنانچہ اُس مجمع میں جو قید خانہ جا رہا تھا شہر کے چیدہ چیدہ افسر بھی شامل تھے۔ لیکن کچھ تو بچ کر نکل گئے اور جو یوں فرار ہوئے وہ ڈینور کی طرف بھاگ نکلے جن میں سے ایک کو بعد میں تمام عمر کی دوسرے کو دس سال قید کی سزا ہوئی اور یوں اس خلافِ آئین مجمع کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا گیا۔

امریکی جرائم کی تاریخ کے اس غیر معمولی شاندار کارنامہ کا ذکر کرتے ہوئے راے اے۔ گائیلز اسی قسم کے بیسیوں واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ ان امن و سلامتی کے مدعیوں اور تمدن جدید کے پرستاروں کے کار ہائے سیاہ اس قدر وحشت زا اور سنسنی خیز ہیں کہ اُنکو معرض تحریر میں لاتے ہوئے کلیجہ لرزتا ہے[1]۔ نہ صرف مرد بلکہ مستورات بھی ایسے ہی افعال قبیح کی مرتکب ہوتی ہیں۔ کنساس کے مرچنٹس بینک میں دو ہزار روپیہ ایک نیک بخت خاتون مسمات میٹی ہارورڈ کی گرفتاری کے لئے جمع پڑا ہے۔ یہ لطیف کرشمہ فطرت خوبصورت اور جسمانی طور پر تندرست ہے۔ پولیس کے کاغذات اس عیارہ کو سن بلوغت سے پیشتر کا نقب زن ظاہر کرتے ہیں۔ مقامی پولیس کی ایک گشتی چٹھی میٹی کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لئے بایں الفاظ شائع ہوتی ہے:۔

"وہ بینک لوٹنے والوں۔ ڈاکخانہ کے چوروں اور خفیہ بدمعاشوں میں پائی جائیگی۔ عموماً مردانہ لباس میں شکار کے پیچھے نکلتی ہے اور ممکن ہے کہ اس وقت بھی کسی ایسے ہی بھیس میں ہو۔ وہ

---

[1] سائنیس اِن بیف بریکنگ مندرجہ سائینٹفک امریکن دسمبر ۱۹۲۱ء صفحہ ۹۲۔

خوفناک منصوبے باندھنے اور جانکاہ جرائم کی تجاویز سوچنے میں ید طولےٰ رکھتی ہے۔
اُس کے بالوں کا قدرتی رنگ سیاہ ہے مگر وہ عام طور پر بھورے یا کسی اور رنگ کے بنائے
رکھتی ہے۔ جائے پیدائش پرسٹن۔ آئی ڈاہو۔ ٹیلیفون او پریٹر کا کام کرسکتی ہے۔ اُسے
گرفتار کرنے میں احتیاط مدِنظر رکھنی چاہیئے کیونکہ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ فوراً گولی
مار دے گی"

اسی طرح ایک اور عورت مارگرٹ بروکس اور اُس کا خاوند ہیری بروکس پٹسبرگ میں لوگس
اینڈ ہیوہل کمپنی کے ہرکارہ کے قتل کے اشتباہ میں گرفتار ہیں اور اس مہم میں اس شقی القلب
جوڑے نے ۱۴۲۰۰۰ روپے کے قریب حاصل کیا۔ جہاں یہ تہذیب و معاشرت کی گود
میں پلی ہوئی حوریں ایسے زہرہ گداز و انسانیت سوز جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں وہاں فضائے
ہندوستان میں سانس لینے والی جاہل و گنوار عورتوں کا دامن بھی ایسے ہی آثام کبیرہ سے
ملوث ہے۔ لیکن مغرب میں عام ہیں مشرق میں خاص خاص۔ مہ جبینانِ فرنگ کے
پاس حملہ کرنے کے کئی ہتھیار ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں تیر۔ چتون میں بھالے۔ ہاتھوں
میں پستول۔ لیکن ہندوستان کی کالی کلوٹی اُلھڑ عورت کے پاس مختصر سی جرات قلبی اور
تھوڑے سے دماغ کے سوا کچھ بھی نہیں +

ممالک غیر میں حسین و پری تمثال عورتیں جعلسازوں کا ایک عمدہ مربہ ہیں لیکن اس کے
ساتھ ہی بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں ان بدمعاشوں نے غریب عورتوں کو اُن کے علم و
مرضی کے بغیر استعمال کیا ہے۔ اس قسم کے بھی کئی ایک واقعات صفحہ قرطاس پر ہیں کہ
بھولی بھالی سادہ لوح لڑکیوں نے کئی شریف منش آدمیوں سے شادیاں کریں۔ مگر
بعد میں اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہیں معلوم ہوگیا کہ وہ فرشتہ خصلت
ہستیاں جو شادی سے پہلے جنسِ محبت کی خریدار تھیں اب تلطف و مودت سے معرا ہیں
اور اُن سے ارتکابِ جرائم میں مدد کی ملتجی ہیں۔ عموماً ان زاہد فریب دخترانِ گناہ کو متمول آدمیوں
یا کامیاب تاجروں کے رازہائے سربستہ معلوم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یورپ
کے گذشتہ محاربۂ عظیم میں لاتعداد عورتیں مختلف ممالک میں جاسوس کا کام کرتی ہیں اور

کئی ایک اُن میں سے گرفتار ہو کر کیفر کردار کو پہنچ گئیں۔ اسی مہیب عالمگیر جنگ کے ایام میں عموماً انگریز وزرا اصلاح و مشورہ کے لئے پیرس مدعو کئے جاتے تھے جہاں اُنکا صدر مقام کریلین ہوٹل ہوتا تھا۔ ایک شب انگریزی وزیر کو ایلیسی[1] میں سرکاری دعوت دی گئی جہاں غیر متوقع طور پر ایک مجلسِ مشاورت منعقد کرنی پڑی جس میں حالاتِ حاضرہ اور خصوصاً اُن معاملات پر بحث و تمحیص ہوتی رہی جس سے انگلستان و فرانس کے مفادِ باہمی پر اثر پڑتا تھا۔ ان فیصلوں کی اطلاع برطانوی کابینۂ وزارت کو لنڈن میں دینی لازمی تھی۔ اور یہ کام انگریزی وزیر کے سیکرٹری کے فرائضِ مفوضہ کا ایک حصّہ تھا۔ اس بارے میں اپنے افسر سے ضروری ہدایات و احکامات حاصل کر لینے کے بعد سیکرٹری انگریزی عملہ وزارت کے دوسرے اشخاص کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے چلا گیا۔ طعام سے فارغ ہونے کے بعد تفریحی طور پر رات بسر کرنے کے لئے اُنہیں کوئی سامان نظر نہ آتا تھا اگرچہ وہ اس سے پیشتر بھی اپنے افسر کے ہمراہ سرکاری کام کے لئے پیرس آچکا تھا مگر پھر بھی وہ فرانس کے دارالحکومت سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ آخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ رات کے چند فرصت کے گھنٹے عروس البلاد کی دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے وقف کر دیگا۔ اس عزمِ صمیم کے بعد اُس نے اپنے ایک دوست کو ہمراہ چلنے کے لئے کہا، مگر خوبیٔ تقدیر سے دونوں فرانسیسی زبان سے ناآشنا تھے +

ہوٹل سے نکل کر وہ رُور اُل کے کونے تک چہل قدمی کرتے نکل گئے۔ جہاں ایک گائیڈ (راہبر) نے اُن سے بزبانِ انگریزی دریافت کیا کہ زیادہ مناظرِ پیرس دیکھنا پسند کرینگے۔ دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے ایک لمحہ کے لئے دیکھا پھر سر ہلا کر اُس کی خدمات کی قبولیت کا اظہار کیا۔ گائیڈ نے فوراً ایک موٹر گاڑی بُلالی اور تینوں اُس میں سوار ہو کر چل دیئے اگرچہ اُن دونوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں، جا رہے ہیں۔ بالاخر وہ سڑک کے کنارے ایک مکان کے نیچے جا کھڑے ہوئے،

[1] صدر جمہوریہ فرانس کی جائے رہائش +

گاڑی رخصت کردی گئی اور تینوں مکان میں داخل ہوگئے جہاں ایک کمرہ کے بالمقابل پہنچ کر گائڈ نے گھنٹی بجائی۔ ایک عورت نے دروازہ کھول دیا پھر دونوں تماشائیوں کو کمرہ میں داخل ہونے کے لئے کہا گیا۔ کمرہ معمولی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ دونو اندر داخل ہوکر بیٹھ گئے دروازہ باہر سے بند ہوگیا۔ اب ایک وحشت زا سکوت کمرہ پر طاری تھا دونوں سیکرٹری ایک دوسرے کی طرف پر استعجاب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ کہ وہاں آنے کی اُنہوں نے کیوں حماقت کی۔ وہ ابھی اپنی نادانی پر دل ہی دل میں اظہار تاسف کررہے تھے کہ ایک عورت کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ کوئی خوبصورت عورت نہ تھی البتہ اُس کا لباس قیمتی اور شاندار تھا اور اُسکے سر پر ہلکی سی خوشنما ٹوپی تھی۔ دوسرے لمحہ میں نوواردسیکرٹریوں کی طرف مخاطب ہوکر وہ فصیح انگریزی میں کہنے لگی ”آپ کو دس ہزار فرانک ادا کرنے ہونگے“۔

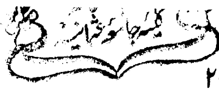
قریب تھا کہ وہ دونوں نوجوان اس پر تمسخر فقرہ پر ایک فرمائشی قہقہہ لگائیں کیونکہ ایک ایسی خاتون اُن سے دس ہزار فرانک کی طلبگار تھی جسے زندگی بھر میں اُنہوں نے اُس وقت پہلی ہی مرتبہ دیکھا لیکن اُسکے متین چہرے پر ایک ہی نگاہ ڈالنے سے اُنہیں معلوم ہوگیا کہ یہ فی الحقیقت تمسخر واستہزا نہ تھا بلکہ وہ رقم موعودہ لینے کے لئے تُلی کھڑی تھی۔ سیکرٹری کے ساتھی نے جرات و اضطراب آمیز آواز میں دریافت کیا ”کیوں ہم تمہیں دس ہزار فرانک ادا کریں؟ کس لئے؟ جاؤ ہمارے گائڈ کو فوراً یہاں بھیجو!!“

شیطان سیرت عورت نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر کہا ”میں تمہیں اس معاملے پر غور کرنے کے لئے دس منٹ کی مہلت دیتی ہوں“ یہ کہکر وہ کمرہ سے باہر نکل گئی اور دروازہ کو باہر سے مقفل کردیا۔ اب دونوں اس تباہی خیز و دہشت انگیز معاملے پر غور کررہے تھے۔ ایک طرف تو غم و غصہ کے جوش نے اُنکے چہرے گلنار کر رکھے تھے اور دوسری طرف اپنی حماقت پر خود بخود ہنسی آرہی تھی۔ بالاخر چند منٹ کے غور و خوض کے بعد اُنہوں نے فیصلہ کرلیا کہ رقم مطلوبہ ادا کرکے یہاں سے جلد مخلصی حاصل کرنی چاہیے وہ ابھی جیبوں سے روپے نکال کر گن ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور وہ اشرالناس کمرہ

میں داخل ہو کر کہنے لگی" خوب! تو کیا آپ نے یہ دس ہزار فرانک مجھے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"
سیکرٹری کے دماغ میں غصّہ اور جنون کی موجیں اُٹھنے لگیں پھر اُس نے کرب و بے چینی کا گھونٹ پی کر کہا" لیکن ہمارے پاس اس وقت دس ہزار فرانک موجود نہیں ہیں"
"کچھ پروا نہیں" شگفتہ و مطمئن آواز میں شریر النفس عورت نے جواب دیا" جو کچھ بھی آپ کے پاس ہو میرے حوالہ کریں" یہ کہکر وہ اُنکے سر پر بلائے مبرم کی طرح کھڑی ہو گئی اور جو کچھ اُنکے پاس تھا وصول کر لیا۔ روپیہ ادا کر کے دونوں نے ایک ہزیمت خوردہ قائد کی طرح شکستہ دلی سے اپنی کرسیاں چھوڑ دیں اور ٹوپیاں اُٹھا کر کمرہ سے باہر نکل گئے اور دروازہ اندر سے فوراً بند کر لیا گیا۔ بازار میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا کیونکہ ہوائی جہازوں کی بم باری سے بچنے کے لئے رات کے وقت مطلقاً روشنی نہیں کی جاتی تھی اسلئے وہ مکان کا نمبر بھی نہ پڑھ سکے۔ پھر اُنہوں نے کسی پولیس کے سپاہی کو بُلانا چاہا مگر فرانسیسی زبان کی ناواقفیت نے اُنہیں اس امداد سے بھی محروم رکھا۔ تھوڑا عرصہ چلنے کے بعد اُنہیں ایک گاڑی کرایہ پر مل گئی جس نے آنِ واحد میں اُنہیں کریلین ہوٹل میں پہنچا دیا۔ جہاں اپنے دوستوں سے قرض مانگ کر اُنہوں نے کرایہ ادا کیا۔

آخر کار یہ کون اشخاص تھے جنہوں نے ایسے جلیل القدر عہدہ داروں کو کچھ عرصہ تک حبسِ بے جا میں رکھ کر ایک رقمِ خطیر ناجائز طور پر اُن سے وصول کر لی۔ ممکن ہے بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ان دونوں نو وارد انگریزوں کے پھانسنے کے لئے پیرس کے شوریدہ سر بد معاشوں نے پہلے سے ہی کوئی جال بچھا رکھا ہو گا لیکن یہ بات بالکل نہ تھی، خود گرینوال کا خیال ہے کہ اس قسم کے ایک نہیں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں گم کردہ گائڈ ہوٹلوں۔ ریلوے اسٹیشنوں اور بحری دفاتر کی عمارتوں کے روز و شب چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ مخصوص گائڈ جو اِن سیکرٹریوں کو مناظرِ پیرس دکھانے کے لئے ہمراہ لے گیا تھا پہلے سے ہی ایسے خوش لباس متموّل انگریزوں کی ٹوہ میں پھر رہا تھا تاکہ کسی حیلہ و بہانہ سے ایک معقول رقم اُن سے وصول کرے۔ اسی لئے ہر ایسے کاروباری دفتر کے باہر جہاں

[1] دی انڈر ورلڈ آف پیرس۔ ہیری جے گرینوال





نووارد اشخاص کی آمد و رفت زیادہ ہو خصوصاً دفاتر انجمن جہاز راناں کے برانڈوں میں ایسے بدباطن گائیڈوں سے خبردار رہنے کیلئے جلی الفاظ میں نوٹس چسپاں رہتے ہیں۔ خود پولیس ہر وقت اُنکے تعاقب میں رہتی ہے مگر وہ کسی شخص کو اشتباہ میں گرفتار نہیں کر سکتے جبتک درحقیقت اُس نے ایسا ہی کوئی آدمیت سوز کام کیا ہو۔ اسلئے ہمارے وہ احباب جو کسی غرض سے پیرس تشریف لیجائیں ان راہبروں کے دام تزویر سے بچے رہیں جو عروس البلاد کے دامن عظمت و شہرت پر ایک بدنما داغ ہیں!!!

انفرادی طور پر دھوکا کھانا یا فریب دینا اتنا مشکل نہیں البتہ اجتماعی طور پر جُل دینا ایک خاص دماغ کی جدّت ہے۔ اس امر کی چہرہ نمائی کیلئے غالباً "علم و تدبر کے ناشرین" کا یہ کارنامہ "مذہبی دیوانگی اور جنون بربریت میں مبتلا مشرقیوں کیلئے شاید دلچسپی کا باعث ہو سکے۔" فنی جو[1] ایک شخص چرچ آف انگلینڈ کے ایک پادری کا لڑکا تھا لیکن سیاہ باطن جسے عرف عامہ کی اصطلاح میں سیاہ بھیڑ کہا جاتا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیمیافتہ اور تیز طبیعت آدمی تھا لیکن بدنصیبی سے صراطِ مستقیم سے دُور۔ آخرکار وہ گھر چھوڑ کر بحری ملازمت پر چلا گیا جہاں اُسے کچھ حدتک کامیابی نصیب ہوئی اور تھوڑے عرصہ میں افسر جہاز مقرر ہو گیا لیکن مغرور افسران بالا کی کرمفرمائیوں نے اُسے یکلخت کامیابی کے زینے سے نیچے پٹک دیا اور اُس پر نافرمانی و گستاخی کا جرم عائد کر کے کیپ آف گڈ ہوپ[2] میں یکہ و تنہا کسی قسم کے وسائل و ذرائع بغیر اجنبی ساحل پر اُتار دیا۔ "فنی جو" کیلئے یہ ابتلاو آزمائش کا وقت تھا مگر اُسکا میلانِ طبیعت نیکی کی بجائے بدی کی طرف زیادہ تھا۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک اور عیار ملاح اُسے ساحلِ بحر پر مل گیا اور دونوں نے اپنی بگڑی کو بنانیکے لئے کوئی نیا منصوبہ سوچنا شروع کیا۔ بالآخر اُنہوں نے اپنے وسائل کو یکجا کر کے ایک بڑا ہال کرایہ پر لے لیا اور بذریعہ اشتہار اس امر کا اعلان کر دیا کہ ایک مقررہ رات کو تماشہ گاہ میں ایک شخص مکھی کی طرح چھت پر اُلٹا چلتا ہوا دکھایا جائیگا اسلئے عوام الناس سے درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اس محیر العقول کرتب کو مقررہ شرح داخلہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ مقررہ رات کو لوگ جوق در جوق تماشہ گاہ کی طرف جانے لگے جہاں "فنی جو" کا ساتھی روپیہ وصول کرنیکے لئے بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ گذرنیکے بعد "فنی جو" اُسکے پاس آیا اور تمام موصول شدہ روپیہ جو اُسوقت تک جمع ہو چکا تھا اپنے قبضہ میں کر کے کہنے لگا کہ اسکے بعد جو کچھ بھی تم وصول کرو وہ بلاشرکت غیرے تمہاری ملکیت ہوگا۔ اس تصفیہ کے بعد یہ دیانتدار مشتہر طلا و سیم سے جیبیں بھر کر رفوچکر ہو گیا! اسکے بعد تماشہ گاہ میں کیا ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں کیونکہ اس ایماندارانہ بیوپار کے بعد "فنی جو" نہ تو پھر کبھی اپنے ساتھی سے ملا اور نہ کبھی کیپ ٹاؤن میں اُسے جانیکا اتفاق ہوا۔ لیکن ہر ذی عقل انسان

---

[1] دی انڈین کرنل۔ ایچ۔ ایل آدم۔ [2] راس اُمید (جنوبی افریقہ)

# خلفائے راشدین

گذشتہ سے پیوستہ

**انتظامِ سلطنت۔** پیغمبرؐ کے زمانہ میں اسلام ریاست نہ تھا بلکہ یہ ایک دینی اجتماع تھا جسکی بنیاد۔ صدق اور توکل پر رکھی گئی تھی۔ پیغمبرؐ بحیثیت مسلمان ہونے کے اور دوسرے مسلمانوں کے برابر تھے۔ اور دینی اور دنیوی معاملات میں اُنکے ہادی اور رہنما تھے۔ آپس کے جھگڑوں کو فیصل کرنے میں اُن کے قاضی اور حملات اور غزوات میں اُن کے سپہ سالار تھے۔ غنیمت کے مال کو انصاف کے ساتھ مجاہدین کو بانٹ دیتے اور زکوٰۃ و خمس غنیمت کو مساکین اور غربا کے اور پر جس طرح مناسب سمجھتے خرچ کر دیتے۔

ابوبکرؓ ایام خلافت میں پیغمبرؐ کے نفس قدم پر چلتے رہے۔ اسلامی ریاست گو وسیع ہوگئی تھی۔ مگر ابوبکر کا زیادہ وقت مرتدوں کی سرکوبی میں صرف ہوا۔ اُن کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی کہ وہ غیر ملکی انتظامات تمدن اسلام کے اندر داخل کرتے جو اسکے ترقی اور استقلال کے لئے ضروری تھے۔

**بیت المال۔** پیغمبرؐ اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں بیت المال قائم ہوچکا تھا۔ اُسکی آمدنی کے ذرائع فقط دو تھے ایک[1] زکوٰۃ جو متمول اور آسودہ حال مسلمان دیا کرتے تھے۔ یہ مال فقرا اور مساکین پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ دوسرا غنیمت کا مال جو مجاہدین اور انکے وارثوں کا حق گنا جاتا تھا۔

غنیمت کے مال کے اندر مویشی۔ اونٹ۔ اثاث البیت۔ ہر قسم کی نقد و جنس۔ قیدی ہوا کرتے تھے۔ اس کو یا تو کھڑے کھڑے ویسے کا ویسا تقسیم کر دیا جاتا تھا یا بیچ کر زر نقد کھرا کر کے مجاہدین کو بانٹ دیا جاتا تھا۔ غرضکہ جیسا مال آتا تھا۔ ویسا ہی چلا جاتا تھا۔ اس کے جمع کرنیکی نوبت نہ آتی تھی۔ لہذا بیت المال کے لئے کوئی خاص عمارت یا مکان بنایا نہیں گیا تھا۔

---

[1] انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا۔ والمولفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین فی سبیل اللہ وابن السبیل۔

اگر اتفاق سے کچھ مال بچ جاتا تو اُسکو امانتاً عائیشہؓ کے گھر میں رکھ دیتے تھے۔

خلیفہ عمرؓ کے زمانہ میں بھی بہت مدت تک یہی دستور جاری رہا۔ مگر رفتہ رفتہ کثرت فتوحات سے غنیمت کا مال بہت زیادہ آنے لگا۔

کہتے ہیں کہ جب ابو ہریرہؓ بحرین میں سے ۵ لاکھ درم مال غنیمت لائے تو عمرؓ نے اُن سے پوچھا کہ کیا کچھ لائے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ۵ لاکھ درم۔ حضرت عمرؓ نے اتنا روپیہ کبھی نام کو بھی نہیں سُنا تھا۔ اُنکو یقین نہ آیا اور دوبارہ ابو ہریرہؓ کو کہا کہ تو جانتا ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے؟[1] اسنے کہا کہ ہاں سو ہزار درم پانچ مرتبہ۔ کثرت فتوحات کے ساتھ غنیمت اور زکوٰۃ کے علاوہ بیت المال کی آمدنی کے اور ذرائع بھی پیدا ہو گئے۔

**جزیہ** - پیغمبرؐ کے زمانہ میں بھی غیر مسلموں سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ مگر جزیہ کی آمدنی اس زمانہ میں غیر محسوس تھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں نئے مقبوضات میں یہود۔ نصاریٰ اور مجوس وغیرہ غیر مسلم قوموں میں بہت سی قوموں نے اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں جزیہ دیکر جان و مال کی امان حاصل کر لی تھی۔

جزیہ لینے کے دو طریق تھے۔

ایک طریق یہ تھا کہ جب کوئی شہر فتح کیا جاتا تو ایک بڑی رقم یکمشت تمام شہر پر بطور تاوان مقرر کر دی جاتی۔ یہ رقم شہر والے آپس میں چندہ کر کے مُسلمانوں کو ادا کر دیتے تھے۔

دوسرا طریق یہ تھا کہ غیر مسلم باشندوں کی سالانہ مردم شماری کی جاتی تھی اور ایک مقررہ رقم فی کس جزیہ لیا جاتا تھا۔ عموماً متمول لوگوں سے ۴ درم۔ متوسط حال سے ۲ درم اور غریبوں سے ایک درم[2] ماہوار لیا جاتا تھا۔

عورتیں۔ بچے۔ راہب اور تارک الدنیا لوگوں سے جزیہ معاف تھا۔

**خراج** - جب کوئی ملک فتح کیا جاتا تو اس ملک کی اراضی اسلامی ریاست کی ملکیت میں ہو جاتی

---

[1] "بما جئت ؟ قال بخمسمأۃ الف درھم - قال اتدری ما تقول ؟ - قال نعم مأۃ الف خمس مرۃ ؟"

[2] ایک درم تقریباً ساڑھے تین آنہ کا ہوتا ہے۔

تھی اور زمینوں کے مزارعہ اور کاشتکار لوگ سرکار کی طرف سے کرایہ دار تصوّر کئے جاتے تھے اور کاشت کی آمدنی میں سے ایک مقررہ حصّہ بطور کرایہ سرکار کو ادا کرتے تھے۔ اس لگان کا نام خراج تھا۔ اور جن زمینوں پر لگان لیا جاتا تھا انکا نام خراجی اراضی تھا۔

زمینوں پر یکساں خراج نہیں لگایا جاتا تھا بلکہ شرح خراج جنس پیداوار پر منحصر ہوتی تھی غیر مسلم کاشتکار ذمی کہلاتے تھے جو عراق عجم میں عجمی دہقان اور مرزبان تھے۔

خلیفہ عمرؓ نے یہ قانون مقرر کیا تھا کہ عرب زمینوں کے مالک بنکر کاشتکاری نہ کریں قانون غیر مسلم رعایا کی رعایت یا ان پر مہربانی کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس میں ایک گہری اقتصادی پالیسی مضمر تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ اسلام کی جہاں کشائی کی امنگ اسی حالت میں پوری ہوسکتی ہے کہ مسلمان غیر منقولہ املاک کے علایق سے آزاد ہوں آزادی سے نقل مکان کرسکیں اور ہر وقت پا بر کاب سفر کرنے کے لئے مستعد ہوکر بے دھڑک مرنے مارنے کے لئے تیار رہیں۔

کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے عراق فتح کیا ہے تو مجاہدین نے خلیفہؓ سے درخواست کی کہ سواد کی اراضی بھی مال غنیمت کی طرح پر مسلمانوں پر تقسیم کیجائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو نامنظور کیا اور اس کی دلیل یہ دی کہ اگر زمینیں تقسیم کردی جائیں تو آیندہ مسلم نسلوں کے لئے کچھ نہ رہیگا۔ لہٰذا مناسب ہے کہ غیر مسلم مالکان آراضی کو بحال رکھ کر اُن سے جزیہ اور خراج لیا جائے تاکہ ایک مستقل اور دائمی آمدنی کی صورت پیدا ہوجائے جس سے حال اور مستقبل کی نسلیں مستفیض ہوسکیں +

البتہ اس قانون میں ایک نرمی کی گئی اور وہ یہ تھی کہ جن زمینوں کے مالک لڑائیوں میں مارے جاتے یا جو زمینوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ اس قسم کی اراضی مسلمانوں کو تقسیم کردی جاتی تھی یا افتادہ زمینیں جن کو مسلمان خود آباد کرلیتے +

اس قسم کی زمینوں سے عشر آمدنی لیا جاتا تھا اس لئے اُنکو عشوری آراضی کہتے تھے۔ عجم بادشاہوں کے شاہی املاک اور اراضی جو مسلمانوں کے ہاتھ آتی تھی۔ اُنکو مسلمان امراء کو جاگیروں کے طور پر دے دیا جاتا تھا۔ اور اس عطیہ کے عوض میں اُمراء فوج کی ایک مقرر

تعداد وقت ضرورت سرکار کے لئے مہیا کرتے تھے۔

عراق۔ شام۔ اور مصر میں محصول حاصل کرنے کے جو قاعدے اور دستور پہلے بادشاہوں کے وقت سے جاری تھے اُنہیں کو قائم رکھا بلکہ اس صوبجات کے اہالی جو اس کام سے واقف تھے انہیں کو اپنی اپنی جگہ پر برقرار رکھا گیا۔ یہ لوگ اپنی اپنی زبانوں میں محاصل کا حساب کتاب رکھا کرتے تھے۔

شاہانِ عجم کے زمانہ میں لگان مقاسمہ سے بھی لیا جاتا تھا اور مساحت سے بھی۔ یہ دونوں قاعدے خلیفہ عمرؓ نے بحال رہنے دئے اور زمین کی پیمائش اور بندوبست کے لئے عثمان بن حنیف کو مقرر کیا۔

غرضیکہ خلیفہ عمرؓ کے زمانہ میں زکوٰۃ۔ غنیمت۔ جزیہ اور خراج کا مال اس کثرت سے آنے لگا کہ مجاہدین اور مساکین کو تقسیم کر دینے کے بعد بھی بہت سا مال یا اجناس مثل اقمشہ اور اسلحہ بچ رہا کرتا تھا۔ جس کی حفاظت۔ جمع خرچ اور اختزان کے لئے بڑا بھاری انتظام کرنا پڑا

**امین بیت المال**۔ بیت المال ایک خاص عہدہ دار کی تحویل میں دیا گیا اس کا نام امین بیت المال تھا۔ مال کی تقسیم کے لئے وظیفہ داروں کی جماعت بندی کر کے ایک فہرست مرتب کی گئی۔

**دیوان**۔ قبیلوں کے تقدم و تاخر۔ اہل بیت اور غیر اہل بیت۔ سابقین و متاخرین۔ مہاجر و انصار مجاہدین کے غزوات کی سبقت کے لحاظ سے مراتب قائم کر کے

**صاحب دیوان**۔ انکے کم و بیش رواتب مقرر ہوئے غرضکہ مالی انتظام اور حساب کتاب کا طریق عجمی اور رومی سلطنتوں کی نقل کر کے ایک بڑا محکمہ قائم کیا گیا جس کا نام دیوان تھا اور اس محکمہ کی نگرانی کے لئے صاحب دیوان مقرر ہوا۔

**والی**۔ مقبوضات کے وسیع ہو جانے سے مقامی حاکم مقرر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ان مقامی حاکموں کو والی اور عامل کہتے تھے۔

والی خلیفہ کا قائم مقام ہوا کرتا تھا۔ فوجوں کا انتظام۔ اشاعتِ دین۔ مقدمات کا فیصلہ۔ خراج اور جزیہ وصول کرنا۔ مستحق لوگوں کو روزینہ دینا۔ نماز کے وقت امامت کرنا

اسکے منصبی فرائض تھے۔ صوبہ کے اخراجات نکال کر جو روپیہ محاصل میں سے بچتا تھا اسکو وہ بیت المال میں داخل کر دیا کرتا تھا۔

ابو بکرؓ کے زمانہ میں والیوں کو مقرر کرنے کا یہ طریق تھا کہ جب کسی ملک پر فوج کشی کی جاتی تھی تو سالارِ لشکر کو علم دیکر کسی خاص شہر پر حملہ کرنے کے لئے مامور کر دیا جاتا اور فتحیاب ہونے کی صورت میں اس شہر کا اسکو والی[1] بنا دیا جاتا تھا۔

اس قبیل سے شام کے حملات میں عمرو ابن العاص کو فلسطین۔ یزید ابن ابوسفیان کو دمشق کا اور شرجیل بن حسنہ کو اردن کا والی مقرر کیا گیا۔

ابو بکرؓ نے اس منصب کے نہ تو کوئی فرائض مقرر کئے اور نہ تنخواہ مقرر کی تھی۔

حضرت عمرؓ کے ایام خلافت میں شروع شروع میں جب حملات ہو رہے تھے یہی دستور قائم رہا یعنے والیوں کے اختیار کی کوئی حد نہ تھی۔ فوجی۔ سیاسی۔ اور دینی معاملات میں انکو پورے اختیارات[2] حاصل تھے۔

مگر رفتہ رفتہ انکے اختیارات کی حد بندی[3] کی گئی والی کے متعلق فقط فوجی اور سیاسی انتظام رکھا گیا۔ مقدمات کے فیصلہ کے لئے قاضی۔ امامت کے لئے امام اور وصول مال اور مصارف کے انتظام کے لئے امین بیت المال علیحدہ مقرر کئے گئے۔

اور ہر ایک عہدہ دار کی علیحدہ علیحدہ تنخواہیں مقرر کر دیں مثلاً عثمان بن حنیف جس نے سواد کی اراضی کی پیمائش کی اُس کی تنخواہ ۴ بکریاں اور ۵ درم روزانہ تھی۔ معاویہؓ والی شام کی تنخواہ ایکہزار درم سالانہ تھی۔ عبداللہ قاضی کوفہ کی تنخواہ ایک سو درم ماہوار اور ۴ بکریاں روزانہ مقرر تھیں۔

**فوجی انتظام**۔ اسلامی فوجیں باسلیقہ با نظامی نہیں تھیں۔ ہر ایک قبیلہ میں سے مجاہدین اپنے اپنے سردار اور اپنے اپنے جھنڈے لیکر۔ زادِ راہ۔ اثاث البیت۔ باربرداری

---

[1] امارۃ الاستیلاء [2] الامارۃ الاستکفاء

[3] الامارۃ الخاصہ

اور بال بچے اپنے ساتھ لیکر ڈھول بجاتے ہوئے لڑنے کو تیار ہو جاتے تھے لڑنے کے ہتھیار بھی انکے اپنے ہوا کرتے تھے۔ جس جس ہتھیار کی مہارت ہوتی تھی وہی لیکر چلا یا کرتے تھے۔ مثلاً کسی کے پاس ڈھال تلوار ہوتی کسی کے پاس نیزہ اور کسی کے پاس تیر و کمان جنگ کے وقت صف باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور نبرد آزما دشمنوں کا نام لے کر للکارتے اور اکیلے اکیلے صف میں سے نکل کر لڑتے تھے۔

سپاہی یا افسر کی تنخواہ مقرر نہیں تھی بلکہ غنیمت کی امید انکے لئے کافی ترغیب ہوتی تھی۔ یرموک کی لڑائی میں پہلی مرتبہ خالدؓ ابن ولید نے رومی انتظام کی تقلید کرکے فوج کے دستے بنائے اور رومیوں کی طرح میمنہ۔ میسرہ اور قلب جیش قائم کرکے فوجوں کو لڑایا۔ ابو وقاصؓ قادسیہ کی لڑائی میں اسی انتظام کے ساتھ لڑے۔ انکے بعد یہ دستور اسلامی فوجوں میں مستقل طور پر قائم ہو گیا۔

لڑائی کے بعد غنیمت کا مال امین غنیمت کی نگرانی میں ایک جگہ پر اکٹھا کیا جاتا تھا۔ اور اسکے ۵ حصہ کرکے ۴ حصے فوراً مجاہدین پر تقسیم ہو جاتے تھے۔ اور ایک حصہ بیت المال میں داخل کر دیا جاتا تھا۔

مال غنیمت میں مقتول اور مفرور دشمنوں کے ہتھیار بھی ہوا کرتے تھے یہ ہتھیار دوسری لڑائیوں کے لئے اُن مجاہدین کو بانٹ دئے جاتے تھے جن کے پاس اپنے ہتھیار نہ ہوتے تھے خلیفہ عمرؓ نے فوجی انتظام میں یہ اضافہ کیا کہ غازیوں کی اور شہیدوں کی ورثہ کے لئے تنخواہیں[1] مقرر کر دیں جیسا کہ دیوان کے بیان میں ذکر کیا گیا ہے۔ مگر جنگی محکمہ خاص طور پر انکے زمانہ میں قائم نہیں ہوا۔

**رعایا پروری**۔ ۱۸ سنہ ہجری میں شام اور فلسطین کے علاقوں میں ایک مہلک وبا پھیلی جس سے ہزاروں آدمی ضائع ہو گئے بیچارے ابو عبیدہؓ بھی اسی مرض میں راہی ملکِ بقا ہوئے

---

[1] بدر کی لڑائی میں جو مہاجر اور انصار شامل ہوئے انکے ۵۰۰۰ ہزار درم سالانہ پیغمبرؐ کی بیواؤں کو ۱۲۰۰۰ درم۔ مہاجرین اور انصار کے رشتہ داروں کو ۲۰۰۰ درم اہل مکہ کو ۸۰۰ درم مہاجرین کی بیویوں کو ۶۰۰۔ ۲۰۰ درم وغیرہ وغیرہ۔

اُنکی جگہ معاویہؓ ابن سفیان والی بنائے گئے۔

خلیفہ عمرؓ نے بہت چاہا کہ وبا زدہ علاقوں میں خود جاکر رعایا کی غمخواری کریں مگر صحابہ نے اُن کو جانے نہ دیا۔ وبا فرو ہونے کے بعد آپ نے شام کا دورہ کیا۔ والیوں سے محاسبہ کیا۔ جو عمّال بد دیانت اور ظالم تھے انکو معزول کیا۔

یہ وبا ابھی فرو ہونے نہ پائی تھی کہ مدینہ اور حجاز میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے سخت قحط پڑا اور لوگ بھوکے مرنے لگے اس سال کو عرب مورخ "عام الرماد" کہتے ہیں۔ خلیفہ فکر کے مارے دن رات پریشاں رہتے۔ چاروں طرف والیوں کو غلّہ بھیجنے کے احکام روانہ کئے۔ مصر میں ایک نہر کھُدوائی تاکہ دریائے نیل میں سے کشتیاں بحر احمر میں آسکیں اور وہاں سے غلّہ آسانی کے ساتھ عربستان کے بندرگاہوں میں پہنچ جاسکے۔

عراق عرب میں بھی شاہان عجم کے زمانہ کی پُرانی نہریں۔ جو مٹی اور ریت سے بھر کر ایک مُدت سے بیکار پڑی تھیں۔ اُن کو بھی کھُدوا کر صاف کروایا۔ بہُت سی مسجدیں بنوائیں۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی مسجدوں کو وسیع کرکے از سرنو تعمیر کروایا۔

اس زمانہ سے پہلے مسلمانوں کے پاس کوئی سنہ تاریخ نہ تھا۔ اُنھوں نے ہجرت کے دن سے سال ہجری قائم کیا۔

**غیر مسلموں کے ساتھ سلوک**۔ پیغمبرؐ اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں یہود اور نصاریٰ نے جزیہ دینا قبول کرکے جانؔ و مال کی امان حاصل کرلی تھی۔ اور انکو عربستان اور ممالک محروسہ میں رہائش کی اجازت مل گئی تھی۔

خلیفہ عمرؓ نے اس بات میں مصلحت دیکھی کہ یہود اور نصاریٰ کو عربستان سے نکال کر

---

سلھ "بسم اللہ الرحمن الرحیم ہذا ما اعطی خالد ابن ولید اہل دمشق اذا دخلہا اعطاہم امانا علی انفسہم و اموالہم وکنائسہم وسور مدینتہم لایہدم ولا یسکن رضی من دورہم لہم بذالک عہد اللہ وذمۃ رسولہ والخلفاء المؤمنین لا یعرض لہم الا بخیر اذا اعطوا الجزیۃ" البلاذری صفحہ ۱۲۱

جلاوطن کر دیا جائے اور انکے املاک کا معاوضہ دیگر مسلمانوں کو اُنکی جگہ پر آباد کر دیا جائے

**وفات**۔ مغیرہ بن شعبہ کے پاس فیروز نام ایک عجمی غلام تھا۔ اس کو عرب مورخ ابن لولو لکھتے ہیں ابن لولو نے ایک دن خلیفہ عمرؓ کے پاس جاکر شکایت کی کہ میرا آقا مجھ سے بہت زیادہ محصول لیتا ہے جو میری طاقت سے بہت زیادہ ہے۔

عمرؓ نے پوچھا کہ تو کتنا جزیہ دیتا ہے اُس نے کہا کہ دو درم روزانہ خلیفہؓ نے پوچھا کہ تیرا پیشہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ نجاری اور آہنگری۔ عمرؓ نے کہا کہ تو پھر دو درم روزانہ کچھ زیادہ نہیں۔ یہ سن کر ابن لولو چپ چاپ چلا گیا۔

دوسرے دن خلیفہ نماز کی امامت کے لئے کھڑے ہوئے۔ ابن لولو گھات لگائے پہلی صف میں کھڑا تھا۔ دفعتہً خلیفہ پر حملہ کیا اور خنجر کے زخم سے گھائل کر دیا۔

خلیفہؓ نے اسکے بعد تین دن زندہ رہ کر وفات پائی اور حضرت عائشہ کے مکان میں پیغمبرؐ کے ہم پہلو دفن کئے گئے۔

خلیفہ عمرؓ کی مدتِ خلافت دس سال چھ ماہ اور کچھ دن تھی اور مرنے کے وقت انکی عمر ۶۳ سال کی تھی۔

**اصحاب الشوریٰ**۔ خلیفہ عمرؓ نے اپنا جانشین کسی کو نامزد نہیں کیا بلکہ جب زندگی سے ناامید ہو گئے تو پانچ صحابہؓ کی ایک کمیٹی مقرر کی کہ مشورہ کرکے ایک خلیفہ منتخب کرلیں اصحاب الشوریٰ کے نام یہ ہیں:-

عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہ بن عبید اللہ۔ زبیر بن العوام۔ عبدالرحمن بن عوف[۱]

کرنل بھولا ناتھ

---

[۱] طبری نے ابی وقاص کا نام بھی اصحاب الشوریٰ میں شامل کیا ہے ۱۲

# ہندوستان کی تعلیم

## اعلیٰ تعلیم

یہ نہایت افسوس کے قابل ہے کہ اس وقت تک انگریزی اسکول اور کالج ایسی قابلیت کے درجہ کے طالب علم نہیں پیدا کر سکے جو اُن کو اُنکے ہم وطنوں کے سامنے امتیازی علم کے قابل ظاہر کر سکتے۔ عنقریب زمانہ میں بھی ایسا ہونے کی امید نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طالب علموں میں ایک بھی ایسی قابلیت کا نہیں پایا جا سکتا جو اعلیٰ درجہ کا یا درمیانی درجہ کا عالم سمجھے جانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ کیا ہندی کالج اپنی چار دیواری سے آجتک ایک بھی طالب علم بھیج سکے جس کی ذہانت اور لیاقت۔ شکسپیئر۔ ملٹن۔ ہیوم۔ برک سکاٹ۔ مکالے۔ مل۔ یا۔ بین۔ تک پہنچ سکے۔ جبکہ حالت یہ ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ موجودہ طریقہ ملک کو کسی قسم کا بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ میں بہت سے بنگالی اور ہندوستانی انگریزی تعلیمیافتوں سے واقف ہوں جنھوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی ہے جنکو یورپین علوم وفنون کی روشنی سے فائدہ پہنچا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ ان میں بہت سے گورنمنٹ کے انگریزی محکمہ میں ملازم ہیں۔ مگر باوجود اس تمام اوپر کی معلومات کے جو مجھکو حاصل ہیں یہ میرا ایمانی یقین ہے اور رائے کہ تمام ایسی تعداد جو انگریزی کالجوں سے متاثر ہوئی ہے اس قدر حقیر قابلیت کا درجہ رکھتی ہے جیسا کہ خط نویسی۔ نقل نویسی۔ جھنڈی بردار۔ یا ریل کا ٹکٹ کلکٹر۔ ان میں چند ایسوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جو اس خیال سے خوش ہیں کہ وہ اصلی لکھنے والے ہیں لیکن اُن کی انشا اس قسم کی بیان کیجا سکتی ہے جس قسم کی ہندوستان کے مختلف صوبوں کے یورپین اُن صوبوں کی بولیوں میں استعمال کرتے ہیں"

"سر سید احمد خان اعظم علیہ الرحمۃ"

جبکہ ہندوستان کی تعلیم پر قلم اُٹھایا جائے تو اس ملک کے مسلمہ تعلیمی مدبروں کی رائیں بھی

ٹٹولنا ضروری ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ اس چودھویں صدی ہجری کے زبردست تعلیمی مدبر ہو گزرے ہیں جن کی تعلیمی رائے کی ہر طبقہ میں وقعت کیجاتی ہے۔ اسی خیال سے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نسبت غور کرنے کے بعد ہندوستان کی اعلےٰ تعلیم پر بحث کرنے سے پہلے۔ درمیان میں۔ سر سید احمد خاں کی ایک انگریزی تحریر سے جو Stricture upon the present educational system in India کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی تھی وہ اقتباس درج کر دینا ضروری سمجھا گیا جو اس مضمون کے عنوان میں ہے۔ اس اقتباس کو ذرا غور سے پڑھو۔ اب کہ یہ تحریر سر سید اعظم کی مذکورہ رائے کے ۵۲ برس کے بعد لکھی جا رہی ہے اُس تعلیمی مدبر کی اس دوربینی پر حیرت ہوتی ہے کہ "عنقریب زمانہ میں بھی ایسا ہونے کی امید نہیں ہے" اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سید احمد خاں کی اس تحریر پر آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی ذہانت اور لیاقت کی نظر سے۔ ہندوستان کو موجودہ تعلیم سے کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا۔ اور۔ مل۔ برک۔ مارکونی۔ ایڈیسن۔ بسمارک۔ گلینڈسٹون جیسے ذہین قابل مدبر تو موجودہ تعلیم کے اثر سے پیدا ہونا درکنار مفلسی اور بھوکے ہندوستان والوں کے پیٹ پالنے کی فکر کی وجہ سے۔ ملک والوں اور ملکی مدبروں کی توجہ موجودہ تعلیم کی طرف پھر جانے کے سبب سے یہ اور عظیم الشان نقصان ہُوا کہ ہندوستان اپنی اُس بیش قیمت۔ مفید اور فیض رساں۔ قدیم مشرقی تعلیم کی طرف سے رُوگرداں ہو گیا جس کے لازوال اور دائم قائم فیض نے ہندوستان میں۔ رام موہن رائے کیشب چندر سین۔ سوامی دیانند۔ ذکا اللہ۔ سید احمد خاں۔ نذیر احمد۔ حکیم محمود خاں۔ اور ایسے ہی صدہا وطن دوست مدبر اور قومی خادم پیدا کئے جنہوں نے وقتی ضرورت کے مطابق اپنے کو ملکی اور قومی خدمت کے واسطے وقف کر دیا۔ اس سے بھی اوپر جا کر جس مشرقی تعلیم نے اُس ہستی کو فیض یاب کیا جس نے دلی میں علم نجوم کا بے نظیر آلہ۔ جنتر منتر۔ بنایا جو غالباً نئی دلی کے نقشہ کے مطابق عمارتیں بنانے کے واسطے تباہ کر دیا جائیگا اور ہندوستانی ہیئت کے قدیم عالموں کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہمیشہ کے واسطے گمنامی میں جا پڑیگی۔ خدا کرے کہ علم ہیئت کے دلدادوں کو اس طرف توجہ ہو جائے اور یہ عمارت بربادی سے

بچ جائے۔ یا بنارس کے مان مندر میں ستاروں کی گردش جانچنے کی عمارت بنائی یا آگرہ کا تاج گنج اور آگرہ اور دلی کے قلعوں کی عمارتیں بنائیں جن کی نظیر دنیا بھر میں ملنا دشوار ہے۔ کاش۔ ملک انگریزی تعلیم کے موجودہ طریقہ کی طرف متوجہ نہ کیا جاتا تو قومی غرور اور ملکی افتخار تو باقی رہتا غور کرنے والے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے غرور اور افتخار سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے اُس سے کتنے عظیم الشان نتائج پیدا ہُوئے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ اعلیٰ تعلیم وہ تعلیم سمجھی جاتی ہے جس کی سند حاصل کرلینا موجودہ تعلیمی طریقہ کی اعلےٰ معراج خیال کی جاتی ہے جس کے منتہی طالب علموں کو جنہوں نے امتیازی سند حاصل کی ہو۔ یونیورسٹی کے کسی خاص جلسہ میں سندیں اور عبائیں دیجاتی ہیں جس کے بعد طالب علم کسی ہندوستانی یونیورسٹی کا "گریجویٹ" ہوجاتا ہے اور ہندوستان میں یہ انتہائی فخر کے قابل علمی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس علمی اعزاز کی قدروقیمت کیا ہوتی ہے؟ بس اسقدر کہ "خودداری" کو خیر باد کہہ کر کسی مربی اور محسن کی خوشامد درآمد کرکے کسی سرکاری افسر کے بنگلہ کے درختوں کے سائیہ میں مہینوں برسوں اُس کے چپراسیوں اور خدمتگاروں سے سرگوشی کرکے اور اُس افسر کا فضول وقت ضائع کرکے تمام اپنے جذبات اور قومی فخر کی حرارت کو "حضور عالی" کی جائز اور ناجائز خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے تباہ کرکے کسی سرکاری دفتر میں منصرمی ہیڈ کلرکی نائب تحصیلداری یا زیادہ سے زیادہ کوئی سو دو سو روپیہ کی جگہ مل جاتی ہے اور ہمارے "گریجویٹ" صاحب اپنی بقیہ زندگی اس دائرہ میں گرا دیتے ہیں۔ یہ بھی بڑے بڑے قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے ورنہ ان لوگوں کا بڑا حصّہ تو پچاس چالیس ہی روپیہ کی عوض میں اپنی بیش قیمت خودداری اور آزادی کو فروخت کرڈالتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تعلیم صرف انگریزی کلرکوں کی ایک جماعت پیدا کرسکتی ہے اس سے زیادہ اس تعلیم میں مواد ہی نہیں۔ جن لوگوں نے آزاد ملکوں کی اعلیٰ تعلیم۔ اور ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم پر غور کیا ہے وہ اقرار کرتے ہیں کہ آزاد ملکوں کی یونیورسٹیاں واقعی اُس علم اور فن کے جس کی اُنہوں نے تعلیم پائی ہے "بیچلر" (نوجوان) اور حقیقی "ماسٹر" (مالک) پیدا کرتی ہیں اس کے خلاف ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے سند حاصل کئے ہُوئے۔ بیشک

بہت سے علوم اور فنون کے "غلام" ضرور ہوجاتے ہیں لیکن کسی علمی شاخ کے "مالک" نہیں بن سکتے۔ جبکہ طالب علم ثانوی تعلیم ختم کرکے "اعلیٰ تعلیم" شروع کرتا ہے تو اُسکے ابتدائی برس تو مختلف علوم اور فنون کی کتابیں رٹنے میں صرف ہوجاتے ہیں خواہ اُن سے طالب علم کو دلچسپی ہو یا نہ ہو یہ افسوسناک حالت اس قسم کی ہے کہ خواہ طالب علم کیسا بھی محنتی اور ذہین ہو مختلف مضامین کے فضول بوجھ اور کثرت سے "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کا مصداق بن جاتا ہے اور اُس کی قوت فیصلہ معطل ہوجاتی ہے کہ علم کی کس شاخ میں اُسکو تکمیل کرنا چاہیئے اور کون کون سی شاخ چھوڑ دینا چاہیئے اسی سوچ بچار میں راتوں کو محنت کرکے خوب رٹ کر۔ بلاغور و خوض کے۔ آجکل کے حافظوں کی طرح ۔ جو تمام قران مجید از بر یاد تو کرلیتے ہیں مگر مطلب اور معنے سے بالکل بے خبر۔ اسی طرح ہندوستانی یونیورسٹیوں کا طالب علم یونیورسٹی کی ابتدائی سند تو حاصل کرلیتا ہے۔ مگر بے سمجھے طوطے کی طرح اب اعلیٰ تعلیم کے آخری سال آگئے۔ ان برسوں میں پچھلے آٹھ دس برس کے ابتدائی، ثانوی، اور کالجی تعلیم کے دماغ میں ٹھونسے ہوئے ذخیرہ کو نکال کر کسی پسند کی ہوئی علمی شاخ میں طالب علم کو ڈگری لینا ہوتی ہے مگر کسی خاص علمی شاخ کے اعلےٰ مضامین سمجھنے کے اور اُن پر غور کرنے کے واسطے ایک تازہ دماغ کی ضرورت ہوتی ہے جس سے یہ منتہی طالب علم صاحب عاری ہوتے ہیں اور جو نتیجہ اس سے نکلتا ہے ۔ وہ پوشیدہ نہیں۔

اب ذرا ایک نظر اعلےٰ تعلیم کی پڑھائی پر بھی ڈالنا چاہیئے تاکہ اس تعلیم کا نقص صاف صاف سمجھ میں آجائے۔ اعلیٰ تعلیم میں ابتدا سے اخیر تک بالکل اجنبی بولی میں ایسے مصنفوں کی لکھی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ جن کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، جو ہندوستان کی ضرورتوں سے بالکل واقف نہیں ہوتے، اُنکے خیالات، اُن کی نظر کا منتہا ہندوستانی خیالات اور ہندوستانی نظر کے منتہا سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جن اجنبیوں کی لکھی ہوئی کتابیں اعلےٰ تعلیم کے درس میں شامل ہیں اُن کے مُلکی تعلیمی طریقوں اور وسیلوں اور ہندوستان کی تعلیمی طریقوں اور وسیلوں سے کچھ مناسبت ہی نہیں ہوتی۔ جن علوم اور فنون کی اعلےٰ تعلیم میں پڑھائی ہوتی ہے

اُن کے علمی معلومات اور علمی تجربہ حاصل کرنے کے ذریعوں کو ہندوستان سے کوئی تعلق ہی نہیں نہ ہندوستان میں ایسے تجربوں کے واسطے ایسے اعلےٰ پیمانہ کا انتظام جس سے یہ اعلیٰ درجہ کے طالب علم فائدہ اُٹھائیں اور اپنی ذہانت اور معلومات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ غرض اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے کو ایک ایسے میدان میں قدم رکھنا پڑتا ہے جسکے راستوں اور منزل مقصود کے وسیلوں سے وہ بالکل اجنبی ہوتا ہے۔ بولی الگ۔ خیالات الگ۔ تجربہ الگ۔ تجربوں کے اصول الگ۔ تجربہ کے وسیلے مفقود۔ یہ ہے مختصر خاکہ اُسی اعلےٰ تعلیم کا جس کو ہندوستانی طالب علم برسوں کی محنت سے بیشمار روپیہ کھوکر۔ جس کا بڑا حصّہ بیرونی مصنفوں، بیرونی شائع کرنے والی کمپنیوں، بیرونی استادوں کی جیبوں میں جاتا ہے جو ملک میں کبھی بھی واپس نہیں آتا۔ حاصل کرتا ہے اور جب اس سخت محنت سے فارغ ہوتا ہے تو یہ غریب منتہی سند پایا ہُوا طالب علم اپنی ملکی حقیقت اور ضرورت سے بالکل نا بلند ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے اور ہندوستان اس مصیبت میں مبتلا کیوں ہے؟ صرف اس سبب سے کہ ہندوستان کی تعلیمی حکمت عملی کی باگ درحقیقت ایسے اجنبی مُلک والوں کے ہاتھ میں ہے جن کو ہندوستان سے حقیقی ہمدردی نہیں ہے۔ یہ نقص رفع ہونا چاہیئے اور ہندوستان کی تعلیمی حکمت عملی خالصاً ہندی ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔

حاجی محمد موسیٰ خاں
دتاولی ضلع علیگڑھ

---

دل کی فتح۔ کسی دوسرے شخص کے دل کو فتح کرنیکے لئے ضروری ہے کہ تم اپنا دل اس کام میں لگا دو۔ (گولڈ سمتھ)

دل کی پاکیزگی۔ دل کی پاکیزگی ہمارا عمدہ سے عمدہ خزانہ، بڑی سے بڑی عزت اور شریف سے شریف جائداد ہے اس کا صحیح نام شعاع معرفت ہے۔ (گلیڈسٹون)

خیالات۔ خیالات دنیا میں توپوں سے زیادہ گرجتے ہیں۔ تفکرات فوجوں سے عظیم ہیں اور اصولوں نے سوالوں سے زیادہ فتوحات حاصل کی ہیں۔ (پکٹیس)

---

# خدا کی محبت

خدا کی محبت ہی حقیقی محبت ہے۔ اور انسان کے لئے اعلیٰ ترین نعمت! جس کو بھی عطا ہو جائے "بہت سے روحانی خطرات ایسے ہیں جو انسان کے دل میں خدا کی محبت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ دل میں اس محبت کے پیدا ہونے کے واسطے انسان میں بہت سے اوصاف حمیدہ کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ تکمیل انسانیت کا انحصار اسی پر ہے کہ انسان کے دل میں خدا کی محبت پورے طور پر غالب اور مسلط ہو۔ اور اگر دل میں یہ محبت پورے طور پر قابض نہیں تو بھی اسکو تمام دوسری چیزوں کی محبت پر فائق اور حاوی ہونا چاہیئے۔

خدا کی محبت کو کما حقہٗ سمجھنا نہایت دشوار امر ہے۔ فقہا کی ایک جماعت تو قطعی اس کی منکر ہے کہ انسان ایک ایسی ہستی سے بھی محبت کر سکتا ہے جو خود اس کی جنس نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی محبت کے معنی صرف خدا کے احکامات کی تعمیل کرنا ہے۔ جن لوگوں کے یہ خیالات ہیں ان کو نہیں معلوم کہ حقیقی مذہب کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ خدا کی محبت ایک فرض ہے۔ خداوند تعالیٰ ایمان والوں کے باب میں ارشاد فرماتا ہے "وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں"۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جب تک انسان خدا اور خدا کے رسول سے تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبت نہ کرے اس کا ایمان سچا نہیں ہے"۔ جب ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو آپ نے فرمایا۔ "کیا تم نے کسی دوست کو اپنے دوست کی جان لیتے ہوئے سنا ہے"۔ خداوند تعالیٰ نے اسکا جواب ارشاد فرمایا "کیا تم نے کوئی ایسا دوست بھی دیکھا ہے جو اپنے دوست کی ملاقات پر راضی نہ ہو"۔ اس وقت حضرت ابراہیم نے فرمایا "اے عزرائیل میری روح قبض کر"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا اپنے اصحاب کو تلقین فرمائی تھی "اے خدا

تو مجھے اپنی محبت عطا فرما اور اُنکی محبت جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اور وہ چیز مرحمت فرما جو مجھے تیری محبت سے قریب کردے اور اپنی محبت کو میرے دل میں ایک پیاسے کی ٹھنڈے پانی کی خواہش سے زیادہ گرانقدر کر۔" حسن بصریؒ کہا کرتے تھے "وہ شخص جو خدا کو پہچانتا ہے اُس سے محبت کرتا ہے اور وہ شخص جو دنیا کو جانتا ہے اُس سے (دُنیا) نفرت کرتا ہے۔"

اب ہم محبت کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ محبت کے معنے طبیعت کے کسی خوشگوار چیز کی طرف مائل ہو جانے کے ہیں۔ حواس خمسہ کے باب میں یہ بات بالکل واضح ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر حاسہ اُس چیز سے محبت کرتا ہے جو اُس کے لئے باعث مسرت ہو۔ جس طرح کہ آنکھ خوش منظر چیزیں پسند کرتی ہے اور کان کو موسیقی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس قسم کی محبت ہے جس میں حیوان بھی ہمارے شریک ہیں لیکن اس کے علاوہ دل میں ایک اور بھی حاسہ ہے۔ قوت بصیرت، جو حیوانات میں نہیں ہوتی۔ اس کے ذریعہ سے ہم روحانی خوبیوں اور اوصاف سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ شخص جو محض نفسانی مسرتوں سے آشنا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے معنی نہیں سمجھ سکتا کہ آپ نے فرمایا "مجھکو عبادت سے بہ نسبت عطریات اور عورتوں کے زیادہ محبت ہے۔" ہر چند کہ آخر الذکر چیزیں بھی آپکو مرغوب تھیں لیکن جس کی چشم بصیرت خدا کے اوصاف و کمالات کے مشاہدہ کے لئے کھلی ہوئی ہے تو وہ دنیاوی مناظر کو چاہے وہ کتنے ہی دل آویز کیوں نہ ہوں مقابلتاً حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اوّل الذکر قسم کے آدمی تو یہی خیال کرتے ہیں کہ خوبصورتی محض سرخ و سفید صورتوں اور اعضاء کے اچھے تناسب اور ایسی ہی دوسری چیزوں میں پائی جاتی ہے لیکن وہ اخلاقی اور روحانی خوبیوں کے دیکھنے کے لئے اندھے ہیں۔ جس کے متعلق اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ایسی ایسی خوبیوں کا آدمی ہے لیکن وہ شخص جس کے پاس چشم بصیرت ہے۔ وہ اپنے بزرگان سلف سے بھی محض اُنکے اوصاف حمیدہ کے سبب محبت کر سکتا ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ و حضرت عمرؓ کی محبت و عظمت ہر مسلمان

کے دل میں ان کے بزرگ یدہ خصائل اور عادات حسنہ کے سبب سے ہے۔ اگرچہ مُدتیں ہُوئیں کہ اُن کے جسم اطہر زیر خاک آسودہ ہیں۔ اس قسم کی محبت کسی ظاہری صورت یا جسم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ باطنی خوبیوں پر منحصر ہے۔ جس طرح جب ہم کسی بچّہ کے دل میں کسی شخص کی محبت پیدا کرانا چاہتے ہیں تو اُس شخص کی جسمانی خوبصورتیوں کا بیان نہیں کرتے بلکہ اس کے باطنی اوصاف کا ذکر کرتے ہیں۔

جب ہم اس نظریہ کو خدا کی محبت پر منطبق کرتے ہیں تو ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ صرف اُسی کی ذات ایسی ہے جو حقیقتاً ہماری محبت کے لائق ہے۔ اور اگر کوئی شخص اُس سے محبت نہ کرے تو اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ اُسکو پہچانتا نہیں۔ ہم کسی شخص میں جس چیز سے بھی محبت کرتے ہیں تو اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ خدا کا پرتو ہے اور یہی سبب ہے کہ ہم رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں کیونکہ آپ رسُول ہیں اور خدا کے محبوب عالموں اور متقی لوگوں کی محبت حقیقتاً خدا کی محبت ہے۔ یہ بات ہم پر اور اچھی طرح واضح ہو جائیگی اگر ہم اُن اسباب پر غور کریں جن سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

پہلا سبب یہ ہے کہ انسان اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اُس چیز سے جو اُسکی ہستی کو باکمال کردے اور یہ اپنی محبت خدا کی محبت کے لئے ذریعہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ انسان کا وجود اور اُس کی تکمیل سوائے عطیہ خداوندی کے اور کچھ نہیں۔ اور یہ خدا کی انتہائی مہربانی تھی کہ انسان کتم عدم سے عالم شہود میں آیا۔ اور اُس کی بقا اور ذرایع اکتساب کمال بھی خدا ہی کی مہربانی پر منحصر ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہوگی کہ اگر کوئی آدمی آفتاب کی تمازت سے کسی درخت کے سایہ میں پناہ گزیں ہو۔ اور درخت کا احسان مند نہ ہو کہ جسکے بغیر سایۂ کا وجود ہی نہ ہوتا۔ بجنسہ اسی طرح اگر خدا نہ چاہتا تو انسان ہوتا اور نہ اُس کے یہ تمام اوصاف۔ تو پھر وہ خدا کو پہچانتے ہُوئے اُس سے کیونکر محبت نہ کرے؟ دراصل جاہل خدا سے محبت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کی محبت صرف اُسکے جاننے ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جاہل کو علم کہاں؟

دوسرا سبب اس محبت کا یہ ہے کہ انسان اپنے محسن سے محبت کرتا ہے۔ اور دراصل

اُس کا حقیقی محسن خدا ہے۔ کیونکہ اُس کے ہمجنس اُس کے ساتھ جو کچھ بھی اچھا سلوک کرتے ہیں وہ سب تائید خداوندی ہے۔ وہ کوئی بھی جذبہ ہو جو انسان کے دل کو دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنے پر آمادہ کرے۔ خواہ مذہبی خیال سے تحصیل ثواب یا طلب جاہ یا خواہش نام نیک کچھ بھی ہو اس جذبہ کا محرک صرف خدا ہی ہوتا ہے۔

تیسرا سبب اس محبت کا یہ ہے کہ یہ محبت پیدا ہوتی ہے خدا کے اوصاف پر غور و تفکر سے اس کی قوت و دانائی کے سمجھنے کی کوشش سے جس کی ایک ہلکی سی جھلک انسان میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ محبت اُس محبت کے مثل ہے جو ہم اپنے بزرگانِ سلف کے ساتھ محسوس کرتے ہیں حالانکہ ہمکو اُن سے کسی ذاتی منفعت پہنچنے کی توقع نہیں۔ یہ محبت نہایت بے لوث ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا "وہ بندہ مجھکو نہایت محبوب ہے جو مجھکو کسی سزا کے خوف سے یا انعامات کی توقع پر تلاش نہیں کرتا بلکہ محض اُس فرض کے ادا کرنے کے لئے میرا طالب ہوتا ہے جو میری الوہیت کا مقتضا ہے"

چوتھا سبب اس محبت کا انسان اور خدا کا درمیانی تعلق ہے۔ جسکا اشارہ رسول اکرم صلعم کے اس قول میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی ہی شباہت پر خلق کیا ہے۔ مزید برآں خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کا میرا بندہ مجھ سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ میں اُسکو اپنا دوست بنالوں اور جب میں اس کو اپنا دوست بنا لیتا ہوں تو پھر میں اُس کا کان۔ اُس کی آنکھ۔ اُسکی زبان بنجاتا ہوں۔ خدائے تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرماتا ہے کہ میں بیمار تھا اور تم میری عیادت کو نہیں آئے حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ خدایا تو تو زمین و آسمان کا شہنشاہ ہے تو کیونکر بیمار ہو سکتا ہے! جواب ملا کہ اے موسیٰ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اگر تم نے اُسکی عیادت کی ہوتی تو گویا میری عیادت کرتے۔

یہ ایک ایسا مضمون ہے کہ جسپر کوئی تفصیلی بحث کرنا خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ یہ عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے اور ذی فہم لوگوں کے قدم بھی اُس میدان میں اکثر شرک و کفر کی طرف متزلزل ہوجاتے ہیں تاہم وہ تعلق جو انسان اور خدا کے درمیان پایا جاتا ہے وہ مذکورہ بالا فقہا کے خیالات کی تردید کرتا ہے جنکا کہنا ہے کہ انسان ایک ایسی ذات سے محبت نہیں کرسکتا جو خود اسکی جنس ہی سے نہیں ہے لیکن پھر بھی باایں ہمہ تفاوت انسان خدا سے اُس نسبت کے سبب سے محبت کرسکتا ہے جسکا اشارہ اس ارشاد میں ہے "کہ خدا نے انسان کو اپنی ہی شباہت پر خلق کیا ہے"

(ترجمہ) عبدالحی صدیقی

# طلسم

مکرجی نے دایاں ہاتھ اُٹھاکر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور جیب میں سے ایک اخبار کا کاغذ نکال کر چہرے کو ہوا دینے لگا۔ گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت چلچلاتی ہُوئی دھوپ میں کلکتہ کی ایک سڑک پر رستہ چلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی نے ہوا کو چاروں طرف سے بند کرکے زمین کے نیچے آگ جلادی ہے۔

چھتری لگائے ہُوئے اور سر کو نیچا کئے ہُوئے اس عجیب صبر کے انداز سے جو بنگالی قوم کی خصوصیت ہے وہ چلا جا رہا تھا۔ کہ ایک دفعہ سر اُٹھانے پر اس کی نظر ایک کتب فروش کی دوکان کے باہر ایک اخبار کے پوسٹر پر پڑی "انجن ڈرائیور لکھپتی ہو گیا" اور اس کے نیچے "مصر کی پرانی قبور کے خزانے" لکھا ہُوا تھا۔

اس کے چہرے پر ایک ملال آمیز مسکراہٹ کا اظہار ہُوا اور اسکے مُنہ سے نکلا "اپنی اپنی قسمت ہے"۔ لیکن وہ مسکراہٹ ہونٹوں سے زیادہ دور نہ گئی۔ دفتر کی کرسی پر پانچ چھ گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد کوئی نہایت ہی پر لطف واقعہ ہونا چاہیئے تھا جس سے اسکو ہنسی آتی۔ علاوہ ازیں اس نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اور اپنی غریبانہ جائے رہائش پر پہنچنے کے لئے ابھی اسے قریباً دو میل سفر اور طے کرنا تھا۔

تاہم ان اخباری خبروں نے اسکے دل میں ایک عجیب قسم کی حرکت پیدا کردی۔ اپنی عمر کے چونتیس سالوں میں اسے ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ اس کے ساتھ ایسے واقعات گذریں جو کسی اور کے ساتھ نہ گذرے ہوں۔ اس کی طبیعت ایک سیاح کی مانند تھی اور اس کے جذبات وہی تھے لیکن اتنی طاقت نہ تھی کہ انکو پورا کرنیکے لئے وہ کوئی عملی کارروائی کرسکتا۔ اپنے ان خیالات کا اس نے آج تک کسی سے اظہار نہ کیا تھا۔ اور اپنی بیوی تک کو ان خیالی گھوڑوں کی شکل نہ دکھائی تھی جو وہ دوڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ بیچاری سیدھی

سادھی دنیادار عورت تھی اور اسکے آگے چولھے کے سامنے بیٹھ کر مچھلی اور بھات کے پکنے کی خوشبو کے مقابلہ میں غروب آفتاب کے وقت رنگا رنگ بادلوں کے ہوائی قلعے بنانے کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ لیکن مکرجی کے دل میں یہ یقین تھا کہ خواہ اسے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے آخر کبھی وہ دن ضرور آئیگا جب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اپنے مکان پر پہنچنے کے لئے ابھی اسے ایک میل اور جانا تھا کہ یک لخت اس کی نگاہ ایک پرانے عجائبات بیچنے والے کی دکان کی کھڑکی پر پڑی۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ شائد وہاں سے بغیر کسی احساس کے گذر جاتا۔ لیکن آج اس کھلی ہوئی کھڑکی نے اس پر وہ اثر کیا جو طوفانی سمندر کی اندھیری رات میں جہاز راں پر یکایک "لائٹ ہاؤس" کی روشنی نظر آجانے سے ہوتا ہے۔

مکرجی بے اختیار سا ہو کر کھڑکی کے سامنے ٹھیر گیا اور پیتل اور چینی کی بنی ہوئی مختلف چھوٹی بڑی چمکدار اشیاء پر نگاہ دوڑانے لگا جو وہاں رکھی ہوئی تھیں۔ اپنے آپ پر جبر کر کے وہ وہاں سے گذر جانے کو تھا کہ اسکی آنکھیں کھڑکی کے بائیں کونے میں ایک سنگ یشب کے بنے ہوئے چھوٹے سے سبز بُت پر جم گئیں۔ اس بت میں کوئی عجیب بات نہ تھی اور نہ وہ کچھ زیادہ قیمتی ہی نظر آتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ مکرجی جبراً اپنی نگاہ اس پر سے ہٹا لیتا تھا۔ وہ پھر بے اختیار اُدھر ہی کو چلی جاتی تھی۔ اس بت کے چہرے پر ایک نئی قسم کی مسکراہٹ سی تھی اور اس کی آنکھیں تمام کائنات کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں بے حد عقل دوراندیشی۔ راز۔ تخیل۔ اور اُداسی پنہاں تھی۔ اور انسانی علم سے بہت بڑھا ہُوا علم موجود تھا۔ ہاں۔ یہی آنکھیں تھیں جو اُس گرمی سے بوکھلائے ہُوئے انسان کو جو کھڑکی سے باہر کھڑا دیکھ رہا تھا دکان کے اندر کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اس بت نے اپنی عمر کے چونتیس سال مدرسے کی تعلیم کے مدارج مزدور کی طرح طے کرنے کے بعد کلرکی کے میز پر خشک اور بے لطف مضامین نقل کرنے میں نہیں گذارے تھے۔ اس کی حدِ نگاہ انسانی حدِ نگاہ سے لاکھوں کوس دور تھی اور اسکے سینے میں خدا جانے کیا کیا بھید بھرے ہُوئے تھے۔ غیر ممکن نہ تھا کہ اُس میں ایسے اثرات

بھی ہوں جن سے اُس کا مالک بھی متاثر ہو سکے۔
دفعتہً مکرجی کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی۔ وہ اس چھوٹے سے دیوتا کا مالک بننا چاہتا تھا۔ خواہش گو مجنونانہ تھی لیکن زبردست تھی۔ وہ اسکو ضبط نہ کرسکا اور دروازہ کھول کر دکان میں داخل ہوگیا۔

"مجھے وہ چھوٹا سا بت دکھایئے جو کھڑکی میں رکھا ہوا ہے"
یہ فقرہ جھجکتے ہوئے انداز میں اس نے اس بڈھے چینی دکاندار سے کہا جو دکان کے عقبی حصے سے دروازہ کھلنے کی آواز سُن کر نکل آیا تھا۔ اس نے اس کم حیثیت سے بابو کی شکل دیکھ کر اندازہ کیا کہ یہ ایسی چیز کہاں خرید یگا۔ اور دوپہر کے وقت مزے کی نیند میں سے اُٹھائے جانے کی وجہ سے اس کی طبیعت زیادہ باتیں کرنے کی طرف راغب بھی نہ تھی۔ اس نے کہا " تو کیا باہر کھڑکی میں سے نظر نہیں آتا؟"
لیکن مکرجی کا دلی جوش ایسا معمولی نہ تھا کہ وہ اس جواب کی درشتی کو محسوس کرتا۔ اس نے سنبھلی ہوئی آواز سے پھر کہا " برائے مہربانی مجھے دکھا دیجئے۔ اسکی قیمت کیا ہے؟"
قیمت کے سوال نے بڈھے پر جادو کا سا اثر کیا۔ اسکی تجربہ کار آنکھ نے بابو کی حیثیت کو بھانپا اور خیال کیا کہ زیادہ دام مانگنے فضول ہونگے۔ ایسا نہ ہو کہ چڑیا ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لئے اس نے نہایت ملائمت سے کہا۔

"دام تو بہت ہیں لیکن آپ سے میں سات روپیہ ہی لونگا"
کانپتی ہوئی انگلیوں سے مکرجی نے وہ بت دوکاندار کے ہاتھ سے لے لیا اور اسکی قیمت ادا کردی جو اسکی ایک ہفتے کی کمائی سے زیادہ تھی۔ دوکاندار جسے اُمید نہ تھی کہ بابو اتنا روپیہ خرچ کردیگا حیران ہوگیا۔ اور اس بات نے اسکی زبان کو کھولدیا۔
"یہ ایک قابل قدر چیز ہے بابو صاحب۔ مجھے اب یاد آیا ہے کہ جس شخص سے میں نے اسے خریدا تھا وہ کہتا تھا کہ اس میں ایک عجیب خاصیت ہے کہ جس شخص کے قبضے میں یہ ہوگا وہ شام ہونے سے پہلے پہلے تمام انسانی جذبات کو اپنے دل میں بڑی شدت سے محسوس کریگا۔ یعنی تمول اور غربت کے راز۔ خوشی اور غم۔ محبت اور نفرت۔ موت اور

زندگی۔اور یہ سب کچھ سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہی پہلے"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک پرانی گھڑی نکالی اور وقت دیکھ کر اور قہقہہ لگا کر کہنے لگا" اڑھائی بجنے میں دو منٹ کی دیر ہے۔ اس لئے اگر آپ شام سے پہلے پہلے اس تمام فہرست کو ختم کیا چاہتے ہیں تو آپکو ذرا عجلت سے کام لینا پڑیگا"

مکرجی آہستہ آہستہ بازار میں جارہا تھا۔ وہ بت اسکے ہاتھ میں تھا اور اس کے دماغ میں خون ایک نئے انداز سے حرکت کر رہا تھا۔ بازار کے کونے پر رک کر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اسکے قلب پر آئندہ ہونے والے واقعات کی امید بھری خواہش سی طاری تھی۔ دور کسی گھڑیال نے آدھ گھنٹہ بجایا۔

گھڑیال کی گونج ابھی بالکل ختم نہ ہوئی تھی۔ کہ اسے پیچھے کی طرف سے ایک ہلکی سی" گھرررر" کی آواز آئی۔ اس کا دل اچھلا اور وہ یک لخت مڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کے پاس ہی ایک بہت بڑی زرد رنگ کی موٹر کھڑی تھی جس کی چمک دمک شوفر کی وردی اور ہلکی آواز سے تمول اور طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔

موٹر کے اندر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی منہ پر ریشمی رومال رکھے بیٹھا تھا اور صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ لیکن مکرجی کی نظر اس پر سے گذر کر ایک دوسری ہستی پر جو اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی حیرت اور استعجاب سے جم کر رہ گئی۔ یہ ایک عورت تھی۔ جس کا صاف سفید رنگ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں چھوٹے چھوٹے ہونٹ اور لمبے سیاہ لہراتے ہوئے بال تھے اور اس نے ایک ہلکے دھانی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

مکرجی مبہوت ہو کر ادھر دیکھ رہا تھا کہ گویا اعجاز کا ظہور ہوا۔ یعنی اس حسن کی دیوی نے موٹر میں سے آگے کو جھک کر اسے اشارے سے بلایا۔ یہ بیچارہ بت بنا ہوا بحس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بلانے کا اشارہ پھر کیا گیا اور اس دفعہ ایک سفید نازک جواہرات سے لدے ہوئے ہاتھ نے موٹر کے دروازے کو کھول دیا اور ایک نہایت میٹھی اور سریلی آواز آئی" آؤ"

کیا ابھی سے اس چھوٹے سے سبز دیوتا نے اپنا طلسمی اثر شروع کر دیا تھا؟ کیا اسکی ان دیکھی باتوں کو دیکھنے کی خواہش اتنی جلدی پورا ہونیکے قریب تھی؟ اس نے ارادہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو وہ اب پیچھے نہیں ہٹیگا۔ چنانچہ بت کو جیب میں ڈال کر چپ چاپ موٹر میں سوار ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمی کو جو موٹر میں بیٹھا ہُوا تھا ان تمام باتوں سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے کونے میں بیٹھا ہُوا سامنے کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اس دیوی نے ہاتھ کے اشارے سے مکر جی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور اپنی ہلکی لیکن بے حد سُریلی آواز سے بنگالی زبان میں کہنے لگی "مجھے آپ سے کُچھ کام ہے۔ اس میں غالباً آپ کا زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔ لیکن میرے لئے یہ ایک زندگی اور موت کا سوال ہے اور آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ کیا آپ میری خاطر یہ کام انجام دینگے؟" اس نے اپنی سفید نرم اُنگلیوں کو مکر جی کے سخت اور (اس وقت) بہت سرد ہاتھ پر رکھدیا اور آگے کو جُھک کر پھر پوچھا۔ "مہربانی کرکے مجھے جواب دیجئے۔ میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام کرکے آپ کو پچھتانا نہیں پڑیگا"

رُکتے رُکتے اُس نے جواب دیا "ہاں" اور پھر صاف آواز سے "ہاں۔ میں آپ کے واسطے جو بھی آپ چاہیں کرنے کے لئے تیار ہوں"

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"مکر جی"

"کیا اچھا نام ہے۔ آپ مجھے کملا کے نام سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ گو اسکی ضرورت ہمیں صرف ایک گھنٹہ کے قلیل عرصہ کے لئے ہی ہوگی۔ آپ میرے دوست ہیں۔ اور مہربان ہیں آپ میرے لئے ایک بھاری خدمت انجام دینگے اور اس کے عوض میں میں آپ کو تمام عمر یاد رکھوں گی"

مکر جی کی نظر گھبرائے ہُوئے انداز سے اُس ادھیڑ عُمر کے آدمی کی طرف اُٹھی عورت نے اس کا مطلب فوراً سمجھ لیا۔

"اس کی کچھ فکر نہ کریں۔ وہ صرف اپنی زبان یعنی ہندوستانی جانتا ہے۔ بنگالی زبان نہیں سمجھتا"۔ اسکے مُنہ سے ایک لمبی آہ نکلی اور ایک لمحے کے لئے اسکے چہرے سے بے حد تکلیف اور اندوہ ظاہر ہونے لگا۔ آہ پرمیشر مجھے اس دُکھ سے نجات دے"

مکرجی کا سر عجیب قسم کے احساسات سے گھوم رہا تھا۔ اور اسے دین دُنیا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اس نے پوچھا "وہ کیا خدمت ہے جو میں آپ کے لئے سر انجام دے سکتا ہوں؟ اور وہ حیران تھا کہ اس عورت نے اپنے کام کے لئے اُسے ہی کیوں انتخاب کیا ہے؟

عورت نے اس کی طرف شکریہ سے بھری ہُوئی نگاہوں سے کچھ عرصہ دیکھا اور پھر کہنے لگی "میرے مہربان وہ بات آپ کو میں جلدی ہی بتا دونگی۔ آہ لیکن آپکو بھوک لگی ہوگی۔ میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں"۔

بڑی ہمت کر کے مکرجی نے کہنا چاہا کہ اُسے اشتہا نہ تھی۔ ایسے وقت میں اسے اشتہا کہاں محسوس ہوتی لیکن کملا نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور کہا "آپ میرے مہمان ہیں۔ اور پھر آپ میرے لئے ایک اہم کام انجام دینے والے ہیں کہدو نہ ہاں کملا"۔

مکرجی کو گویا دُور سے اپنی آواز یہ کہتے ہُوئے سُنائی دی "ہاں کملا۔ دیوی۔ میں آپکے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جو بھی آپ فرمائیں"۔

موٹر بازاروں میں سے گذرتی جا رہی تھی لیکن مکرجی کو کوئی احساس سوائے اسکے نہ تھا۔ کہ بھینی بھینی انگریزی عطر کی خوشبو پھیلی ہُوئی تھی۔ اور اس کے پہلو میں بجلی سی کوند رہی تھی۔

اس کے بعد گویا ایک خواب سا تھا جس میں موٹر ٹھیر گئی۔ اور وہ اُس ادھیڑ عمر کے آدمی اور اُس تصویر کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہُوا۔ میز پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے جو اُسی طرح خواب کی حالت میں اس نے کھائے۔ کبھی کبھی ایک گھنٹی کی طرح سُریلی ہنسنے کی آواز آجاتی تھی۔ جس سے مکرجی کے دل کے تاروں میں ایک جھنکار سی پیدا ہوتی تھی۔ وہ دوسرا آدمی چپ بیٹھا رہا اور اُس نے گفتگو میں کوئی حصّہ نہ لیا۔

کھانا کھانے سے رفتہ رفتہ مکرجی کے کمزور بدن میں طاقت آنی شروع ہوئی اور اسکے چہرے پر رنگ آنے لگا۔ اسکے دل میں خیال آیا کہ غالباً عیش اسی کا نام ہے۔

کملا نے نہایت خوش ہوکر ہنستے ہُوئے کہا "بابوجی اب تو آپ اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔ اس وقت آپ پوری صحت میں اور طاقتور معلوم ہوتے ہیں"

مکرجی نے اس کی صاف اور چمکدار آنکھوں کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ "یہ میری زندگی کا پہلا قابلِ یادگار دن ہے۔ برائے مہربانی مجھے بتائیے کہ اسکا عوض میں کس طرح ادا کرسکتا ہوں۔ آجتک میری عمر ایک پودے یا جانور کی طرح بسر ہُوئی ہے۔ آپ نے مجھے نئی زندگی بخش کر ایک نئی دُنیا کے کنارے لاکر کھڑا کردیا ہے۔ مجھے اب احساس کی ضرورت ہے خواہ اس میں درد ہی کیوں نہ ہو۔"

کملا نے اس آدمی کے پتلے دُبلے پرشوق چہرے کی طرف دیکھا۔ جس میں وہ آگ چمک رہی تھی جس کی ایک چنگاری بھی آج سے پہلے وہاں موجود نہ تھی" مکرجی صاحب! آپ کو زندگی کی خواہش ہے اور احساس کی۔ خواہ اس میں درد ہی کیوں نہ ہو؟" اُس کے چہرے پر سے ایک سایہ سا گذرا "ہاں۔ میرے پیارے محسن زندگی ایسی ہی چیز ہے۔ یعنی اگر انسان سطح سے نیچے اصلیت کی طرف تھوڑی دُور بھی جانے کی کوشش کرے تو تکلیف ہوتی ہے۔ ضرور ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں کیونکہ میں اس درد کی لذت سے واقف ہوں" اسکے ہاتھوں کی اُنگلیاں زور سے بند ہو گئیں۔

مکرجی نے آہستہ آہستہ پوچھا "مجھے اپنی زندگی کے کچھ حالات بتائیے۔ کملا۔ بتائیے۔ کہ میں آپ کی کس طرح مدد کرسکتا ہوں؟"

وہ عورت اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسی سوفے پر آبیٹھی جس پر مکرجی بیٹھا تھا اور کہنے لگی "سُنیئے۔ میں آپ کو ایک کہانی سُناتی ہوں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کئی سال ہُوئے کہ کلکتہ میں ایک لڑکی تھی جس کا نام . . . . . . . "

"کملا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنی کہانی سنا رہی ہیں۔"

"ہاں کملا تھا۔ اُسکے والدین پرانے خاندانی رئیس تھے اور اس بات پر اُنہیں ناز تھا

لیکن وہ غریب ہوگئے تھے۔ کچھ جائداد یعنی مکانات وغیرہ اور زمین تو تھی۔ لیکن انکی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں سے کچھ گروی تھے اور باقی کی شان قائم رکھنے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ لڑکی تعلیمیافتہ تھی۔ حسین تھی۔ لیکن یہ تعلیم اُسے صرف ایک ارادے کو مدنظر رکھکر دلائی گئی تھی کہ وہ کسی دولتمند شخص سے شادی کرے تاکہ اس کا بھائی چمن جو جائداد کا وارث تھا اس قابل ہوجائے کہ اپنی پرانی رئیسانہ شان وشوکت کو حاصل کرسکے۔"

مکرجی کے منہ سے نکلا "اُف کس قدر ظلم ہے۔ وہ کس طرح یہ خواہش کرسکتے تھے کہ تمہیں بیچ دیں اور تمہارے بھائی پر تمہاری زندگی کو قربان کردیں؟"

کملا نے اپنی اُنگلی اُٹھائی "نہیں صرف بھائی کے لئے نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے خاندان کا نام ونمود قائم رہے۔ اور چمن کی اولاد کے پاس بھی اتنا روپیہ ہو سکے کہ وہ رئیس کہلائیں۔"

"لیکن کیوں؟ کیا تمہارے بھائی کی شادی وہ ایسی جگہ نہ کرسکتے تھے جہاں سے اُسے روپیہ ہاتھ آجاتا۔ اور تمہاری زندگی خراب نہ ہوتی؟"

"نہیں۔ چمن نے اپنے آپ کو نالائق ثابت کیا تھا۔ اس نے اچھی تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ اور بیکار تھا۔ اس لئے کوئی امیر آدمی اسے اپنا داماد بنانا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ کملا ہی کی شادی کسی روپے والی جگہ کی جائے۔ خواہ خاوند کی عمر کچھ ہی ہو۔"

بیچارے کلرک کا دل اُبل رہا تھا لیکن اس کے مُنہ سے سوائے اسکے کہ "کس قدر خود غرضی ہے" اور کچھ نہ نکلا۔

عورت نے کہانی کو جاری رکھا، "کملا کو اپنے والدین سے محبت تھی۔ اسکو چمن سے بھی محبت تھی خواہ وہ کیسے ہی خود غرض تھے۔ اور وہ صابر و شاکر ہوکر ان کی مرضی کے مطابق شادی بھی کرلیتی اگر قسمت نے اسکے راستے میں ایک شخص مسمی ہری لال گھوش کو نہ لا ڈالا ہوتا۔ ان دونوں یعنی کملا اور ہری لال کی ملاقات ایک گارڈن پارٹی میں ہوگئی ہری لال کی محبت ایک اندھے اور دیوانہ وار جوش سے مشابہ تھی۔ اور کملا بیچاری پنجرے کی قیدی چڑیا کی طرح پھڑپھڑاتی تھی لیکن قفس کی تیلیوں کو توڑنے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔ مکرجی نے

پوچھا "کیا اس کی مالی حیثیت کچھ اچھی تھی؟"

عورت نے سر کو ہلایا "نہیں۔ وہ دونوں وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے مل لیتے تھے ہری لال کا دل امید کے خوشگوار خواب سے بھرا ہُوا تھا۔ لیکن وہ آنے والی جدائی کے یقین سے اُلجھی جاتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ والدین کی مرضی کے خلاف نہیں چل سکتی۔ آخر ایک دن روپیہ کی اشد ضرورت آ پڑی۔ چمن نے بہت سا روپیہ کہیں جُوئے میں ہار دیا۔ اور اسکے والدین نے فیصلہ کر لیا کہ کملا کی شادی فوراً کر دینی چاہیئے۔" عورت ایک دو لمحے کے لئے ٹھیر گئی اور نظر اُٹھا کر اُس نے اُس خاموش ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف دیکھا جو کمرے کے دوسرے کونے میں ان دونوں پر اپنی سیاہ پُر غور آنکھیں جمائے ہُوئے بیٹھا تھا۔ "ایک بڑے امیر پولیس افسر کے پاس اُن کی بہت سی زمینیں گروی تھیں۔ اسے کملا کے ساتھ شادی کرنے کا بہت اشتیاق تھا اور اس نے اس شادی کے عوض بہت سا روپیہ انہیں دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔"

"جب یہ غم کملا سے تنہا برداشت نہ ہو سکا۔ تو اس معاملہ کا ذکر اس نے ہری لال گھوش سے کیا۔ اُس نے قسم کھائی کہ وہ اتنا روپیہ حاصل کرنے کے لئے زمین و آسمان کو ہلا دیگا۔ اور خواہ کچھ ہو جائے تین ہفتہ سے پہلے روپیہ پیدا کر لیگا۔ کیونکہ کملا کی شادی ایک ماہ بعد قرار پائی تھی۔ شادی کی تیاریاں بڑی عجلت سے کی جانے لگیں اور کملا ہر ایک گھڑی اس انتظار میں کاٹنے لگی کہ لال اسکو تمام عمر کے لئے غم واندوہ میں دفن ہو جانے سے بچا لیگا۔ لیکن شادی میں ایک دن رہ گیا اور ابھی تک اسکا پتہ نہ تھا۔"

"اُس نے خفیہ خفیہ گھر سے نکل کر شہر میں ہر ایسی جگہ تلاش کیا جہاں اُس کا ہونا ممکن تھا لیکن وہ نہ ملا۔ صرف یہی اطلاع ملی کہ کئی ہفتے سے اُسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ کملا کے دل کی تکلیف کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے ایک شخص سے بے حد محبت تھی۔ لیکن اس کی شادی ایک دوسرے شخص کے ساتھ جس کی اور اُس کی عمر میں بہت تفاوت تھا جبراً کی جا رہی تھی۔"

مکر جی کی آنکھوں میں سے آنسو گرنے کے قریب تھے "افسوس! پھر کیا ہُوا؟

کیا ہری لال وقت سے پہلے پہنچ گیا یا نہیں ؟"
کملا نے جواب میں سر ہلا یا " نہیں۔ لیکن اُسکا قصور نہ تھا۔ وہ بیمار ہو گیا۔ اور شادی کے تین دن بعد وہاں پہنچا۔ آہ! بہتر ہوتا کہ وہ کبھی واپس نہ آتا۔ اُس صورت میں کملا کو اس قدر رنج نہ ہوتا "
" کیا وہ روپیہ لے آیا تھا ؟"
" ہاں۔ یہی تو سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک خفیہ پولیٹیکل انجمن کے ہاتھ میں فروخت کر دیا تھا۔ اور تمام عمر اُنکا خونی کام انجام دینے کا وعدہ کر آیا تھا۔ صرف اِس لئے کہ اپنی محبوبہ کو ظالموں کے ہاتھ سے بچا سکے۔ لیکن اُسے بخار ہو گیا۔ اور وہ اُس وقت چار پائی پر بیہوش پڑا تھا جب کملا کے والدین نے کملا کو زنجیروں سے جکڑ دیا۔ گیا وقت اب ہاتھ نہ آسکتا تھا۔ اب اُسے معلوم ہُوا کہ وہ تمام عمر ایک خوفناک انجمن کا ساتھ دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ اور انجمن بھی وہ انجمن جس کو تباہ و برباد کرنے کی اس پولیس افسر نے قسم کھا رکھی تھی جو کملا کا خاوند تھا "
مکرجی کے مُنہ سے ایک لمبی سرد " آہ " نکلی۔
عورت نے تھکے ہُوئے انداز سے اپنی پیشانی سے بالوں کو پیچھے ہٹایا " کئی سال سے وہ پولیس افسر اُس انجمن کے ممبروں کو ایک ایک کر کے قابو میں لا رہا ہے اور ان میں سے کئی ایک کو بڑی بڑی سخت سزائیں دلا چکا ہے۔ لیکن ہمیشہ اسکو حسنِ اتفاق کہئیے یا کملا کی دعاؤں کا اثر۔ ہری لال اسکے پنجے سے نکلجاتا ہے۔ کل کملا کو اطلاع ملی کہ آج ایک شخص وہ کاغذات بہم پہنچا کر پولیس افسر کے پاس لانے والا ہے جن میں لال کے جرم کا مکمل ثبوت اور اس جگہ کا پتہ ہو گا جہاں وہ روپوش ہے "
" آج ؟" مکرجی نے زور سے سانس لی۔ آخر کار اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ خدمت کیا تھی جو اُس سے لی جانے والی تھی اور اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کوئی معمولی کام نہ ہو گا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کے دل نے کمزوری یا خوف کو محسوس کیا۔ لیکن صرف ایک ہی لمحے کے لئے۔ یہ وہ دن تھا جب اُس نے ایک نئی دنیا کو دیکھا تھا۔ یا یہ کہ اُنہیں

ایک نئی رُوح پیدا ہوگئی تھی۔ وہ رُوح خوف کے اوپر غالب آگئی۔ اُس نے پوچھا "مجھے بتائیے کہ یہ شخص کون ہے؟" اُس نے اس آدمی کی طرف جو کونے میں علیحدہ بیٹھا ہُوا تھا اشارہ تو نہ کیا لیکن عورت نے اس کے مطلب کو سمجھ لیا۔

"یہ وہی پولیس افسر ہے جس نے کملا سے شادی کی تھی۔ یہی وہ شخص ہے جسکے ہاتھ میں ہری لال کی قسمت اور اُس کی جان ہوگی۔ اور جس کو وہ تھوڑے عرصے میں شاید ابھی اُس ہاتھ کی ایک حرکت سے کچل دیگا۔ اگر.........."

"اگر میں اُس کی مدد نہ کر سکا؟" نکرجی کی سانس پھولی ہُوئی تھی "جلدی بتائیے کہ میں اُسکے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میں آپ کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہوں"۔

عورت نے کہا "میں حیران ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کہاں تک آپکو اپنے لئے خطرے میں ڈالنے کا حق حاصل ہے۔ آپ اجنبی ہیں۔ اور یہ انصاف سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ کو راستے سے بلا کر اپنے ساتھ لے لیا گو مجھے بالکل امید نہ تھی کہ آپ میری مدد کرنے کو تیار ہونگے۔ یہ آخری کوشش تھی۔ آخری پانسا تھا جس پر میں بے اختیار ہو کر کھیل گئی"۔

"یہ۔ آپکا خاوند کیا سمجھتا ہے کہ میں کون ہوں؟"

کملا مسکرائی "نہ اُسے خبر ہے اور نہ وہ پرواہ کرتا ہے۔ میں بہت سی ایسی باتیں کیا کرتی ہوں جن کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اور اگر چاہوں تو بالکل ناواقف آدمیوں کو اپنے گھر مدعو کر لیا کرتی ہوں۔ اسے صرف اپنا بدلہ لینے کا خیال ہے۔ وہ اس تمام خفیہ انجمن سے بھی زیادہ ہری لال کا دشمن ہے اور اُس سے قصاص لیا چاہتا ہے"۔

"تو کیا اِسے شبہ ہے کہ آپ کو اُس سے محبت تھی؟"

"ہاں۔ اسے معلوم ہے کہ مجھے اُس سے محبت تھی۔ اور مدۃ العمر رہیگی لیکن اسے شبہ نہیں ہُوا تھا۔ اسکو بتایا گیا تھا۔ میرا راز افشا کر دیا گیا تھا"۔

"آپ کا راز افشا کر دیا تھا؟ کس نے؟"

عورت کے چہرے پر درد کے آثار کا گذر اس طرح ہُوا جس طرح سُورج پر سے

سیاہ بادل کا ٹکڑا گذرتا ہے" میرے بھائی نے۔ اُس شخص نے جسکے لئے میں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ اُن کاغذات کو جمن ہی آج یہاں لانے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس آخری موقعہ پر اپنی تمام امیدیں آپ سے وابستہ کر دیں۔ اب بھی آپ کی مدد سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمام ثبوت جو ہری لال کے برخلاف جمع کئے گئے ہیں ضائع کر دئے جا سکیں۔ میری موٹر باہر سڑک کے کونے پر کھڑی ہے۔ میرا ملازم آپ کو جہاں آپ کہینگے پہنچا دیگا۔ جب میرا بھائی یہاں آئے تو آپ الگ کھڑے رہیں اور اُس سے مجھے ہی نبٹنے دیں۔ وہ مسلح ہوگا اور آپ کو اپنی جان خطرے میں نہ ڈالنی چاہیئے مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ میرے خاوند تک پہنچ سکے وہ کاغذات اُسکے ہاتھ سے لے لینا اور بھاگ جانا۔ میں اس بات کا خیال رکھونگی کہ وہ آپ کو کوئی ایذا نہ پہنچا سکے۔ شوفر کو کہنا کہ آپ کو دریائے ہگلی کے قریب کہیں لے جائے پھر اُس کو رخصت کر کے کاغذات کو ضائع کر دینا۔ یہ یاد رہے کہ ایک آدمی کی جان اور ایک عورت کا دل آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا۔ میرا کام یہ ہوگا کہ جمن کو یا اپنے خاوند کو آپ کے تعاقب میں نہ جانے دوں"۔ دروازے پر گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور عورت کے منہ سے نکلا" آہ! وہ آگیا ہے۔ پرمیشر کے لئے جو میں نے کہا ہے وہی کرنا۔ مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ تمام معاملہ بگڑ جائیگا"

میں آپ کے حکم کی تعمیل میں سرمو بھی فرق نہ آنے دونگا۔ لیکن دیوی۔ کیا پھر بھی کبھی میں آپکی زیارت کر سکونگا؟"

"خدا حافظ۔ مکرجی صاحب۔ میرے محسن اب غالباً کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ اور یہی بہتر بھی ہوگا۔ آج سے بعد اگر میں زندہ رہی تو اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گی۔ ممکن ہے آپ مجھے دیکھ پائیں لیکن میں آپکو کبھی نہ دیکھوں گی"۔

دروازہ زور سے کھلا اور ایک پتلا دبلا سانولے رنگ کا آدمی جلدی سے کمرے میں داخل ہوا۔ عورت فوراً اُٹھ کر جھپٹی۔ مرد کے منہ سے غصے میں دو ایک الفاظ نکلے ایک فولادی دھار کی چمک دکھائی دی۔ پھر یکے بعد دیگرے پستول کی دو گولیاں چلیں

کمرہ دھواں دھار ہوگیا۔ مکرجی کی ناک منہ اور آنکھوں میں دھواں بھر گیا۔ لیکن اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جو کملا نے بھائی سے چھین کر اسے دے دیا تھا۔ وہ لفافہ جس پر ہری لال کی زندگی کا دارومدار تھا۔

وہ بازار میں تھا اور موٹر فرّاٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔ دونوں طرف کے مکانات ہوا میں اُڑتے نظر آتے تھے۔ اور اس کا دماغ اس کمرے کے آناً فاناً ہوجانے والے واقعات کے نظارے کی یاد سے چکرا رہا تھا۔ وہ نظارہ اسکے دل پر ہمیشہ کے لئے نقش ہوچکا تھا۔ یعنی کملا اور چمن کا زمین پر پڑے ہونا۔ اور جب لفافہ مکرجی نے اس سے لیا تو کملا کے درد بھرے ہونٹوں سے "جاؤ" کی آواز۔ اُس ادھیڑ عمر کے آدمی کا کرسی سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ انکی طرف چلنا گویا اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ اس قدر خوفناک حادثہ وقوع پذیر ہوچکا ہے؟

اس کمرے میں کیا ہوگیا تھا؟ کیا واقعی وہ حُسن کی دیوی ہمیشہ کے لئے سرد ہوچکی تھی؟ اُس کی باتوں میں وہ مقناطیسی اثر تھا۔ اسکا ہر ایک عضو ایسا متناسب اور چہرے کی رنگت اس قدر صاف اور خوبصورت تھی کہ موت کا خیال بھی اس کی شخصیت سے کوسوں دور نظر آتا تھا۔ وہ چہرہ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ ضرور دیکھا تھا لیکن کہاں؟ اسے ایک پولیس کے سپاہی کی وردی کی جھلک دکھائی دی۔ اور وہ پیچھے کو موٹر کی نیم تاریکی میں ہٹ گیا۔ اسے پولیس کی توجہ اپنی گذشتہ گھنٹے کی کارروائی کی طرف منعطف کرانا منظور نہ تھی۔ ابھی سے روزمرہ کے دنیاوی کاروبار میں سے گذرتے ہوئے اس کا دل اپنی اصلی حالت کی طرف واپس آرہا تھا۔ اس نے شوفر سے کہا کہ مجھے ہگلی کے پل کے اس طرف اُتار دینا۔ اسے اپنے منتشر خیالات کے اجتماع کی ضرورت تھی۔

دریا کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح کملا کے لفافے کو دریا میں ڈالا جائے کہ اسکا ہاتھ جیب میں کسی ٹھنڈی سی چیز کے ساتھ لگا۔ بُت۔ وہ سبز بُت۔ گذشتہ گھنٹے کے واقعات میں وہ اسے بالکل بھول گیا تھا۔ اس نے اسے جیب سے نکالا اور اپنے خیال میں اس سے مخاطب ہوکر

کہنے لگا" آج تو واقعی تم نے سب کچھ کر دکھایا ہے۔ عیش۔ غربت۔ خوشی۔ غم۔ رشک۔ محبت نفرت۔ اور ہاں شاید موت بھی۔ سبھی کچھ سوائے اُس آخری شئے یعنی زندگی کے۔ باوجود اسکے مجھے اس ایک دن سے زیادہ کی ضرورت نہیں"۔ اُس نے ایک آہ بھری" کسقدر عجیب عورت تھی۔ کملا۔ میں اُسے کبھی نہ بھولوں گا"۔ اور پھر اُس بت کی طرف" لیکن بس۔ ہو چکا۔ اس سے زیادہ مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں ہے"۔ نہایت احتیاط سے اُس نے وہ کاغذات کا لفافہ اور سبز بت اپنے رومال میں باندھا اور دور دریا کے بہتے ہوئے پانی میں پھینک دیا *

سڑک پر واپس آکر وہ ٹھیر گیا۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا اسکے پاس واپس گھر جانے کے لئے ٹرام کا کرایہ بھی ہے یا نہیں اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ کیونکہ اپنی تمام دولت تو وہ اُس بُت کے عوض چینی دکاندار کی نذر کر چکا تھا۔ صرف تین پیسے اور ایک کھوٹی دوّنی نکلی۔ لیکن باہر کی جیب میں ہاتھ ڈالنے سے کاغذ کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی۔ اس نے نکال کر دیکھا تو ایک کاغذ میں دو دس دس روپیہ کے نوٹ اور ایک سرخ رنگ کا گلاب کا پھول لپٹا ہوا تھا۔

تو گویا یہ کملا کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ تھا۔ اُسے خیال آیا کہ کملا کو کبھی یہ علم نہ ہوگا کہ اس وقت یہ روپیہ میرے لئے کیا وقعت رکھتا ہے اور کس قدر مفید ثابت ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ ٹرام پر سوار ہوا اور اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

" کملا، آج تو تم نے کمال کر دیا۔ اور نہایت آسانی سے شرط کو جیت لیا۔ واقعی تم غضب کی ایکٹریس ہو۔ اب ہم اگلے ہفتے سے فلم کی تیاری شروع کر دینگے۔ تم نے تو بیچارے کو پاگل کر دیا"۔ یہ کہتے ہوئے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی کملا، کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے زمین سے اُٹھا کے کھڑا کر دیا۔

" اور میری کوئی تعریف ہی نہیں کرتا،" یہ کہہ کر وہ پتلا دُبلا سانولے رنگ کا

جوان آدمی زمین سے اُٹھا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا" لیکن کرشن بھائی آئندہ جب کبھی تمہیں مس موہنی سے کسی کا دو بدو مقابلہ کرا دینا ہُوا کرے تو میری نسبت کوئی زیادہ طاقتور آدمی اس کام کے لئے تجویز کیا کرو۔ یہ تو جب دل لگا کر کام کر رہی ہو تو ایک شیرنی سے بھی زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے"

"نہیں اندر یہ بات نہ تھی۔ یہ تمام کارروائی مس موہنی اور میرے درمیان ایک شرط کا نتیجہ تھا۔ یہ اُس نئی فلم میں جو ہم شروع کرنے والے ہیں کملا کا پارٹ لینا چاہتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ ان میں ایسے زور دار پارٹ کو عمدہ طرح نبھانے کی قابلیت نہیں ہے۔ اسلئے ہمارے درمیان یہ شرط ہوئی تھی کہ اگر مس موہنی "کملا" کا لباس پہن کر کہانی کے مطابق وہی کام درحقیقت کر سکیں جو انہیں فلم میں کرنا ہوگا۔ یعنی ایک اوسط درجے کے اجنبی آدمی کو راستہ چلتے ہُوئے پکڑ کر اپنے لئے جان تک دینے پر آمادہ کرلیں تو میں انکو "کملا" کا پارٹ دے دونگا۔ یہ شرط تو بیشک مس موہنی نے جیت لی ہے لیکن اس تماشے میں اپنے ناخواستہ خاوند کا پارٹ جو مجھے دیا تھا۔ وہ بہت سخت تھا" یہ کہہ کر فلم کمپنی کا ڈائرکٹر کرشن قہقہہ لگا کر ہنسا اور کہنے لگا" بیچارہ مکرجی۔ آج رات اُسے نیند نہیں آئیگی"

مس موہنی نے ساڑھی کی پن کو بڑی نفاست سے اُتارتے ہُوئے کہا" ہاں بیچارہ مکرجی خوب آدمی تھا"

عطاءالرحمٰن

---

زندگی کے فرائض:۔ زندگی کے فرائض اُسکی پائیداری کے ساتھ قائم اور پیدا ہوتے ہیں اگر ایک دن کا کام نامکمل چھوڑ دیا جائے تو دوسرے دن دُگنا ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ (ڈاکٹر جانسن)

فرائضِ منصبی:۔ جب ہم فرائضِ منصبی ادا کرتے ہیں۔ تو ہم ذرا بھی تعریف کے مستحق نہیں ہوتے۔ کیونکہ ہم وہی کرتے ہیں جسکا کرنا ہمارے لئے ضروری ہوتا ہے۔ (اگسٹن)

سچی خوشی:۔ وہ لوگ کبھی خوش نہ تھے جنکی حالت سمندری مدوجزر کی طرح متزلزل تھی اور جنکی خوشحالی دریا کی لہر کی طرح غائب ہو گئی۔ (کوپر)

---

# محفلِ ادب

**ترجمہ کا حقیقی معیار**۔ ترجمہ کا معیار ........ یہ ہے کہ جو کیفیت اصل کے پڑھنے سے ذہن پر طاری ہوتی بعینہ وہی کیفیت، ترجمہ کے پڑھنے سے طاری ہو سکے؛ اس مقصود کے حصول میں مترجم کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنی زبان کی ساخت، صرف و نحو، محاورات کی مناسبت سے، زیرِ ترجمہ عبارت کے الفاظ کے در و بست اور ترتیب میں جو چاہے تصرف کرے؛ یہ تو آزادی کے حدود ہیں، لیکن اس آزادی کے ساتھ پابندی اس امر کی لازم ہے کہ مصنف کے خیالات کے ساتھ اپنے خیالات آمیز نہ کئے جائیں، یعنی مصنف کا مفہوم ٹھیک ٹھیک ادا کرنے میں زبان میں جو چاہے تصرف کر لیا جائے۔ لیکن اُس کے خیالات میں تصرف نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ دراصل محلِ ترجمہ بھی "خیال" ہے نہ کہ "زبان"۔ معارف

---

**غریبوں کا سچا آسمان**۔ بہار کی پیاری جانفزا نظر نے ندیوں اور چشموں کو، جنہیں برف نے جکڑ رکھا تھا، رہا کر دیا ہے؛ وادیوں میں اُمید کی مسرت سرسبز ہو رہی ہے۔

مسن جاڑے نے ضعف کے سبب پسپا ہو کر ناہموار پہاڑیوں میں پناہ لی ہے؛

اور بھاگتے بھاگتے وہاں سے بھی میدانوں کی سبز پوش سطح پر برف کے چھوٹے

چھوٹے دانوں کی بوچھار کر رہا ہے؛

میں گاؤں کی چہل پہل کی آواز سنتا ہوں

یہی ہے غریبوں کا سچا آسمان،

ہر چھوٹا بڑا خوشی کے نعرے بلند کر رہا ہے،

یہاں میں انسان ہوں،

اور یہیں میں انسان ہو سکتا ہوں۔

(گوئٹے) جامعہ

**گوئٹے کا ایک خط۔** نہیں مجھے دھوکا نہیں ہوا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں صاف صاف جھلک رہا تھا کہ اُسے مجھ سے ایک گہری دلبستگی ہے۔ اس انکشاف کا رُوح پرور کیف میری رگ رگ میں مسرت کی لہریں دوڑا رہا ہے، اور مجھے اپنے دل کے کہنے پر کامل اعتماد ہے، جو کہ ایک ہنگامہ پرور خوشی کے جوش میں ناچ ناچ کر مجھے یہ جاں بخش مژدہ سُناتا ہے کہ اُسے مجھ سے محبت ہے!

اُسے مجھ سے محبت ہے! آہ یہ خیال مجھے اپنی ہی نگاہوں میں کس قدر سرفراز کئے دیتا ہے! اور چونکہ تم میری طبیعت کے ادا شناس ہو، جو کچھ میرے دل پر گزر رہا ہے اُسے بخوبی سمجھ سکو گے، اس لئے میں بلا تامل تم سے کہتا ہوں کہ میں بیحد خودبیں ہو چلا ہوں اس غرور آفریں خیال نے مجھے اپنے آپ کو توقیر کی نگاہوں سے دیکھنا سکھا دیا ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر میں کس کی نگاہِ لطف کا ہدیۂ مقبول ہوں!

سوچتا ہوں کہ خدایا یہ محض طلسم خواب و خیال ہے کہ سچ مچ حقیقت کی جھلک۔ پھر دیکھتا ہوں تو میری نگاہِ افتخار کو روئے زمین پر کوئی فردِ بشر ایسا نظر نہیں آتا جس کے سر میں میری رقابت کا خیال تک سما سکے، جس سے زک اُٹھانے کا مجھے خوف ہو۔ لیکن جب وہ گرمجوشی سے اپنے منگیتر کا ذکر کرتی ہے تو مجھ پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ میرا دل اس طرح بیٹھ جاتا ہے، جس طرح اُس افسردہ خاطر سپاہی کا دل جس سے اُس کا طرّۂ امتیاز زبردستی چھین لیا جائے، اور اُسے اُسکے حرزِ جان یعنی تلوار سے محروم کر دیا جائے۔

غم نصیب (ہزار داستان)

---

**کُہنہ سالی پر فخر کرنا کہاں تک روا ہے۔** انسان کا دماغ بڑی حد تک کبر و نخوت کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اس لئے جب اُس پر کہولت طاری ہوتی ہے، تو وہ اپنی کہن سالگی کو مایۂ فخر و مباہات سمجھنے لگتا ہے، اور پھر اس وقت کا کیا پوچھنا جب دوسرے پیرِ فرتوت بھی اُس کے ساتھ ہوں! لیکن وہ ایک اہم ترین حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے کیونکہ جسے وہ دیرینہ سالی سمجھتا ہے وہ فی الحقیقت زوال و انحطاط کا مرادف ہے۔ اُن سنینِ

ماضیہ کی یاد سے لُطف اندوز ہونا جواُس کے مستقبل کو یوماً فیوماً مختصر کرتے جارہے ہیں کہاں تک روا ہے؟ اگر نوعِ انسان کو بوڑھوں کے وجود پر فخر کرنے کا کوئی حق حاصل ہوتا تو فطرت کی نیرنگیاں اُنہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے میں اس قدر منہمک نہ نظر آتیں۔

(ٹیگور) علیگڈھ میگزین

---

کیسی افسوسناک بات ہے کہ آجکل جب کہ تہذیب کی روشنی چاردانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے، بیشمار لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جن کا دائرۂ نظر ہنوز روزانہ زندگی کی ظاہری شکلوں اور مادّی صورتوں تک محدود ہے۔ اُن کے دل میں بھول کر بھی یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اُس کے پس پردہ حقایق کی کونسی دُنیا بس رہی ہے۔ اُن کی مثال بعینہٖ اُن بچّوں کی ہے جو پڑھنا تو جانتے نہیں، اور چند چھپے ہُوئے نقوش کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جو کچھ ہیں یہی نقوش ہیں۔

محمّد ہادی حسین (ریویو آف ریویوز)

---

رشتۂ محبت :- اپنے عزیزوں اور دوستوں کی بخوبی تواضع وتکریم کرو اور اُن کے نیک کاموں میں اعانت کرو کیونکہ اس وسیلہ سے رشتۂ محبت دوچند مستحکم اور مضبوط ہوجائے گا مگر خوشامدیوں سے پرہیز کرو۔ (لارڈ برلی)

دنیا کی حالت :- دُنیا میں کافی سے زیادہ عداوت ہے، کافی سے زیادہ بغض وحسد ہے، کافی سے زیادہ نفرت وبے اتفاقی ہے پس وہ لوگ جو نیکی اور ہمدردی کی لاف مارتے ہیں سن لیں کہ وہ اس خلیج کے عرض کو بڑھانے کا موجب نہ بنیں۔ بلکہ عملی طور پر اُن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ وہ نفرت کو گھٹائیں اور محبت کو ترقی دیں۔ (کالیرج)

دُنیا کا مدرسہ :- میں نے صرف ایک مدرسہ میں تعلیم پائی ہے اور وہ مدرسہ "یہی دُنیا ہے"۔ جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے چست وچالاک استاد درس دیتے ہیں۔ (ہگ ملر)

افتخار الرسول بدر

# حصۂ نظم

## دعوتِ عمل

ہے چاند پہلی رات کا بالائے بام تو — چمکے دلوں میں گر تو ہے ماہِ تمام تو
فرصت ہو عیش کی تو غنیمت سمجھ اُسے — جم اپنے وقت کا ہے جو رکھتا ہے جام تو
گر تیرے دل میں قوتِ ایماں ہے جلوہ گر — شاہوں کو اپنا کرکے رہیگا غلام تو
ساقی! کر آج محفلِ رنداں کو جلوہ خیز — ساغر کا لے کے ہاتھ میں ماہِ تمام تو
پیرِ مغاں کے فتوے پہ کر بخطِ عمل — گر جانتا نہیں ہے حلال و حرام تو
شاہوں کے قصر میں نہیں ملتا ترا پتہ — کرتا ہے بیکسوں کے دلوں میں مقام تو
دل میں ترے نہیں ہے اگر الفتِ وطن — کرتا ہے پھر عبث طلبِ ننگ و نام تو
ہر روز لطف اُٹھائیگا عیدِ صیام کا — میخانے میں گذار دے ماہِ صیام تو
زاہد کی پیروی سے ملیگی شرابِ خلد!! — کر اپنے دل سے دُور یہ سودائے خام تو
اک جام صبح کو ملے، اک شام کو ملے — کر آرزو خدا سے یہی صبح و شام تو
گر چاہتا ہے داخلِ دارالسلام ہو — پیرِ مغاں کو روز کیا کر سلام تو
آبِ حیات خضر سے کرتا ہے کیوں طلب — رکھتا ہے ہاتھ میں اگر اک مے کا جام تو
ہشیار ہو چکے ہیں پرندے یہاں تمام — زاہد کی طرح مکر کا پھیلا نہ دام تو
اے آفتاب! کس کو ہے کرنا تجھے شکار — کرنوں کا ہر طرف جو بچھاتا ہے دام تو
واعظ! تجھے بتا نہیں سکتا وہ اپنا راز — دیتا نہیں ہے اپنی زبان کو لگام تو
ہاں کر بلند نعرۂ حق بے خطر سلیم — باطل کے اس فسانے کو کر دے تمام تو

وحید الدین سلیم

## رباعیات

اے بارالہ بے مثالی تیری — کھنچتی نہیں تصویرِ خیالی تیری

جا ہی نہیں سکتا ہے تصور تجھ تک
اللہ رے شانِ ذوالجلالی تیری

اللہ رے شان کبریائی تیری
کونین میں پھرتی ہے دہائی تیری

تصویر ہے ہر ذرہ تری قدرت کا
حقا کہ خدا ہے تو خدائی تیری

کثرت میں نمودار ہیں وحدت کے راز
اظہر نہیں کچھ غیر حقیقت سے مجاز

اس عالمِ رنگ و بو میں اگر آنکھیں ہوں
ہر غنچہ و گل ہے سراپردۂ ناز

کوشش سببِ حسنِ عمل نا ممکن
تقدیر میں کچھ ردو بدل نا ممکن

جنت میں گزر اور جہنم سے نجات
بے سابقۂ لطفِ ازل نا ممکن

دُنیا کے بکھیڑوں میں ہے اوقات خراب
عصیاں کی نہ کچھ حد نہ گناہوں کا حساب

بے مائیگی عیش و غمِ پرسش حشر
جینا ہے وبال اور مرنا ہے عذاب

اظہر ہاپوڑی

# جذباتِ عالیہ

## فیروز طغرائی

دستۂ گل نے کہا انجمن آرا ہو کر
زینتِ بزم ہوئے پھول تو یکجا ہو کر

پھر پھرا کر بھی نہیں تا خطِ مقصد پہنچا
رہ گیا نقطۂ پرکار تمنا ہو کر

کچھ نہ پوچھو کہ رہا فرقتِ گل میں کیا حال
حسرتیں دل میں کھٹکتی رہیں کانٹا ہو کر

محمل دل میں ہی تھی لیلیٰ مقصود اے قیس
ل گیا کیا تجھے آوارۂ صحرا ہو کر

گردِ اندوہ نہیں داعیٔ لبیکِ اجل
جامۂ زیست اُترتا نہیں میلا ہو کر

تو وہ یوسف ہے جسے دیکھ کے دامانِ شکیب
چاک ہو پردۂ ناموسِ زلیخا ہو کر

خاک ہو کر بھی یہ غیرت ہے کہ مجنوں کا غبار
پردہ کرتا ہے سراپردۂ لیلےٰ ہو کر

آہ وہ نالہ کہ جو ضعف سے لب تک نہ گیا
جم گیا دل میں مرے خال سویدا ہو کر

شمع سے لو سبقِ گرمیٔ ہنگامۂ رنگ
محفل افروز بنو سوز سراپا ہو کر

کیفیت سیر و سرور چمنستان کی نہ پوچھ
پھول کا جام دیا سرو نے مینا ہو کر
ولولے خاطر افسردہ میں کیا پیدا ہوں
ہو چکا راکھ یہ آتشکدہ ٹھنڈا ہو کر

کھائیے سیل حوادث کے تھپیڑے فیروز
آرمیدہ صفتِ ساحل دریا ہو کر

## احسن مارہروی

ہے آدمی کو مر کے بھی حورِ جناں کی حرص
کمبخت لے گیا ہے وہاں بھی یہاں کی حرص
یہ مُردہ خور ہے تو وہ سفّاک زندہ کش
ہے جانِ گسل زمیں کی طمع آسماں کی حرص
ملتی جو عمرِ خضر تو کرتا نہ کیا بشر
دو دن کی زندگی پہ ہے سارے جہاں کی حرص
جو تیرِ ناز دل میں گیا ہضم ہو گیا
مہماں کو کھائے جاتی ہے اس میزباں کی حرص
ہے بوالہوس بھی عاشق ایذا طلب ترا
یعنی وہ کر رہا ہے غمِ جاوداں کی حرص
طالب پری وشوں کا تو عاشق ہے حور کا
اک بندۂ خدا کو ہے دونوں جہاں کی حرص
وابستگانِ دل یہ ہیں، جب دل نہیں تو پھر
کیسا خیال، کس کا تصوّر، کہاں کی حرص
اللہ رے خواہشیں مرے قلبِ ضعیف کی
طاقت گھٹی تو اور بڑھی ناتواں کی حرص
ہے گردِ کارواں بھی رواں مثلِ کارواں
کیا عالمِ فنا میں ہو نام و نشاں کی حرص

احسن ٹھہر سکی ہے نہ ٹھہرے گی یہ کبھی
بے کار آدمی کو ہے عمرِ رواں کی حرص

## اثر صہبائی

جلوہ ہے کس کے حسن کا چشمِ خیال میں!
عالم تمام ڈوب گیا ہے جمال میں
آرائشِ جمال میں وہ محوِ آئینہ
ڈوبا ہُوا تھا میں کسی گہرے خیال میں
حاصل نہ کچھ ہُوا دل خانہ خراب کو
اک عمر تلخ ہو گئی فکرِ مآل میں
تو خاکسار دل کو نہ یوں رائگاں سمجھ!
موجِ مئے طہور ہے جامِ سفال میں
کس کی ضیائے حسن ستاروں میں ہے اثر
ڈوبا ہُوا ہے یوں کسی گہرے خیال میں؟

# تقریظات

**نیرنگ خیال** ۔ (حصّہ دوم) آغا محمدؐ طاہر صاحب اپنے جدِامجد کے چھپے ہوئے خزانے کو ادبی دُنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس مجموعہ میں مولانا آزاد کے مفصلہ ذیل مضامین زیب قرطاس ہیں۔ جنت الحمقا۔ خوش طبعی۔ نکتہ چینی۔ مرقع خوش بیانی۔ سیر عدم۔ سیرِ عدم کو پڑھ کر سیرِ زندگی کا مضمون یاد آجاتا ہے۔ اگرچہ موخرالذکر بلاشبہ زیادہ رنگین و پُرلُطف تھا۔

لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت صرف ۱۲ار۔ آغا محمد طاہر۔ آزاد منزل۔ اکبری منڈی۔ لاہور سے طلب کیجئے۔

**جلوۂ قادری** ۔ یہ تصوف کا ماہوار رسالہ جنوری ۱۹۲۳ء سے میرٹھ سے شائع ہونا شروع ہُوا ہے۔ پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ تصوف کے معمولی مضمون شائع ہوتے ہیں ادبی حصّہ بھی پست ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے علاوہ محصولڈاک۔

شہر میرٹھ سے طلب کیا جائے۔

**زیب النساء** ۔ چھپرہ ضلع سارن (صوبۂ بہار) سے اس نام کا اک ماہوار نسوانی رسالہ ماہ دسمبر سے شائع ہورہا ہے۔ اس کی ایڈیٹری اور مینجری غرضیکہ کل انتظام نسوانی ہاتوں میں ہے۔ ایڈیٹرس کے مضامین مفید اور پُرمغز ہوتے ہیں اور ویسے بھی رسالہ اخلاقی۔ ادبی۔ نسوانی مذاق کا مجموعہ بنکر شائع ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ بلند معیار نسوانی جرائد کی کمی ہے زیب النساء کا اجرا ایسا غنیمت ہے۔ کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی درمیانہ حجم ۵۰ صفحات قیمت سالانہ چار روپے۔ چھپرہ ضلع سارن سے طلب کیجئے۔

# فہرستِ مضامین بابت ماہ اگست ۱۹۲۳ء

**جلد ۴** — **نمبر ۲**

## نثر

| مضمون | صاحبِ مضمون | صفحہ |
|---|---|---|


## نظم

| مضمون | صاحبِ مضمون | صفحہ |
|---|---|---|


آلوز کاتب

# شذرات

—— ۱ ——

کہتے ہیں "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" مگر اس کلیہ کو اردو کے ادبی رسالوں کے وجود نے باطل کر دیا ہے۔ اردو دان پبلک کے بے نیازانہ رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پبلک کو ادبی رسالوں کی قطعاً ضرورت نہیں پھر بھی ہر شہر و ہر قصبہ سے اردو رسالے حشرات الارض کی طرح پیدا ہو رہے ہیں۔ کوئی جدید معاصر سطح نمود پر ابھرتا ہے تو اسکا دامن ادبی خدمات کے ولولوں اور مستقبل کی امیدوں سے لبریز ہوتا ہے مگر یہ تمام ولولے ساری امیدیں قدر دانی کے صبر آزما اور حوصلہ سوز انتظار سے پامال ہو جاتے ہیں۔ جب کسی ادبی رسالہ کی اشاعت کا اعلان ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ مشتہر کے فریب امید پر ہمیں رحم آتا ہے، کاش جدید معاصرین اس خطرہ زار میں قدم رکھنے سے پہلے اُن فریب خوردگان رنگینئی نمو سے مشورہ لینا ضروری سمجھتے جنہیں ادبی کس مپرسی ٹھکانے لگا چکی ہے یا ٹھکانے لگانیکی فکر میں ہے۔

ہمایوں کی اشاعت جہانتک ہمیں علم ہے۔ اردو ادب کے معیاری رسالوں میں اس وقت سب سے زیادہ ہے، مگر اردو کے بہی خواہ یہ سُن کر افسوس کرینگے کہ ۳۲ کروڑ کی آبادی میں اردو کا سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا رسالہ ساڑھے بارہ سو کی تعداد میں چھاپا جاتا ہے۔

ہمایوں پر روپیہ کوڑیوں کی طرح بہایا جا رہا ہے بہتر سے بہتر کاغذ چھتر روپے ریم کا سرورق ہر ماہ ایک تصویر۔ گرانقدر اُجرتوں پر مضامین بہم پہنچانا، ظاہر ہے کہ یہ امتیازات بغیر غیر مآل اندیشانہ اسراف کے میسر نہیں آسکتے چنانچہ گذشتہ سال اوسطاً تین سو روپے ماہوار خسارہ پر ہمایوں جاری رہا۔ سال رواں بھی سال رفتہ سے کچھ امید افزا نہیں معلوم ہوتا ہمیں ہمایوں کے عام خریداروں سے التماس توجہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

"بات کیوں کھوئیں التجا کر کے"

لیکن کیا ہمارے ہزار بارہ سو ناظرین میں پچاس بھی ایسے نہ ہونگے جو اردو زبان سے عملی ہمدردی رکھتے ہوں، اگر ہیں اور قطعاً ہیں تو کیا وہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ اردو زبان کا ایک ممتاز رسالہ جس پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے جسکی اشاعت سے مقصود صرف اردو کی اشاعت ہے، جو عام اردو دان پبلک کی قدر ناشناسی کے ہاتھوں خسارہ کے ناقابل برداشت بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔ اپنی ہمدردی کو بیدار کرینگے، کیا وہ نہیں سمجھتے ؟ اور

ہمیں اسکا اندازہ نہیں ہے؟ کہ انکی ادنی توجہ انکے حلقۂ احباب میں ہمایوں کے سینکڑوں قدردان پیدا کرسکتی ہے ہمارا تصدیعہ التفات ہمایوں کے رسمی خریداروں سے نہیں بلکہ اسکے حقیقی قدرشناسوں سے ہے وہ اگر ہماری غیر مآل اندیشانہ ادبی خدمات سے ہمدردی رکھتے ہیں تو اُن کم سے کم پچاس اردو دوست اصحاب میں سے ہر ایک پانچ پانچ ہمایوں کے قدردان مُہیا کردے تو انکے لئے یہ کام بہت سہل اور ہمارے حق میں حوصلا افزا ہوسکتا ہے ہم آئندہ سے اُن تمام قدرشناسوں کے اسمائے گرامی شائع کیا کرینگے جو ہمایوں کی اشاعت میں حصہ لینگے۔

:: ۲ ::

"انجمن ارباب علم پنجاب" کا گذشتہ گرانقدر ادبی جلسہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے گذشتہ جلسوں سے ممتاز تھا اس مرتبہ اراکین انجمن نے ہندی شعرا کو بھی مدعو کیا تھا۔ چنانچہ اُردو کے مشہور شعرا کے دوش بدوش ہندی کویتوں نے بھی نظم نگاری کے جوہر دکھائے پنڈت چیت رام سنسکرت پروفیسر قومی یونیورسٹی پنجاب پنڈت ابھلاشی کی ہندی نظمیں توجہ سے سُنی گئیں۔ جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں نے "اردو ہندی اور پنجاب یونیورسٹی" کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا جس میں اس اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ قومی تعلیم ملکی زبان میں ہونی چاہیئے ہندوستان کی یونیورسٹیوں پر تفصیلی تبصرہ کیا آخر میں اُردو ہندی سے پنجاب یونیورسٹی کی مسلسل سرد مہریوں کا ذکر کرکے ذیل کا رزولیوشن پیش کیا۔

## رزولیوشن

انجمن ارباب علم پنجاب کا یہ جلسہ پنجاب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے مودبانہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اُردو ہندی کی سرپرستی کرتے ہوئے مطالبات ذیل پر ہمدردانہ توجہ فرمائیں

**(الف)**۔ اُردو ہندی کو کم سے کم سو نمبر دیکر ایف۔ اے میں لازمی اور بی اے میں اختیاری مضمون کی حیثیت دیجائے۔

**(ب)**۔ ایف۔ اے اور بی اے۔ کے امتحانوں میں طلبہ کو اختیار دیا جائے کہ وہ عربی فارسی کے پرچوں کا جواب انگلش یا اُردو۔ اور سنسکرت کے جوابات انگلش یا ہندی زبان میں دے سکیں +

**(ج)**۔ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں عربی فارسی سنسکرت اور پنجابی کی طرح ہندی اُردو کی کلاسیں بھی کھول جائیں۔

محرک نے یہ رزولیوشن پیش کرتے ہوئے ایک بسیط تقریر میں طلبہ کی مشکلات اور پنجاب یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں سے غیر ہمدردانہ رویہ پر روشنی ڈالی حضرات ذیل نے اس رزولیوشن پر تائیدی تقریریں کیں مولنا سید جلال الدین حیدر ایم اے پروفیسر چیفس کالج۔ لالا سنت رام گرو ور ایم اے پروفیسر دیال سنگھ کالج۔ لالہ مہرچند سوری ایم اے پروفیسر فورمن کرسچن کالج پنڈت وتستہ پرشاد فدا بی۔ اے۔ ایڈیٹر روشنی لاہور جلسہ کی متفقہ تائید سے یہ رزولیوشن پاس ہوا +

تاجور

# جہاں نما

**تعمیر و تخریب۔** خوشا وہ زمانہ کہ ہندو مسلم اتحاد کا غلغلہ ہندوستان کی حدود سے تجاوز کرکے بیرونی دنیا کے اطراف میں گونجتا تھا! اہلِ تمدن سمجھ چکے تھے کہ بس اب یہ بدنصیب ملک آزادی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کو ہے۔ خیال تھا کہ اس خطۂ دنیا کی پیچیدگیاں دیگر قطعات کی سیاسی اُلجھنوں سے کہیں زیادہ دقیق تھیں لیکن اک چشم زدن میں یہاں کے رہنے والوں نے اپنی پرانی کینچلی اُتار کر ایک نیا جامہ زیبِ تن کرلیا، خیال تھا کہ یہاں کے لوگ پرلے درجے کے فریب کار اور نفاق پسند تھے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں بلا کے جفاکش اور اتحاد آموز بن گئے! دُنیا سناٹے میں آگئی اور حلقۂ سیاست میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ ہندوستان نے دُنیا کا سب سے بڑا آدمی پیدا کیا ہے! آج ہم دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ کہاں ہے شیدایانِ تمدن کا یہ خواب؟ کیا یہ کوئی سپنا تھا کہ اوروں نے دیکھا اور ہم نے سُنا یا فی الواقع یہ اک واقعہ تھا کہ ہمارے ہی وطن میں ہُوا؟ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ سب کچھ ہُوا یعنی کہ یہ اک واقعہ تھا۔ ہاں واقعہ تھا کہ ہوگذرا۔ لیکن وہ اتحاد کیا جو ہوگذرے وہ ملاپ کیسا جس کا نتیجہ اک فراقِ عشقیہ ہو! قومیں ایسے چوچلوں سے ترقی نہیں پاتیں، مُلک ایسے ہتھکنڈوں سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا نہیں سیکھتے۔ قومیت کے قصرِ عالیشان کی بنیادیں جوش کے وقت میں نہیں رکھی جاتیں کہ جو کام جوش میں شروع ہو وہ ثبات کے ساتھ انجام کو نہیں پہنچتا۔ افسوس یہی ہے کہ ہم نے اپنے مُلکی مفاد کے بارے میں ایسے ہی بے ترتیب خروش سے کام لیا اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے نام نہاد اتحاد کی بُنیادوں کو کھوکھلی پاتے ہیں جس سے ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے کہ کہیں ساری کی ساری عمارت منہدم ہوکر نیچے کو نہ آپڑے۔ اُس کا صرف ایک علاج ہے کہ اس کمزور محل کو خود ہی گرادیا جائے اور خدا کی زمین پر از سرِ نو ایک تعمیر کھڑی کی جائے جو باہمی سچی محبت کی محنت سے تیار ہو اور یہ کام نام و نمود طلب کرنے والوں پر نہ چھوڑا جائے۔

**قدرت کے تازیانے۔** اس ایجاد و اختراع کے آرام دہ وقت میں بھی قدرت کا تازیانہ انسان کو نہیں چھوڑتا۔ اور چھوڑے کیونکر۔ ابھی اس مٹی کے پتلے نے طاقت کتنی حاصل کی ہے کہ اُسے

قدرت کی طاقتوں سے رہائی مل سکے یا رہائی نہ ہو تو وہ اُن پر قابو پالے۔ قوانینِ طبیعیات کا تذکرہ سُن کر ہمیں اکثر خیال ہوتا ہے کہ حادثات کا وقوع ہماری عمر میں کم ہوگا۔ یہ محض اپنے بارے میں ہمارا حسنِ ظن ہے
ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کچھ ہیں، ہیں کچھ بھی نہیں ؎
سمجھتا ہوں کہ سب کچھ ہوں حقیقت میں نہیں کچھ بھی پریشاں مجھ کو رکھتی ہے یہ میری ہیچ سامانی
تربت حیدری میں زلزلہ آیا ہزاروں جانیں تلف ہوگئیں مکانات تباہ ہوئے ایران کانپ اُٹھا مشرق سمجھا کہ میں بے دست و پا ہوں خدا کی خدائی مجھی پر غضب ڈھاتی ہے۔ خدائی مسکرائی مغرب کے تحت الثرے میں جنبش ہوئی۔ کوہ اتینا غیظ و غضب کے دود و آتش سے لرزہ براندام ہو گیا۔ سیال آتش نے مہذب قوم کی آبادی کو تہ و بالا کر دیا گاؤں کے گاؤں آب و خاکِ گرم کے نیچے دب کر رہ گئے۔ کسانوں نے حضرتِ مریم کے بُت کے آگے سر جھکایا اور بہتیرا گڑگڑائے مگر خدائے قہار نے ایک نہ سُنی بلکہ جو کرنا تھا کیا۔ متمدن دُنیا سہم گئی کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔

قدرت نے کہا اسی پر بس نہیں تم نے سمندروں میں بھی ایک طوفان اُٹھا رکھا ہے ذرا سنبھل سنبھل کر چلا کرو۔ بحرِ ہند میں ایک دُخانی جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور دو کشتیاں تین ہفتے تک خدا کے لُطف و رحم کی تلاش میں روز و شب سرگرداں رہیں۔ کمپاس بیکار کھانے پینے کی چیزیں کم بدن میں طاقت مفقود! بارش ہو تو ہاتھ پھیلا پھیلا کر پانی پئیں۔ صبح و شام اُمید کی کرنیں چمکیں اور چھپ جائیں۔ کسی گئے گذرے زمانے کی کہانی معلوم ہوتی ہے یہ نہیں محسوس ہوتا کہ بے تار برقی اور ایثر کی قوت کے زمانے کا اک واقعہ ہے۔ قدرت کبھی سرکشی پسند نہیں کرتی اپنے بچوں کو کھیلنے کودنے تو دیتی ہے لیکن جہاں کسی نے ذرا لغزش کی اُسے قانون کا تازیانہ لگا۔ اے انسان! بھول نہ جا کہ تو گوشت پوست سے بنا ہے چار عنصر نہیں بیسیوں عناصر تیرے گرد و پیش تیری آسائش و مسرت کے لئے موجود ہیں۔ تو عریاں تھا۔ گھاس پات سے کھال بال سے تو نے اپنا جسم ڈھکا کھانے کی نعمتوں کو ڈھونڈا اور انواع و اقسام کی لذتیں حاصل کیں۔ پھر رہنے سہنے کو مٹی پتھر اور لکڑی شیشے کے مکان بنائے۔ زمانہ اور فضا کو مختصر کیا۔ اور قوت کے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اب یہ نہ سمجھ لے کہ تو نے بہت کچھ پالیا۔ ابتدا کو انتہا نہ سمجھ اپنے آپ کو جان اور خدا کی خدائی کو پہچان!

ط ب

# نسوانی دُنیا

یہ مسئلہ مُدت سے زیرِ بحث رہا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا صحیح طریق کونسا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم اُنہی اصول پر ہونی چاہیئے جن پر لڑکوں کو تعلیم دیجاتی ہے۔ ایک اور فرقہ ہے جو کہتا ہے کہ چونکہ مردوں اور عورتوں کا دائرۂ عمل زندگی میں بالکل مختلف ہوتا ہے اس لئے اُنکی تعلیم بھی بالکل مختلف اصول پر ہونی چاہیئے چنانچہ اس خیال کی بنا پر آجکل بعض مقامات میں لڑکیوں کیلئے ایسے سکول قائم کئے جارہے ہیں جن میں بجائے سائنس ریاضی اور دیگر علوم میں تعلیم دینے کے اُنکو گھر کی صفائی اور رکھ رکھاؤ۔ پکانے ریندنے اور کپڑے سینے کے متعلق سبق دئیے جاتے ہیں حال ہی میں کارن ہل میگزین میں سوئٹزرلینڈ کی ایک خاتون مس سیلر صاحبہ کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں اُنہوں نے وہاں کی نسوانی تعلیم کا ذکر کرتے ہُوئے لکھا ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں لڑکیوں کیلئے ایسے سکول کھولے جانیکی تجویز ہورہی ہے جن میں نصاب تعلیم کا پہلا رکن گھر گرہستی اور انتظام خانہ داری ہو۔ یہ نصاب اعلےٰ اور ادنیٰ سب طبقوں کی لڑکیوں کے لئے یکساں ہوگا۔ اور گھر کا عام کام کاج مثلاً آگ روشن کرنا۔ جھاڑو دینا۔ کپڑے دھونا۔ برتن صاف کرنا وغیرہ وغیرہ جنکا کرنا امیروں کیلئے عموماً کسرِ شان خیال کیا جاتا ہے سب کو یکساں طور پر سکھایا جائیگا۔ اس نئی تجویز کے مطابق ہر لڑکی کو بیس سال کی عمر سے پہلے کم از کم ایکسال اس قسم کے سکول میں گزارنا پڑیگا۔ جہاں ان خاص فنون کی تعلیم ہو اسکے علاوہ وہاں دوسرے سکول بھی ہیں جہاں لکھنے پڑھنے کی ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے۔

ان خاص سکولوں میں جو مدارسِ خانہ داری کہلائینگے مفصلہ ذیل مضامین سکھائے جائینگے۔ سلائی۔ کھانا پکانا گھر کی صفائی۔ کپڑے دھونے۔ استری کرنا۔ برتن صاف کرنا۔ رنگنا۔ جھاڑو دینا۔ پھٹے کپڑوں کی مرمت۔ پیوند لگانا۔ رفو کرنا وغیرہ۔

اگر کسی لڑکی کے والدین بہت غریب ہوں اور اُسے سکول بھیجنے کے کفیل نہ ہو سکیں تو اُس لڑکی کیلئے سکول ہی میں رہایش اور خوراک کا انتظام ہوگا اور بجائے فیس کے اُس سے گھر کا زائد کام لیا جائیگا نصابِ تعلیم ختم ہونیکے بعد ہر ایک لڑکی سے باری باری کھانے پکانے کپڑے سینے اور صفائی کا کام بطور امتحان کے کرایا جائیگا ان عام کاموں کے علاوہ جو طلباء خاص کھانوں کی ترکیبیں اور مٹھائیاں وغیرہ بنانی یا خاص قسم کے لباس تیار کرنیکے طریقے سیکھنے چاہیں اُنکے لئے علیحدہ جماعتیں ہونگی اور وہ علیحدہ سکھائے جائینگے۔ مس سیلر صاحبہ لکھتی ہیں کہ یورپ میں جو آجکل نوکروں کی قلت کیوجہ سے گھر کے کام کاج میں بہت دقت پیش آرہی ہے اُس دقت کا حل بھی اسی میں ہے کہ انتظام خانہ داری کو لڑکیوں کی تعلیم کا ایک لازمی جزو قرار دیا جائے اور ہر لڑکی کو خواہ وہ امیر ہو یا غریب گھر کا ادنیٰ سے ادنےٰ کام سکھایا جائے سوئٹزرلینڈ سب سے پہلا ملک ہے جس نے اس خاص ضرورت کو محسوس کرکے اس معاملے میں پیشقدمی کی ہے دیکھئے دنیا کے باقی ممالک کب اس مثال کی پیروی کرتے ہیں۔

محمد رفیع بیگم

# ہُمایُوں

جلد ۴　　　　نمبر ۲

اگست سنہ ۱۹۲۳ء


# قِسمت

قسمت، اضداد کے اجزاء کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس کو قسامِ ازل نے کُن کے اولین عہد میں مرتب کیا، اور اپنی پُر مصلحت بخشش کی تقسیم عام میں سے، خندۂ مسرت و گریۂ الم کے اضافہ کے ساتھ، کہ اس سے کچھ اور مشکل بھی نہ تھا ——— ، انسان پر ارزانی فرمایا!

بُلبل، نالے کی عطا، پر غمگین تھا اور پروانہ، تپشِ مقدر پر ملول، کہ یہ ابن آدم، ودیعتِ غم، کی امانت دارانہ زیست پر رضامند ہوگیا ——— پھر اب انسان ہے۔ اور اُس کی دُنیائے تمنا، جس میں ہر گھڑی اور ہر آن ایک نت نئے ولولے کی پیدائش ہوتی ہے اور ایک انوکھی آرزو، کی تخلیق ——— مگر نہ کوئی ایسا ولولہ ہے، جس کے مقدر میں کامرانی لکھی ہو اور نہ ایسی کوئی آرزو، جس کے نصیب میں مایوسی نہ ہو ——— !!

بیکس انسان، جو امیدوں اور آرزوؤں کی کہانی ہے اور حسرتوں اور مایوسیوں کا خلاصہ، وہ نہیں جانتا کہ اُسکی آفرینش ہی اس تماشہ پر مشتمل ہے کہ وہ اپنی آدھی عمر آرزوؤں کی پُرمسرت پرورش میں گذارے اور آدھی عمر مایوسیوں کے نامراد رنج میں!

اس طلسم آباد، دُنیا میں، انسان بھی قدرت کی کیا کرشمہ ساز تعمیر ہے!!

کچھ خاک آرزو، کی تھی، اور کچھ خاکستر نامرادی کی، دونوں کی آمیزش حکمت و ترکیب خمیر سے ایک پتلا بنا۔ اور اُس کا انسان نام رکھکر اس ہنگامہ زار زمین پر پھینکدیا گیا۔ اب

وہ ہے کہ کبھی اُمید کے دلکش مناظر سے خوش ہوتا ہے۔ کبھی ناامیدی کے خوفناک سناٹوں سے بے حال۔ کبھی ولولوں کی جان پرور شادابیوں سے شگفتہ شادمان نظر آتا ہے، کبھی نامرادیوں کے روح فرسا اضمحلال و پژمردگی سے حواس باختہ۔ کبھی روتا ہے، کبھی ہنستا ہے۔ کبھی یکسر رقص مسرت و کامرانی ہے، کبھی سراپا موجِ الم و گریہ۔ اُس کا اک ہاتھ سامان شادی فراہم کرتا ہے، اور دوسرا ہاتھ، مشقِ سینہ کوبی میں مصروف۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا!

برمکی خاندان کے کسی فرد نے صحرا، میں ایک اعرابی کو دیکھا تھا کہ میدان میں پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کر رہا ہے اور جب انبار کر لیتا ہے، تو پھر ایک اک اُٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا، اُدھر ہی پھینکنا شروع کر دیتا ہے ——— کیا انسانی حیات آرزو، و نامرادی کی یہ پوری تاریخ اور اولادِ آدم کے اعمال و وظائف کی یہ مکمل رُوداد نہیں؟

ہماری زندگیاں، جن کے ہنگامہ عمل سے عالم کے ہر ذرہ میں طوفانِ حیات اور شورشِ زیست برپا ہے، غور کیجئے گا تو وہ اُمید کے سراب اور نامرادی کے طلسم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔!

انسان کی ساری عمر، نوعیتِ کار کے دو ہی حصّوں پر منقسم ہے یا وہ آرزؤں اور اُمیدوں کی جولانگاہ بنا رہتا ہے یا نامرادیوں اور تلخ کامیوں کا جہانِ حسرت؛ یا وہ صحرائے دجلہ کے اعرابی کی مثال، تمنا کے سنگریزے جمع کرتا ہے یا پھر اُسی کی مانند شدۂ نامرادی میں جدھر سے لایا تھا، اُدھر ہی پھینک دینے پر مجبور؛

مثال یہ میری کوشش کی ہے، کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے!

دُنیا نام، کارگاہِ عمل فیروزمندوں کے لئے بساطِ عشرت ہے اور نامرادوں کے لئے زاویۂ حسرت۔ ایک پُراُمید دل عالم کے ذرہ، ذرہ میں آثارِ حیات دیکھتا ہے، اُس کے واسطے کائنات کے ہر حصّے میں سے فراغت و مسرت سمٹی چلی آتی ہے ——— مگر ایک نامرادُ

ان کور باطن پیروں فقیروں اور سادھو جوگیوں کا سب سے بڑا حربہ چرب زبانی اور لالچ ہے۔ آئے دن اس قسم کے واقعات سننے میں آتے ہیں کہ فلاں جگہ ان مذہبی ڈاکوؤں نے پیتل کو چاندی اور چاندی کو سونا بنا دینے کا لالچ دیکر غریب بیواؤں اور فاتر العقل لوگوں کو لوٹ لیا ہے۔ لیکن اسی پر بس نہیں مغربی بدمعاشوں کی تتبع میں یہاں بھی لوگوں کو لوٹنے کے لئے لاکھوں روپوں کا جال بچھایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان صاحبِ جائداد اور متمول راہزنوں کی مالی و اخلاقی حالت کیا ہوگی جو اعلےٰ تعلیمیافتہ اور سرد و گرم چشیدہ لوگوں پر ڈورے ڈالنے سے بھی نہیں چوکتے اور حرص و طمع کا دانہ ڈال کر انہیں بھی دامِ تزویر میں پھنسا لیتے ہیں۔ ذیل کے چند ایک واقعات مشتے نمونہ از خروارے قارئین کرام کے تفننِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں +

۱۸۸۷ء کا ذکر ہے کہ کھدک بمبئی میں ایک ملاّ مسمی مول جی طیب جی رہتا تھا۔ جو حریص و طامع ہونیکے باعث اپنے حلقۂ اثر میں ہر دلعزیز نہ تھا۔ نواحی مواضعات و قصبات کے لوگ طیب جی کے مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے اُس کی خدمت میں عموماً حاضر ہوتے رہتے تھے اور اپنی نیاز کیشی اور عقیدتمندی کے اظہار میں اُسکے لئے بہت کچھ روپیہ پیسہ چھوڑ جاتے۔ لیکن بجائے اُس روپیہ سے مفلس و قلاش آدمیوں کی مدد کرنیکے حریص مُلاّ اُسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اس پر طرہ یہ کہ خود اُسکی بیوی محلہ کی بیبیوں سے پھٹے پُرانے کپڑے پہننے کے لئے مانگ لاتی تھی جس سے پوشاک و ملبوسات یا یوں کہئیے کہ تن ڈھانکنے کا خرچ بھی جاتا رہا۔ روپے کی اس ریل پیل اور جبلی خساست نے تھوڑے ہی عرصہ میں اُسے صاحبِ جائداد بنا دیا۔ چنانچہ بیس ہزار نقد۔ تین مکانات اور بہت سے قیمتی جواہر اور بیش قیمت اشیاء بلا شرکتِ غیری اُس کی ملکیت تھیں۔ اس مال و دولت سے کسی قسم کی زکوٰۃ نکالنا تو کجا اُس نے کبھی بھولے سے پھوٹی کوڑی تک بھی کسی حاجتمند کو نہ دی۔ حد سے زیادہ کفایت شعارانہ زندگی بسر کرنیکی خاطر وہ نزدیک کے ایک ادنےٰ ہوٹل میں نہایت معمولی کم خرچ خوراک کھا کر

؎ اورینٹل کرائم۔ ایچ۔ ایل آدم مولف "دی سٹوری آف کرائم" صفحہ ۱۷۹

پیٹ بھر لیتا تھا۔ ہوٹل کی روزانہ آمدورفت نے دیگر مستقل گاہکوں سے بھی اُسکا رابطۂ اتحاد پیدا کر دیا اور ہم قوموں کی یہ غیر مترقبہ شناسائیاں اُسکے حق میں رحمتِ ایزدی ثابت ہُوئیں۔ کیونکہ ہم مذہب ہونے کے باعث لوگ عموماً اُس بوالہوس مُلّا کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیتے تھے اور یہی تھی اصلی تعظیم و تکریم جسکا وہ خواہاں تھا اور یہی تھی قلبی قدر و منزلت جو اُسکے دل میں انبساط و شادمانی کے انبار لگا دیتی تھی۔ سوئے اتفاق سے ایک دن دو منشیوں نے جو آپس میں بھائی بھائی تھے اور اکٹھے ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے طیب جی کو معمر و مذہبی بزرگ سمجھ کر اپنے ساتھ ایک شب کھانے میں شریک کر لیا اور حسبِ معمول یہ طفیلی بھی بلاحیل و حجت آستین چڑھا اُنکے ساتھ اکل و شرب میں مشغول ہو گیا۔ یہ دونوں بھائی نہایت عمدہ قماش کے آدمی تھے۔ شیریں گفتار۔ خوش لباس با مذاق اور حد سے زیادہ خلیق و مہربان۔ غرضیکہ چند ہی روز میں طیب جی اور منشی برادران میں خوب گاڑھی چھننے لگی اور ہر روز خلافِ معمول پُر تکلف دعوتیں بھی اُڑنے لگیں مگر سب منشیوں کے خرچ پر۔ جنکی فیاضانہ طبائع نے جنابِ مُلّا کو ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدہ احسان بنا لیا اور اُس کا کنجوس دل ہر وقت ایسے دوست پرور مہربانوں کی شرافت و عالی نسبی پر نازاں رہتا تھا۔

یہ تینوں دوست عموماً مختلف فیہ مسائل پر گفتگو کرتے رہتے تھے لیکن منشی بھائی زیادہ تر عجیب و غریب اور مافوق الادراک باتوں کا تذکرہ کر کے طیب جی کو ہر وقت محوِ حیرت بنائے رکھتے۔ ان باتوں میں اس قدر چاشنی اور حلاوت تھی کہ سادہ لوح مُلّا اُنہیں سُن سُن کر کبھی سیر نہ ہوتا اور ہر دفعہ کسی نئی اور ایسی ہی نشاط انگیز کہانی کی فرمایش کرتا۔ ایک دن بسبیلِ تذکرہ اُنھوں نے مائی حجن کے مقبرہ کا ذکر کیا جو اور لی میں ایک خوش نما پہاڑی پر واقع تھا جس کی خوبصورتی اور فیض عام کے متعلق مختلف روایات خواص و عوام میں مشہور تھیں۔ علاوہ ازیں دونوں بھائیوں نے مُلّا کو یہ بھی یقین دلایا کہ اگر وہ اُنکے ہمراہ چلیگا تو اُس روز وہ اُسے ایک نہایت شاندار اور پُر تکلف دعوت میں شریک کرینگے یہ سنتے ہی طیب جی کی مُردہ رگوں میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی اور دعوت فردا

کے بہجت خیز خوابوں سے اُس کا دماغ لبریز ہونے لگا۔ اُس نے دونوں بھائیوں کے عواطفِ کریمانہ کا شکریہ ادا کیا اور دوسرے دن ایک خاص مقام اور مقررہ وقت پر ملنے کا وعدہ کرکے تینوں دوست اپنے اپنے گھروں کو چلدیئے۔

دوسرے روز جب وہ متذکرہ بالا پہاڑی پر پہنچے اُس وقت آفتاب نہایت سرعت سے پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہوتا چلا جارہا تھا اور اُس کی سنہری کرنیں درختوں کی بالائی ٹہنیوں سے گلے مل مل کر رخصت ہورہی تھیں۔ ساحلِ بحر سے آنیوالی مرطوب و نمدار ہوائیں بلند قامت دیودار کے خودرو درختوں کے گھنے پتوں سے گزر کر ایک سامعہ نواز ترنم پیدا کررہی تھیں اور یہ تینوں دوست خوش گپیوں میں مصروف تیز گامی سے اُس مقدس پہاڑی پر چڑھ رہے تھے جسے قدرتی گھاس اور رنگ برنگ کے خودرو پھولوں نے رشکِ گلزار ارم بنا رکھا تھا۔ بالاخر وہ مقبرہ کے قریب پہنچے جہاں ایک معمر سفید ریش بزرگ سجدہ میں پڑا تھا۔ طیب جی نے سرگوشی کی آواز میں اپنے ہمراہیوں سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں۔ میں نے انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟"

مُلا کی یہ غیر متوقع بات سُن کر دونوں بھائیوں کے حیرت واستعجاب سے منہ کھل گئے اُنھوں نے ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے کے چہرہ کی طرف دیکھا پھر آہستہ آواز میں کہنے لگا "تعجب ہے کہ آپ انہیں نہیں جانتے۔ یہ تو بڑے مشہور باکرامت بزرگ ہیں نام تو ہمیں بھی معلوم نہیں مگر ان کی کرامت کا ادنےٰ نمونہ یہ ہے کہ مٹی کو سونا بنادیتے ہیں"

طیب جی کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوگئی پھر ایک گہرا سانس لیکر بولا "زہے قسمت جو ایسے خدا رسیدہ بزرگ کی زیارت نصیب ہوجائے اور پھر ایسے ولی اللہ کی جو خاک کو اکسیر بنادیں کیا آپکو معلوم ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں اور آجکل اُنکی جائے قیام کہاں ہے؟"

دونوں بھائیوں نے اس امر کے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا، اتنے میں وہ سفید ریش حضرت بھی سجدہ سے سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے پھر تینوں نوواردوں کو اپنے نزدیک بلاکر نہایت شفقت وتلطف آمیز آواز میں گفتگو فرمائی لیکن اُنکا روئے سخن زیادہ تر

مُلّا طیب جی کی طرف ہی تھا جسے باتوں باتوں میں اُنھوں نے یہ بھی بتادیا کہ بحکم ربی وہ اُسے ایک راز بتانا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے پاس ہی دھرے ہُوئے حقہ کی طرف توجہ فرمائی اور جیب سے ایک قسم کا سفوف نکال کر کہا "یہ اکسیر کے پتّوں کا سفوف ہے جس سے تانبا سونا بن جاتا ہے۔ کیا آپکے پاس کوئی تانبے کا سکہ ہے؟"

یہ سنتے ہی حضرت مُلّا کی تعجب واستعجاب سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہُوئے اپنی جیب سے ایک پیسہ نکال کر سفید ریش بزرگ کی ہتھیلی پر رکھدیا جنھوں نے اُسے چلم میں ڈال کر سفوفِ اکسیر سے ڈھک دیا پھر چند ایک دہکتے ہُوئے کوئیلے رکھدیئے اور دو تین کش لگانے کے بعد چلم الٹ دی لیجئے بجائے پیسہ کے اُس میں سے سونے کی ایک مُہر نکل آئی۔ طیب جی کا تو اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دل تھا کہ بلیّوں اُچھل رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ایک ایک کا منہ تک رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ خدائے لم یزل کے ایسے برگزیدہ اور باکرامت بزرگ ابھی تک اس دنیا میں موجود ہیں جو ان کسب وکمال کے مالک ہیں۔ علاوہ ازیں اُسکا دل اس بات سے مطمئن وشاداں تھا کہ جلد یا بدیر یہ راز بحکم خداوند قدوس مجھ پر واکر دیا جائیگا اور میں مستقبل قریب میں دُنیا کا امیر ترین انسان بن جاؤنگا۔ وہ ابھی انہیں خیالات میں غلطاں وپیچاں تھا کہ پیر صاحب نے اُسے مخاطب کرتے ہُوئے ارشاد فرمایا "یہ سونے کی مُہر آپ کی ملکیت ہے اسے لیجائیے اور پھر کسی روز یہاں تشریف لائیے تو تانبے اور پیتل سے سونا بنانیکا راز آپکو بتلادیا جائیگا" اتنا کہتے ہی وہ حضرت تو مقبرے کے دوسری طرف چلدیئے اور یہ تینوں دوست حیران و سراسیمہ آہستہ آہستہ پہاڑی سے اُترنے لگے مگر مُلّا حد سے زیادہ مسرور وشاداں تھا۔

حسبِ وعدہ منشیوں نے ایک پُر تکلف دعوت میں بھی اُسے شریک کیا اور دن بھر کے واقعات سے پُر اُمید طیب جی دونوں دوستوں کو اگلے دن ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ رات بھر مال و دولت اور جاہ وحشمت کے خوابوں سے اُس کا دماغ پریشان ہوگیا، بار بار اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کہتا "کیا میں نے خود

اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ نہیں دیکھا جو اس پر یقین نہ لاؤں اور پھر اُس حالت میں جبکہ اُس زندہ معجزہ کا نتیجہ یعنی وہ سونے کی مہر بھی میری جیب میں موجود ہے" غرضیکہ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور یہ پھٹی پُرانی اچکن پہن اپنے اس یقین کو وہم و بدگمانی کی آمیزش و آلایش سے پاک کرنے کے لئے ایک سُنار کے ہاں پہنچا اور اُسے وہ مہر دکھلا کر پُوچھنے لگا کہ آیا یہ سکہ کھوٹا ہے یا کھرا۔ جب اُس سُنار نے بھی یقین دلا دیا کہ وہ مہر پندرہ روپے مالیت کی ہے اور وہ اُسکے عوض اُسی وقت پندرہ روپے دے سکتا ہے تو اُسکے دل میں شادمانی و کامرانی کا سمندر متلاطم ہو گیا اور ہر چہار طرف سے "دولت۔ دولت" کی صدائیں اُس کے کانوں میں آنے لگیں۔ اِن موہوم خوابہائے پریشاں نے آنِ واحد میں اُس کی چال ڈھال بلکہ اُس کا طرزِ تکلم تک تبدیل کر دیا، وہ اپنے آپکو ایک خود مختار شہنشاہ کی مانند تصور کرنے لگا جو مٹی کو ہاتھ لگانے سے سونا بنا سکتا ہو اور جس کے جلو میں بمبئی جیسے ذخار شہر کے تمام راہرو ہوں اور اُسے عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر اُسکے سامنے سرِ نیاز خم کریں۔ اُس کی رفتار میں تمکنت تھی اور نگاہوں میں غرور آواز میں رعونت تھی اور سر پر تکبر کا جن سوار ہو رہا تھا۔ اپنے انہیں خیالات میں منہمک وہ قہوہ خانہ پہنچا جہاں منشی بھائی پہلے سے اُسکا انتظار کر رہے تھے۔ رسمی آداب و سلام کے بعد طیب جی نے اُنہیں فوراً ورلی کی مقدس پہاڑی پر چلنے کے لئے کہا مگر اُس کی حیرانی کو دوبالا کرنے کے لئے ایک بھائی نے جواب دیا "نہیں۔ آج ہم لوگ نہیں جا سکتے۔ آج جمعہ کا دن ہے اور عبادت کا دن، وہ بزرگ ہمیں جمعہ کے روز کبھی نہیں مل سکتے۔ مجھے معلوم ہے"

طیب جی کا وہ بڑھا ہُوا حوصلہ وہ جوش پر آئی ہوئی طبیعت فوراً سرد ہو گئی کیونکہ تمام جہان کے پیتل کو سونا بنا لینے کا منتر اب اُسے سینکڑوں کوس پرے معلوم ہونے لگا۔ ایک دن کا وقفہ اُس کے نزدیک سینکڑوں برس کا فاصلہ تھا وہ تمام سونے چاندی کے محلات اور زر و جواہر کے انبار جو شش جہت اُسے دکھائی دے رہے تھے اب خس و خاشاک کے جھونپڑے اور راکھ کا ڈھیر معلوم ہونے لگے

شہنشاہیت کا بھوت فوراً سر سے اُتر گیا اور وہ نخوت و تکبر کی رفتار و گفتار پھر ملّا طیب جی کی اپنی چال پر آگئی، مگر نہیں دولت کا نشہ ایسی ترشیوں سے نہیں اُترتا تقویت قلب نے پھر ڈھارس بندھا دی کہ آج نہیں کل سہی۔ خورشید اُمید کی ضیا پاشیاں ابھی تک ظلمت یاس کی کالی گھٹاؤں میں مستور نہیں ہوئی تھیں۔ بالاخر انتظار کا دن گذر گیا مگر پہاڑ بن کر۔ چنانچہ دوسرے روز یہ اصحاب ثلاثہ پھر اپنے مقدس مشن پر روانہ ہوگئے۔ منشی برادران پیر جی کی نذر کے لئے مٹھائی اور پھول لے گئے۔ وہ ولی اللہ حسب معمول سجدہ میں پڑے تھے اور تینوں دوستوں کو چند منٹ تک انتظار کرنا پڑا آخر کار اُنھوں نے سلام پھیر کر تینوں کو اپنے نزدیک بُلا لیا پھر طیب جی کی طرف مخاطب ہوکر فرمانے لگے "مجھے بشارتِ ربانی سے یہ حکم ہوا ہے کہ آپکو آئندہ جمعرات یہ سب راز بتلا دیا جائے کیونکہ اس کام کے لئے وہ دن نہایت سعید و بابرکت ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی پیسہ ہو تو مجھے دیجئے تاکہ میں اُسکو پھر سونے میں تبدیل کردوں"۔ اس دفعہ طیب جی ایک چھوڑ کئی درجن پیسے لایا ہوا تھا اُس نے جھٹ ایک نکال پیر جی کے حوالہ کیا جنھوں نے بطریق سابق فوراً اُسے سونے کی چمکتی ہوئی مہر میں تبدیل کر دیا +

انتظار کے یہ چار روز بھی چار سال بن کر گزر گئے۔ طیب جی پھر اُن بزرگ کی خدمتِ اقدس میں اپنی اُسی خواہش کو لئے ہوئے حاضر ہوا مگر ابکی دفعہ اُنھوں نے یہ دلشکن خبر سُنائی کہ اکسیر کا سفوف ختم ہوگیا تھا جس کے بغیر پیتل وغیرہ کا سونا بن جانا ناممکنات سے ہے اور یہ کہ اب ہمیں اُس موسم کا انتظار کرنا پڑیگا جبکہ بارش سے لدی ہوئی شمال مغربی ہوائیں کالی گھٹائیں بن کر اور گھر گھر کر آتی ہیں کیونکہ اکسیر کے پودے اُنہیں دنوں پھل لاتے ہیں۔ اور مُلّا کی دلجمعی کی خاطر یہ بھی فرمایا کہ تمہارے اس وہم و بدگمانی کو دور کرنے کے لئے کہ میں یہاں سے کہیں چلا نہ جاؤں میں تمہارے ہی گھر بود و باش اختیار کرتا ہوں جہاں ہم اُن معاملات پر اظہار رائے کرینگے جنکی بدولت تمہیں آئندہ وقت میں صاحبِ شوکت و سطوت بن کر اپنی عظمت و امارت کا ڈنکا بجانا ہے" +

بوالہوس مُلّا کے بدن سے یہ سُنتے ہی سن سے ایک تیر سا نکل گیا مگر امر مجبوری، کیا کرسکتا تھا۔ چارو ناچار پیرمرد کو گھر لے آیا بلکہ یہاں تک فیاضانہ سلوک پر اُتر آیا۔ کہ دونوں منشی بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ رہنے پر راضی کر لیا اور دن رات خوب مزیدار لذیذ اور پُرتکلف کھانے پکنے لگے، مگر اب سب مُلّا کے خرچ پر اور وہ بھی اس خیال سے جی کھول کر خرچ کرتا تھا کہ چند دنوں تک ساون کی کالی گھٹائیں دُنیا کے مخفی و پوشیدہ خزانے اپنے ساتھ لانے کو ہیں اور اس پیرمرد کی وساطت سے اُسکے قدموں میں تمام جہان کے سونے چاندی اور زر و جواہر کے انبار لگنے والے ہیں۔ ایک دن پیرجی نہایت متانت و اطمینان سے مُلّا طیب جی کے دروازہ میں بیٹھے حقہ کے کش لگا کر دھوئیں کے بادل اُڑا رہے تھے کہ ایک مفلوک الحال حاجتمند اُنکی خدمت میں حاضر ہوا یہ کیسے اُس کی مُشکلکشائی نہ کرتے خدا نے اسی لئے تو انہیں دنیا میں بھیجا تھا مگر انہوں نے فرمایا" افسوس میرے پاس اب اتنی کافی اکسیر نہیں رہی جو میں اس کی حاجت روائی کرسکوں" پھر مُلّا طیب جی کی طرف مخاطب ہوکر کہا" بھائی اسے دوہزار نقد دلوا دے تیرے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ وقتِ آئندہ میں تو دنیا کا امیر ترین آدمی بننے والا ہے۔ خدا اس کے عوض تمہیں بے شمار و بیحساب دیگا" طیب جی نے بھی اس خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ دوہزار روپیہ آنے والی دولت کے مقابل ہیچ تر ہے کچھ پروا نہ کی اور دل کڑا کرکے رقم مطلوبہ پیرمرد کے قدموں میں لا ڈالی اور وہ قلاش دُنیادار پیر صاحب اور مُلّا طیب جی کو ہزاروں لاکھوں دعائیں دیتا چلا گیا۔ چند ہی دنوں بعد پیر صاحب نے سترہ سو روپے کی ایک اَور رقم کسی دُکھیاری بیوہ کو دلا دی۔ دینے کو تو یہ رقم بھی اُس نے دے ڈالی مگر دل پر کوہ ہمالہ رکھکر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اب اگر انکار کرتا ہوں تو آنحضرت بغیر وہ قیمتی راز بتائے خفا ہوکر چلدینگے اور دوہزار کی رقم جو پیشتر ادا کرچکا ہوں ضائع چلی جائیگی، مرتا کیا نہ کرتا پیرجی کا گھر پورا کیا مگر اسی پر بس نہ ہوئی تھی نہ ہونی اکسیر کا پودا تلاش کرنے سے پیشتر دوہزار کی ایک اَور رقم خیراتی کاموں میں پیر صاحب کی معرفت اُس کنجوس مُلّا سے وصول کی گئی ؏

بالآخر ساون کے دن آئے اور کالی گھٹائیں بھی جھوم جھوم کر آئیں۔ طیب جی کے لئے رعد کی ہر کڑک پیغام تھی دولت و ثروت کا اور بجلی کی ہر چمک نظارہ تھی اُس سیم و طلا کا جس کے انتظار میں اُس نے دن رات کی گھڑیاں اور گھڑیوں کے لمحے گن گن کر کاٹے تھے اور اسی دن کی موہوم اُمید پر جی کر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے اس صاحب کشف و کرامات کی نظر کئے تھے۔ چنانچہ بصد دقت بمبئی کے گرد و نواح کی پہاڑیوں پر اکسیر کے پودے کی تلاش کی گئی مگر وہاں کئی ایک وجوہات کے باعث اس قیمتی و نایاب شے پر قبضہ پانا مشکل بلکہ محال ہو گیا۔ مُلّا طیب جی کو ابھی تک اُن تمام حضرات کی مساعی جمیلہ پر یقین کامل تھا اور اس بات پر اُسے پورا بھروسہ تھا کہ کسی نہ کسی روز اُس عنقا چیز کے لئے ہماری جد و جہد اور تمام کوششیں بار ور ہونگی۔ علاقہ بمبئی سے نا اُمید ہو کر پیر صاحب نے کاٹھیاواڑ جانیکا تہیہ کر لیا اور مُلّا کو یقین دلایا کہ ایک پودا وہاں دستیاب ہو گا جو اکسیر سے بڑھ کر اثر دکھلانے والا اور پیتل تو کجا مٹی کو سونا بنا دیتا ہے اور جس کے حاصل کرنے کے لئے دنیا کی کوئی قوت و طاقت اُنکے مزاحم نہیں ہو سکتی۔ آخر کار مُلّا سے تقریباً پانچ ہزار روپیہ نقد فقیر فقرا کو خیرات کرانے کے بعد وہ پودا تلاش کر لیا گیا، اب طیب جی کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ یکلخت مشیت ایزدی نے اُسے غربا کے زمرہ سے اُٹھا کر عالی مراتب اُمرا کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اُس کا دماغ اب فلک الافلاک پر تھا اور اُس کی رعونت مطلق العنان شہر یاروں کے تکبر کو گرد راہ سمجھنے لگی۔ مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا کیونکہ پیر جی کے قول مبارک کے بموجب سونا بنانے کے لئے دمشق کے تانبے کی ضرورت تھی۔ اب جناب مُلّا نے اور بمبئی کے بازار ایک سرے سے دوسرے سرے تک، شمال سے جنوب اور جنوب سے مغرب تک بمبئی کا ہر کونہ چھان مارا مگر سبھی سوداگر دمشق کے تانبے کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ دونوں منشی بھائی بھی مُلّا کے ہمراہ تھے اور آخر کار اُنہیں کی مہربانی سے ایک ایسی دوکان تلاش کر لی گئی جہاں دمشق کا تانبا مل سکتا تھا۔ مالک دکان نے اُنکی درخواست خریداری پر حیران ہو کر کہا، "آپکو معلوم بھی ہے کہ دمشق کا تانبا کیا بھاؤ بکتا ہے"

مُلّا نے بیبا کی سے جواب دیا "جو بھی کچھ ہو ہم دینے کو تیار ہیں کیونکہ یہ چیز ہمارے ایک دوست کو درکار ہے،" چابکدست دکاندار نے کہا "یہ تانبا پچاس سال سے میرے خاندان کے پاس چلا آتا ہے اور آپکو سونے کے بھاؤ ملیگا اس لئے کہ اس سے سونا بنایا جاتا ہے، کہیئے اگر خریداری منظور ہو تو نکالوں"۔

مُلّا طیب جی فوراً اُسکے لینے پر راضی ہو گیا اور چار سو تولہ تانبا سونے کے بھاؤ خریدا گیا اور پیر صاحب کی خدمت میں حاضر کیا گیا جنہوں نے فرمایا کہ اب سَو تولہ خالص سونا بہم پہنچاؤ تو کام بنے۔ حریص و طامع طیب جی نے فوراً ایک گھر اونے پونے داموں پر فروخت کر کے سو تولہ خالص سونا خریدا۔ چنانچہ چند یوم کے بعد ان تمام اشیاء کو اکٹھا کر کے جن کو سونا بنانا مطلوب تھا پیر جی ایک بند کمرہ میں داخل ہُوئے جہاں ناریل کے تیل کا ایک چراغ طاق پر رکھا جھلمل جھلمل کر رہا تھا اور اُن تمام اشیا کو ایک بڑے کڑاہے میں ڈال کر نیچے آگ سُلگا دی پھر منشیوں اور طیب جی کو اندر بلا کر کہا "سب کچھ تیار ہے اور عنقریب یہ تمام چیزیں جو وزن میں بلاشبہ دو من کے قریب ہونگی نہایت عمدہ اور خالص سونا بن جائینگی مگر شرط یہ ہے کہ ایک آنچ آنے کے بعد ہم چاروں اشخاص باری باری اسکو کم از کم چار چار گھنٹہ تک ہلاتے رہیں کیونکہ جہاں یہ چکر ساقط ہُوا بس سبھی بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا۔ سب سے پہلے میں خود اس اہم کام کو شروع کرتا ہوں اور آپ صاحبوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مہربانی کر کے یہاں سے ہٹ جائیں تاکہ میں اپنے کام میں مشغول ہو جاؤں"۔

یہ سنتے ہی تینوں دوست باہر نکل آئے اور وہ سفید ریش بزرگ اکیلے کمرہ کے اندر رہ گئے۔ پھر باری باری ہر آدمی کڑاہے میں پڑی ہُوئی چیزوں کو ہلاتا رہا۔ آخر طیب جی کی باری آئی اور وہ بھی لوہے کا کفگیر ہاتھ میں لیکر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اُس وقت آٹھ بجے تھے اور مُلّا کو بارہ بجے رات تک کام کرنا تھا۔ اول اول تو اپنے شوق سے نہایت زور سے اور جلدی جلدی ہلاتا رہا مگر تا بجا آدھ ہی گھنٹے میں ہاتھ شل ہو گئے۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ ہلانیکا ارادہ کر لیا، جب ایک ہاتھ تھک جاتا تو دوسرا کام میں لاتا مگر پہلے گھنٹے کے اختتام پر ہی دونوں بازو

سخت درد کرنے لگے لیکن اگلے ہی روز بمبئی کا سب سے متمول آدمی بن جانیکی اُمید پر وہ نہایت ہمت و استقلال سے ہاتھ مارتا رہا۔ جب گھڑیال نے دس بجائے اُسوقت اُسکی ہمت جواب دے رہی تھی مگر پھر بھی ایک خواہش تھی جو کام کرنے پر اُبھارتی تھی، ایک اُمنگ تھی جو دل سے نکلتی تھی اور بجلی کی طرح تمام بدن میں سرایت کرجاتی تھی جب گیارہ بجے اُسوقت اُسکی حالت بالکل غیر تھی مگر اس بات سے اُسے تسلی تھی کہ اب صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا اور وہ عنقریب دو من سونا یا قریباً دو لاکھ روپے کا ایک ہی تجربہ میں مالک بن جانیوالا تھا۔ ایک ایک منٹ ایک ایک سال بنکر آہستہ آہستہ نہایت سست رفتاری سے گزرتا تھا، بار بار اُسکے جی میں آتا آخر آج کیا بات ہے کہ بارہ بجنے میں نہیں آتے ع

مرگئے آج ہی گھڑیال بجانیوالے۔ اسوقت اس کے جسم کا بند بند درد کر رہا تھا۔ سر تھا کہ لٹو کی طرح گھومے ہی جاتا تھا، آخرکار اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ لوہے کا کفگیر ابھی اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑیگا۔ وہ بالکل غشی کی حالت میں کام کر رہا تھا مگر باوجود تمام قواء کے بیکار ہوجانیکے ایک دُھندلی سی روشنی اُسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی جو پرے افق سے دُور سیاہ بادلوں میں چمک رہی تھی، بس وہی اُسکا منتہائے مقصود تھا۔

خدا خدا کرکے گھڑیال نے بارہ بجائے اور اُس نے تشکر و طمانیت کا ایک گہرا سانس لیا مگر وہ اپنے فرائض مفوضہ سے ذرا کوتاہی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اگر ذرا سی لغزش بھی ہوگئی تو تمام قوام بجائے سونے کے تانبے کا تانبا ہی رہ جائیگا۔ بارہ بجکر چند منٹ اوپر ہوگئے پھر بھی کوئی کمرہ میں داخل نہ ہُوا۔ اُسکا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ شاید میرے بعد آنیوالا منشی سو گیا ہو اسلئے اُس نے زور زور سے اُسکا نام لیکر پکارنا شروع کیا مگر صدائے برنخواست۔ اب ہر چہار طرف سے اُسے یاس و نااُمیدی اور بدبختی کے آثار دکھائی دینے لگے غصہ، تلملاہٹ، ندامت اور غیظ و غضب کے جوش سے تمام بدن کا خون اُسکے دماغ میں جمع ہونے لگا، منہ سے کف گرنے لگا، پسینہ سے تمام بدن شرابور ہو رہا تھا اور اُسکی صورت ایسی مکروہ اور بھیانک ہوگئی جیسے کسی سفاک اور بے ایمان آدمی کی اسوقت ہوجاتی ہے جب وہ دین و دنیا سے نااُمید ہوکر خودکشی پر آمادہ ہوجائے۔ اسی حالت میں اُسے معلوم ہُوا کہ اُسکی بدنصیب بیوی سر کے بال نوچ نوچ کر اُسکی اس حماقت اور ابلہ فریبی پر بلک بلک کر رو رہی ہے دوسرے لمحہ میں اُسے ایک چکر آیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور صبح ہونے تک وہیں بیہوش پڑا رہا[1]۔

---

[1] یہ مقدمہ بعدہٗ خان بہادر سردار میر عبدالعلی چیف آف بمبئے پولیس (ڈٹیکٹیو) کے سپرد ہُوا۔

مندرجہ بالا اقسام کے راہزنوں کے علاوہ ایک اور قسم کے مذہبی لٹیرے ہندوستان اور صرف ہندوستان ہی میں پائے جاتے ہیں اور جہانتک میرا خیال ہے دیگر ممالک اس قسم کی کوئی مثال بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں اسلئے کہ جسقدر جہالت و تاریکی نے یہاں ڈیرا جما یا ہے اور جس عقل و دانش حسن عقیدت اور راسخ الاعتقادی کے مالک ہندوستانی ہیں شاید روئے زمین کا کوئی خطہ اسکی ہمسری کا دعوے نہ کرسکے سر[1] ایڈمنڈ سی کاکس (انسپکٹر جنرل آف پولیس بمبئے) کا بیان ہے کہ سندھ میں اُنہوں نے ایک ایسے خدا دوست فقیر کو دیکھا جو گاؤں بہ گاؤں اور قریہ بہ قریہ پھر کر لڑکیوں کو لڑکے بنا دینے میں یدطولےٰ رکھتا اور اپنی اس کرامت کے صلے میں بیشمار روپے اکٹھے کرکے ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ کو چلدیتا کسی گاؤں میں پہنچنے سے پیشتر ہی اُسکی شہرت کے نقارے بج جاتے تھے کہ اردگرد کے کئی ایک مواضعات میں اُس سے فلاں فلاں کشف و کرامات کا ظہور ہُوا، لیکن ان افواہوں کی تصدیق نہ کسی کو کرنی تھی نہ کی۔ لڑکیوں کے والدین، جنکی دلی تمنا تھی کہ اُنکی لڑکیاں خواہ کسی خرچ پر اولادِ نرینہ میں تبدیل ہو جائیں نہایت خلوص قلب اور عقیدتمندی سے اُس بزرگ کو اپنے گھروں میں مدعو کرتے تھے اور اُسکی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے اور اپنی توفیق سے بڑھ کر روپیہ پیسہ سے اُسکی مدد کرتے۔ روپیہ حاصل کرنیکے بعد یہ خدا رسیدہ بزرگ یا تو کہیں رفوچکر ہو جاتے اور اگر لڑکیوں کے والدین اُنہیں آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تو وہ یہ بہانہ بناتے کہ اگرچہ اُنہیں ہر ایک جگہ کامیابی نصیب ہُوئی ہے مگر کسی اثرِ مخالف کی وجہ سے وہ اسوقت اپنا معجزہ دکھانے سے معذور ہیں اس لئے سب سے پہلے اُن خارجی اثرات پر فتح پانا لازمی و لابدی امر ہے۔ چنانچہ اُن اثرات پر فتح حاصل کرنیکے طریق وہ یہ بتاتے (۱) کسی خاص مزار پر جانا۔ (۲) غربا و مساکین میں خیرات تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اسکے بعد وہ نہایت تلطف و مروت سے دوبارہ کسی وقت آکر اپنے میزبان اور میزبانہ کو خوش کرنیکا وعدہ فرماتے۔ لیکن ان سب سے بڑھکر حیرت انگیز اور دلچسپ واقعہ وہ ہے جو میرے ایک اُستاد سید محمد طفیل صاحب مرحوم کو بنارس میں پیش آیا وھو ھذا۔　(باقی آئندہ)

محمد ضیاء الدین شمسی

---

[1] پولیس اینڈ کرائم اِن انڈیا۔ صفحہ ۳۰۸

# موسیٰ آفندی

جب ہم کرکوک سے بغداد کو روانہ ہوئے تو گرمی کا موسم تھا۔ کرکوک سے کفری تک چار سخت منزلیں ہیں۔ کرکوک سے طاوق۔ طاوق سے طوز فرماتلی۔ طوز فرماتلی سے تازہ فرماتلی۔ تازہ فرماتلی سے کفری۔ کفری سے البتہ بغداد تک اب ریل بن جانے سے بغداد پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا اور اگر مجھے اپنی بیوی کی زحمت کا خیال نہ ہوتا تو چار و ناچار میں بھی کارواں کے ذریعے کرکوک سے روانہ ہو جاتا مگر ایک تو عراق کی گرمی اور تپش اور پھر راستے بھر سوائے منزل کے کہیں سایہ درخت و آب کا نشان نہیں۔ پھر اگر رات کو سفر کیا جائے تو وہ موجودہ حالت میں خطرے سے خالی نہ تھا۔ ابھی تھوڑے ہی عرصہ کی بات ہے کہ بغداد سے چند جماعت یہودی سوداگروں کی بہال کردوں نے گھیر لی۔ انکا تمام مال و متاع لُٹ گیا اور صرف ایک شخص اس قصے کو بیان کرنیکے لئے بچ کر نکل سکا۔

ایسی صورت میں میری پریشانی ظاہر تھی۔ عربانہ کی تلاش میں دو روز سے میں نے کرکوک کو چھان ڈالا۔ مگر کوئی مناسب گاڑی ایسی نہ ملی جس کی نسبت یہ کافی اطمینان دلایا جا سکے کہ اس دور دراز راستے میں گاڑی یا گھوڑے میں سے کوئی راستہ ہی میں دم نہ توڑ دیگا۔ توکل کی بنا پر البتہ اس پیش بینی کی ضرورت نہ تھی اور چونکہ یہاں کی آبادی زیادہ تر متوکل ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ عربانہ چی اپنی خدمت اپنی شکستہ گھوڑے اور گاڑی کے ساتھ پیش کرنے میں تامل نہ کرتا تھا۔ کرایہ کا سوال کبھی میں نے اٹھایا نہیں کیونکہ سفر خرچ حکومت کے ذمے تھا اور عربانہ چی اسکا فیصلہ باب حکومت سے کر لیتا۔ لیکن جب کبھی میں اپنے اس خیال کو ظاہر کر دیتا تو عربانہ چی کا توکل "زانوے اشتر بہ بند" کے ساتھ مدغم ہو جاتا۔ غرض مجھے خان میں چار روز مکھیوں میں اور چار شب مچھروں میں لامحالہ بسر کرنی پڑیں۔ یا تو مکھیوں اور مچھروں کے مقابلے اور خان کی متعفن ہوا میں میرے جسم و دماغ کا اس عرصے تک محفوظ رہنا لوگوں

میں میرے استقلال و ہمت کا افسانہ بنایا میری بظاہر معطلی ور بیکاری سے لوگوں کو میرے مشاغل اور میرے ذریعۂ معاش سے سوء ظن ہُوا۔ کہ قرب و جوار کے قہوہ خانوں میں میری نسبت چرچے ہونے لگے۔ بہت سی دور اندیش کھوپریاں مجھے سمجھنے کے درپے ہوگئیں۔ اور مجھے اسکی خبر یوں ہُوئی کہ سب سے پہلے ایک یہودی نے آکر میری کوٹھڑی میں دبکتے دبکتے جھانکا اور جب میری طرف سے مدافعت کی کوئی اُمید نہ پائی تو اندر آکر میری قومیت۔ میرے مذہب میرے ارادے اور میرے کاموں پر جرح شروع کر دی۔ جب وہ کافی اطمینان کرکے چلا گیا تو فوراً ہی ایک دوسرا ڈیپوٹیشن پہنچا۔ جس میں دو نسطوری مرد اور تین نسطوری عورتیں شامل تھیں۔ اور انہوں نے اول بیان کی تصدیق چاہی، اسکے بعد دو پیر مرد ترکی بولنے والے تشریف لائے۔ اور انہوں نے سوالات کو پھر ایک نئے پیرائے میں دُھرایا۔ پھر چند کردی حمال آئے۔ اُسکے بعد ایک مفلس عرب اور اسکے بعد ایک ثریا کی ایرانی۔ جنہوں نے سوالات کے ضمن میں اس مسئلہ کی وضاحت سے میری معلومات بھی بڑھائیں کہ اولادِ رسُولؐ کو صدقہ جائز ہے اور اگر اسکا کوئی مستحق ہے تو عرب و عجم میں میرے مخاطب سے زیادہ کوئی حقدار نہیں۔ قریب چار بجے کے ایک سولہ سترہ برس کا لڑکا آیا۔ شاید میری نظر نے اسکی عمر سمجھنے میں غلطی کی ہو اس واسطے کہ اسکی باتیں ستر برس کے بوڑھے کی طرح سنجیدہ تھیں۔ منہ پر اگرچہ ڈاڑھی مونچھ کا وجود نہ تھا مگر قیافہ مغولی میں ایسی فضول روئیدگی کی ضرورت نہیں۔ بدن اسکا چوکھونٹا تھا اور اس سے بھی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اگر اسکے سر پر قیس نہ ہوتی۔ تو میں اسکو گورکھا سمجھ کر ہندوستانی میں باتیں کرتا۔ مگر گورکھوں سے اگرچہ چہرہ بہت ملتا تھا مگر رنگ و روغن اور ظاہری لباس سب جدا تھے۔ قیس کی انتہائی حدود اور کاسۂ سر کے ابتدائی حدود کے درمیان ایک رنگین رومال کئی تہ میں مارگنج کی طرح دونوں چیز کی حفاظت پر متمکن تھا۔ جو نظر کو سب سے پہلے اپنی کھینچتا تھا۔ اسکے نیچے بدن کے تھوڑے حصے اور بانہہ کی آدھی کہنیوں تک ایک نہایت ہی مجروح اور نیمجان و ناقابل توجہ مرزئی تھی۔ مگر پیٹ ہی سے ایک بہت بڑی چوڑی ادنیٰ شلوار کی سرحدِ حکومت شروع ہوگئی تھی، جو بقیہ جسم پر ایک استبدادی حکومت کے ساتھ حکمران تھی اسکے دونوں رخ پر خزانۂ عامرہ

کے دو باب عالی تھے جسکو ہم سادی نثر میں جیب کہہ ڈالینگے۔ اور اسکے اندر دونوں ہاتھ بطور محافظ و نگہبان مستعد اور تیقن۔ میرے سماوار میں چائے تیار ہو رہی تھی اور مجھے رسماً عرفاً۔ اخلاقاً اس شانِ نزول کو چائے کے لئے مدعو کرنا لازمی تھا۔ جب چائے سے فراغت ہُوئی تو میں اپنے جوابات سے جو ابتک نوکِ زبان ہو چکے تھے۔ تیار ہو کر بیٹھا۔ مگر مستفسر نے بظاہر اس عامیانہ گفتگو کو اپنے لئے موزوں نہ پایا۔ اسکا پہلا سوال بالکل نرالا تھا۔ آیا میرے پاس دو نصرانی مرد اور تین نصرانی عورتیں آئی ہُوئی تھیں۔ میں نے کہا ہاں۔ تم جانتے ہو وہ کون ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ وہ تھیاترو ہیں اور موسل سے آئی ہُوئی ہیں (تھیاترو یعنی تھیٹر میں ناچنے گانے والے لوگ) میں نے کہا عجیب۔ اور وہ سب اس خان میں ٹھیری ہُوئی ہیں۔" امان امان"[1] وہ بھی کل کفری جا رہی ہیں"۔ "ہا وار" اور وہ گاڑی جس پر وہ آئی ہیں میری ہے"۔ رحمت بہ باؤکئی" تو تم ذرا اٹھ کر نیچے چلو۔ وہ گاڑی موجود ہے اور گھوڑا بھی۔ میں نے سنا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ میں ترک ہوں۔ اور ان ناپاک کتوں کی خدمت ہزار لیرے[2] میں تمہارے ایک لیرے سے بہتر نہ سمجھونگا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہُوا۔ گاڑی جا کر دیکھی۔ مناسب معلوم ہوئی۔ اور اسی وقت سے ہمارا رخت سفر بندھنا شروع ہُوا۔ یہ قرار پایا کہ آج ہی حکومت سے اسکا کرایہ طے کر لیا جائے۔ میں اسی وقت اسکو حکومت سیاسی کی سرائے میں لے گیا۔ نوے روپیہ طے ہُوئے۔ نصف کرایہ کرکوک میں دلایا گیا اور نصف کے لئے کفری کے حکومت سیاسی کے نام بِل دیدیا گیا۔ شام کو تھیاترو کو نوٹس ملگیا۔ کہ یہ گاڑی اب انکے قبضے میں نہیں رہی۔

## ۲

ہمارے اس ترکی کرمفرما کا نام موسیٰ آفندی تھا۔ یا تو کل میں نے بھول کر آٹھ بجے دن کو انگریزی وقت کے لحاظ سے بتایا تھا کہ وہ یہاں چار بجے شام سمجھا جاتا ہے یا موسیٰ آفندی اپنی قومی وضعداری کے مطابق عجلت اور پابندی وقت کو احمقوں اور شیطانوں کا فعل

---

[1] جملے ندائیہ ہیں اور انکا رواج ترکی میں ویسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں "ارے غضب" [2] ترکی سکہ

جانتے ہیں۔ کوئی دس بجے تک جبکہ ہمارا تمام اسباب گاڑی پر بار ہوگیا۔ ہم ناشتہ سے فارغ ہو لئے۔ ہم نے خانچی کا کرایہ بھی ادا کردیا۔ کوٹھڑی میں جھاڑو پھیر دی گئی اور مقفل بھی کردی گئی موسیٰ آفندی نمودار نہ ہوئے۔ دس کے بعد گیارہ بجے۔ ۱۲ بجے یعنی دو گھنٹے میں بحساب چار میل فی گھنٹہ رفتار کے ہم نے آٹھ میل کا سفر پیدل خان کے برآمدے کے گرد لگا ڈالا۔ کہ یکا یک نیچے صحن سے چار لانبے نیزے بلند ہوئے جنکے نیچے موسیٰ آفندی کا ہاتھ اسکو جنبش دے رہا تھا میں جھلاہٹ میں نیچے اُتر کر آیا۔ اور غصے میں موسیٰ سے کہا کہ تنبل و بطال تو نے صبح ناشتہ کے بعد روانہ ہونے کو کہا تھا۔ آدھا دن تو نے یہیں گذار دیا۔ موسیٰ آفندی ایسی لایعنی باتوں کی طرف متوجہ ہونے کے عادی نہ تھے۔ وہ بدستور خاموشی کے ساتھ چار نیزے عربانہ کے چاروں طرف باندھنے میں مصروف رہے۔ انکے ساتھ آج انکا ایک اسسٹنٹ دس بارہ برس کی عمر کا موجود تھا۔ جب بہت دیر تک نیزے کئی بار کھول کھول کر باندھے گئے۔ تو موسیٰ آفندی میری طرف بہت مطمئن لہجہ سے مخاطب ہوئے "باغلا پان گلیمک نرہ دہ در" یعنی اوپر باندھنے کا کمل کہاں ہے۔ بہت دیر تک اسباب کھولنے اور کمل نکالنے میں صرف ہوا۔ ادھ گھنٹے میں کمل کئی بار باندھ باندھ کر کھولا گیا۔ آدھ گھنٹے میں گھوڑے کا ساز گھوڑے پر رکھا گیا اور آدھ گھنٹے میں گاڑی جوڑی گئی۔ مگر ابھی بہت سے تردوات اور مرافعے موسیٰ آفندی کو درپیش تھے۔ ابھی تک انہوں نے توتون کو کاغذ میں ہی نہیں لپیٹا۔ سگرٹ پینا تو عرصے کے بعد عمل میں آئیگا۔ اور اسکا ختم ہونا یہ اللہ جانتا ہے۔ کچھ تو اپنی فطرتی عجلت و جھلاہٹ کچھ اس خیال پر کہ اپنی بیوی کی حالت زار دیکھی نہ جاتی تھی کہ اُس بیچاری نے پہروں کھڑے کھڑے اب تھک کر میرا سہارا لگا لیا ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا چھڑی میرے ہاتھ میں تھی اور میں نے حالت اضطراری میں موسیٰ آفندی کی گدیلی پیٹ پر متواتر کوئی دس بارہ برسا دیں۔ یہ نسخہ بہت ہی مجرب ثابت ہوا۔ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ میری چھڑی میں یہ کرامت ہے تو اب تک میں طارق کے نصف راستہ پر ہوتا۔ چھڑی کی سڑ سڑاہٹ کے ساتھ گاڑی کی کھڑ کھڑاہٹ شروع ہوئی۔ اور ہم بسم اللہ مجریہا ومرسہا کہکر عربانہ پر سوار ہوگئے۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔ موسیٰ اور اسکے اسسٹنٹ کرکوک کے

خیابان سے باہر بہت دور میدان تک گاڑی بڑی بہامی سے ہانکتے گئے۔ جب انکے اور انکے گھوڑے کے جوش کو ذرا سکون ہُوا تو میں نے کہا "اوغلم" مجھے اپنے غصے پر افسوس ہے۔ میں ترک کے ساتھ کبھی ایسا برتاؤ نہیں کرتا۔ مگر تم نے ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ ہم بے صبرے ہندوستانی ہیں۔ ترک نہیں ہیں خیر یہ لو اسکا یہ معاوضہ ہے اور اب تلافی مافات کر لو۔ اور یہاں سے اب ہم اور تم بھائی بھائی کی طرح کفری تک چلینگے موسیٰ آفندی پر میری اس تالیف قلوب نے بہت نمایاں اثر کیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جو روپیہ میں اسکو دینا چاہتا تھا اس نے نہیں لیا۔ مگر میری طرف ایسا ہمک کر مخاطب ہوا جیسے چھوٹا بچہ اپنے باپ کی مار بھول کر اس سے پھر پیار کرنے لگتا ہے۔ طادق تک ہم اور موسیٰ آفندی بالکل شیر و شکر ہو گئے۔ ترکوں کی قومی عادت کو میں جانتا تھا کہ وہ صبر و وقار کا نمونہ ہوتے ہیں۔ کینہ وہ جانتے نہیں اگر تم انکو بے جا غصہ دلاؤ گے تو وہ اگر تم کمزور ہو گے تو تمہاری طرف حقارت سے دیکھ کر منہ پھیر لینگے اور اگر طاقتور ہو تو فوراً اسی وقت اسکا فیصلہ کر لیتے ہیں اور بعد کو کبھی اُٹھا نہیں رکھتے۔ اس لئے مجھے یقین تھا کہ موسیٰ آفندی کا دل مجھ سے صاف ہو گیا ہے اور اسکا ثبوت یہ تھا کہ راستے میں جو گاؤں پڑتا تھا وہاں وہ اُتر کر میرے لئے کھیرے ککڑی انگور مفت لایا کرتا تھا۔ یہاں سے کفری تک جتنی منزلیں ہیں اس میں تقریباً ہر جگہ ترک آبادی تھی اور اس لئے موسیٰ آفندی اپنی برادری سے یہ خراج وصول کرنے میں نہ باک کرتے تھے اور نہ شرم۔ اور نہ ان سے کوئی انکار کرتا تھا۔

## ۳

موسیٰ آفندی کی ترکی کرکوک کی طرح نہ تھی بلکہ جیسے عثمانی بولتے ہیں۔ اس لئے میں نے موسیٰ سے دریافت کیا کہ تمہارا اصلی وطن کہاں ہے؟ اس نے کہا انگورا۔ میں نے کہا پھر تم کرکوک کیسے آ گئے۔ موسیٰ نے بھرائی ہُوئی آواز میں کہا "فلک" (ترک چونکہ بالطبع خاموش ہوتے ہیں۔ اپنی مصیبت اور خانہ بربادی کی داستان کبھی بیان نہیں کرتے بلکہ اُسکو صرف ایک لفظ "فلک" سے بیان کر دیتے ہیں) مگر میرے دم دلاسے نے موسیٰ سے اس فلک کی تفسیر کرا چھوڑی۔ موسیٰ نے کہا افندم۔ جس طرح آج تم نے مجھ پر تحکم کیا ہے۔ چار برس پہلے

میں انگورا میں اپنے سائیسوں اور کوچبانوں سے ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ میں انگورا کے ایک بہت بڑے بک کے خاندان سے ہوں۔ میرا دادا والی خداوندگار (بروسہ) تھا اور میرا باپ فوج میں میرآلائے میں انگورا کا رئیس ابن رئیس ہوں۔ باپ عسکر شاہانہ کے ساتھ عراق کی جنگ میں آیا۔ اور تین سال تک محاربہ میں شامل رہا جب جنگ کو زمانہ گزرنے لگا تو اسنے اپنے عیال کو انگورا سے اپنے پاس بلوا لیا۔ اسوقت کرکوک میں میری چھوٹی بہنیں ایک بھائی اور ایک بیوہ ماں ہے۔ میرا باپ عثمان بک کرکوک کی جنگ میں شہید ہوگیا۔ میں مکتب عسکری میں تعلیم پارہا تھا۔ اسکی باتوں سے مجھے پہلے بھی شبہ ہوچکا تھا کہ اسکی باتیں عام گاڑیبانوں کی طرح نہیں بلکہ یا تو کسی تعلیمیافتہ اور باتربیت شخص کی ہیں یا کسی مسن تجربہ کار کی۔ اسکا بشرہ اسکی باتوں سے زیادہ اسکی شرافت پر گواہی دیتا تھا۔ "میں رشدیہ کی تعلیم پورا کرچکا تھا کہ انگریزوں کا کرکوک پر قبضہ ہوگیا۔ میرے باپ کی اچانک موت اور انگریزوں کے کرکوک آجانے پر میری زندگی کی سختیاں شروع ہوگئیں۔ ہم لوگ جانفروش ترک سپاہی ہیں روپیہ جمع کرنیوالے یہودی نہیں۔ باپ کے مرتے ہی ہمارے تمام ذرائع معاش یکقلم موقوف ہوگئے۔ یہانتک کہ ہم بیکسی میں گذارنے لگے۔ تھوڑی بہت امداد ہمارے ہمسائے کرتے رہے مگر کرکوک کی گرانی میں وہ کیا کرسکتے تھے۔ اور خود میری غیرت بھی اسکی متحمل نہ تھی۔ جب میں نے یہ سُنا تو میں نے موسیٰ سے کہا کہ کیا تمہارے ایسے بدقسمت ترکی خاندان کرکوک میں اور بھی محصور ہیں۔ اس نے کہا ہاں میرے ایسے بہت ہیں میں نے یہ سوال قصداً اسلئے کیا تھا کہ جب میں پہلے پہل کرکوک میں آیا تو مجھے عرصے تک اس بات کی حیرت تھی کہ ذلیل ترین اور نہایت کریہہ منظر ہندوستانی فالوروں کے ہاتھ ایسی ایسی حسین و مہ جبین ترکی عورتیں لگی تھیں کہ وہ میرے لئے ایک چیستان سے کم نہ تھی۔ ایک دو کو تو میں خود ذاتی طور سے جانتا تھا جنکے برائے نام موٹرمیں سے ایک صاحب نہایت سیاہ فام حقیر صورت مدراسی مسلمان کسریٹ کے گماشتے تھے جن کا حلیہ مع ریش مختصر زنخدان زیادہ تر سجاد حسین کے حاجی بغلول سے مشابہ تھا انکے ساتھ انکی ترکی حرم محترم کو دیکھکر "حور کے پہلو میں لنگور" کی مثل صادق آتی تھی۔ ایک دوسرے صاحب ادھیڑ عمر پوسٹ ماسٹر تھے جنکی زوجہ حسن میں گویا سلطان کے خاص حرم کی تھیں اور جو خود انکے بیان کے مطابق ایک ترکی کرنل کی بیوہ تھیں۔ نہایت اعلیٰ درجے کی تعلیمیافتہ اور طریقہ معاش بالکل مغربی یوروپ کی لیڈیز کا مجھے تعجب تھا کہ آخران شریف ترکی مخدرات کی طبیعت پر کیا افتاد پڑی ہے کہ وہ اس قدر بےباکی سے اس حالت پر اتر آئی ہیں۔

آج موسے کے بیان سے معلوم ہُوا کہ ترک مجاہدین کا حال زبون اس وجہ سے ہُوا ہے
موسے سے میں نے کہا کہ تمہاری ماں نے پھر شوہر کیوں نہ کر لیا بہت سی ترکی
عورتوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ موسےٰ نے کہا ہاں بیشاید مجبوراً انکو بھی ایسا کرنا پڑتا مگر
میں زندہ تھا میں نے اپنے والدہ اور اپنے والد کے قیمتی لباس اور اپنی ماں کے زیورات
فروخت کرکے ایک گاڑی درست کی میرا ساتھی جو یہ میرے پاس بیٹھا ہے۔ کردہے اور
کرکوک کا رہنے والا میرا ہمسایہ۔ اس نے ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہم دونوں مشترکہ گاڑی چلاتے
ہیں اور اپنی ماں اور بہنوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ جب تک خدا کی مرضی ہے کہ پھر اپنا گوزل
(ترکی میں خوبصورت کے مرادف) وطن نہ دیکھیں۔ میں نے کہا موسیٰ۔ تمہاری قوم
کی مظلومیت کی واقعی کوئی حد نہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کرنے والا
ہے۔ اسکی راہ میں سر کٹانے والوں کے پسماندگان کا یہ حال۔ انکا کوئی خبر گیراں
نہیں۔ آہ غریب ترک صرف اس ایک جرم میں کہ وہ مسلمان ہے اور غیور مسلمان ہے
کتنے امتحان میں مبتلا ہے اور کتنے دشمنوں سے گھرا ہُوا ہے۔ یونانی۔ ارمنی۔ روسی
انگریز اور یہ بدبخت و بدذات شریف مکہ اور اسکے معاون و انصار۔ افسوس کہ مردوں
کی شہادت جو انکے لئے راحت دائمی ہے۔ ان کے پس ماندگان کے لئے اس دارالمحن
میں کیا کیا آزمائش پیدا کر رہی ہے۔ مگر خدا نے کہا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ تو کیا وہ اس
زندگی پر لعنت نہ کرتے ہونگے کہ اپنی آنکھوں سے اپنی عورتوں کی مجموعی اضطراری اور
زبونی کو دیکھتے ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے۔ اے خدا تو کہاں ہے۔ تیری نصرت کب
آئیگی! موسے کے بیان پر بہت دیر تک یہ خیال مجھے ساکت اور مبہوت بنائے
رہا۔ اور مجھے مطلق خبر نہیں کہ راستے میں گاڑی کہاں کہاں سے گذری۔ یہاں تک
کہ شام کو ہم نے طاوق میں منزل کی۔

۴

طاوق میں موسےٰ نے فوراً گاڑی کھولنے کے بعد اسباب میں سے نکال کر
میری قالین بچھائی۔ دوڑا ہُوا گیا پانی بھر لایا۔ خود ہی آگ جلائی چائے تیار کی۔

کھانا بازار سے لایا۔ میرا بستر بچھایا۔ اپنی کمر سے توتوں کا تھیلا اور سگریٹ کے کاغذ نکال کر کئی ایک سگریٹ بنا کر مجھے اور میری بیوی کو پیش کئے۔ ہمکو اسکی خدمت سے اس قدر راحت ملی کہ میں بلا تکلیف و پریشانی آدھ گھنٹے میں اپنے بستر پر دراز تھا رات کو میں بار بار سفر کی محنت اور خواب پریشاں سے چونک پڑتا۔ ایک مرتبہ میں جاگا تو دیکھا کہ کوئی شخص گاڑی کے پاس ٹہل رہا ہے میں نے آواز دی "کیم در (یعنی کون ہے) موسیٰ بولا؛ دت آفندم کیمسی یوق۔ نیم موسیٰ (یعنی کوئی نہیں میں موسیٰ ہوں)۔ میں نے کہا موسیٰ تو سوتا کیوں نہیں۔ اس نے ہنس کر کہا کہ اگر میں سو جاؤں تو آپکے اسباب پر پہرہ کون دیگا۔ دنیا مخشوش ہے۔ میں نے کہا خیر اب جاؤ سو رہو۔ اسکے بعد پہرہ کی ڈیوٹی میرے ذمے۔ تم ہمارے اسباب کی حفاظت سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔

صبح ہم پھر طاوق سے روانہ ہوئے، طور فرماتلی اور تازہ فرماتلی کے درمیان وہاں کے مدیر (تحصیلدار) نے چلتے ہوئے بتا دیا تھا کہ راستہ پُر خطر ہے۔ باوجود میرے اصرار کے موسیٰ نے کوئی پروا نہ کی۔ اور چل پڑا۔ شام ہونے کے وقت جب ہم تازہ فرماتلی سے چند کوس دُور تھے۔ دُور سے کچھ کرد سوار معلوم ہوئے۔ موسیٰ نے دیکھتے ہی اپنی گاڑی بے تحاشہ تیز ہانکی کہ سوار بہت پیچھے رہ گئے۔ جب ہم کفری پہنچے تو موسیٰ اور انکے معاون نے ہمارا تمام اسباب لاد لاد کر ریل میں رکھا۔ جب ہم دونوں کو سوار کر چکا اور گاڑی چھوٹنے میں ابھی دیر تھی۔ میں اُتر کر موسےٰ کے گلے ملا۔ اور اس ملک کی رسم کے مطابق اسکی پیشانی کو بوسہ دیا میں نے کہا موسیٰ تم میرے بھائی ہو۔ اور تمہاری ماں میری ماں۔ ان سے جا کر ایک ہندوستانی کا یہ پیام کہدینا کہ میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ اگر مجھے اپنے ہموطن اور دردمندوں سے کبھی کچھ کہنے کا موقع ہاتھ آیا تو میں تمہارے اور عراق کے ان تمام ترکی شہداء کے غریب الوطن پسماندوں کی مدد پر انکو ابھاروں گا۔ ہم خود مظلوم ہیں اور جانتے ہیں کہ مظلومیت کیا چیز ہے۔ شاید ہمارے ہموطن اسکا انتظام کر سکیں کہ اپنے خرچ سے تمکو اپنے ملک پہنچا دیں اور تمکو عراق کی ذلت اور مسکنت سے نجات دیں +

ابن السبیل

# محفلِ ادب

محبت کے پاکیزہ ہونے میں مجھے کلام نہیں مگر تعجب اس بات کا ہے کہ ایسی پاکیزہ چیز عام کیوں کر دی گئی کہ کمینوں اور آوارہ طبیعتوں کو بھی دی گئی جو نفس کی خباثت کی وجہ سے اسکی بدنامی کا باعث ہوئے۔ ہر افسانے و ناول میں وہ ایک خون و آوارگی کی وارداتیں ضرور دیکھنے میں آئیں گی۔ پیشتر اس سے کہ ہیرو اور ہیروائن (محبت زدہ مرد و عورت) ملیں پہلے خانہ خرابیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور یہی افسانوں اور ناولوں کی جان سمجھا جاتا ہے۔ افسانوں اور ناولوں کا لطف ہی تب تک رہتا ہے جب تک کہ ان جھگڑوں کا ذکر ہے۔ جہاں دونوں محبت زدہ مل لئے پھر افسانہ کا لطف نہیں۔ شادی کے بعد گو دونوں عمر نوح کو پہنچیں مگر پھر کوئی ذکر دلچسپ نہیں رہتا محض اتنی سی بات کے لئے کہ بے گنتی مخلوق خدا میں دو محبت کے مارے ہوئے ہزار مصائب کے بعد آپس میں ملیں شاعروں اور افسانہ نویسوں نے ہزاروں جھوٹے سچے قصے لکھ ڈالے یہی کام قاضی جی آدھ گھنٹہ میں کر دیتے۔ صلائے عام

---

حب و علم الہی کا قانون جو رہبانیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے ایک خوفناک اصول ہے کیونکہ اُسکے ذریعہ نہایت آسانی سے مذہبی قوانین کے حدود کو توڑا جا سکتا ہے اور اگرچہ ضروری نہیں ہے کہ کثرت کی طرف انسان رجوع ہو جائے لیکن یہ اسکا دروازہ خود کھول دیتا ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یہ شئے بہت عام ہوگئی تھی اور اس نے تصوف و اسلام کے درمیان خلیج کو وسیع تر کر دیا قشیری نیشاپوری نے پانچویں صدی کے وسط میں اپنے رسالہ کے ذریعہ صوفیوں کی طرف سے ان متضاد خیالات کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی، اور اس میں یہ دکھانیکی کوشش کی تھی، بلکہ کی ہے کہ اولین صوفیہ کے تمام اصول قران و سنن پر مبنی تھے! لیکن جس شخص نے تصوف کو صرف اسلام میں ایک محفوظ جگہ ہی نہیں دی بلکہ تصوف کی بہترین تعلیمات سے اسلام میں نئی زندگی پیدا کرنیکی کوشش کی وہ امام غزالی تھے، قبل اسکے کہ وہ صوفیانہ زندگی بسر کریں جن سے انکی تمام حیات

متاثر تھی اُنھوں نے اسلامی دینیات و فلسفہ کے تمام مباحث پر کامل عبور حاصل کر لیا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ بغداد میں دینیات کے استاد تھے اس لئے جس کام کا انھوں نے بیڑا اُٹھایا تھا اس کے لئے وہ موزوں ترین شخص تھے، انھوں نے صرف صوفیہ ہی کے لئے نہیں لکھا بلکہ تمام مسلمانوں کو اپنی تحریرات کے ذریعہ مستفید کرنا چاہا، اور وہ ناقدانہ و حکیمانہ اصول اختیار کیا جو ہر دماغ پر یکساں اپیل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ انکے بعد والے صوفیہ غزالی کو جنکی کتابیں تصوف کے مباحث سے بھری ہوئی ہیں صوفی نہیں سمجھتے اور مشکل ہی سے کوئی اُنکا نام لیتا ہے، لیکن اسکے باوجود انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو دوسرے کبھی بھی نہ کر سکتے تھے، اور ان کے زمانہ سے اسلام، مسیحیت سے زیادہ ایک صوفیانہ مذہب ہے، وہ صوفیوں کے اس اصولی عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ روح خدا سے متحد ہے اور خداوند تعالیٰ اُنکے سامنے اپنے کو ظاہر کرتا ہے جو اپنی روحوں کو پاک کر لیتے ہیں۔ اُنکے خیال میں مذہب ظاہری فرائض کی ادائیگی اور چند عقائد پر ایمان رکھنے کا نام نہیں ہے، بلکہ ذاتی ایمان، جذبات و تجربات پر مبنی ہے، تاہم وہ خیال کثرت سے اپنے کو بچانے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اسناد و روایات سے اپنے کو مسلح رکھتے ہیں ؛

معارف

---

جس طرح چھوٹی چھوٹی ندیاں بڑے بڑے دریاؤں کی خوراک ہیں۔ جس طرح ہر آبشار اپنی خفیف حرکت اور ناتواں قوت کو اُس تیز رو سیلاب پر نثار کر دیتا ہے۔ جس کی خاراشگاف روانی میں اسکی ہستی مدغم ہو کر کالعدم ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوہستان کی ترنم ریز نہریں اُن عظیم الشان دریاؤں کی عظمت و شان کو بڑھاتی ہیں۔ جن پر کھیتوں کی شادابی۔ مرغزاروں کی لہلہاہٹ باغوں کی رونق اور نکہت بیزی کا دار و مدار ہے۔ اسی طرح جو قوتیں اور نعمتیں تو نے پائی ہیں تبسم و خندہ روئی سے اُس بحر بیکراں پر نثار کر دے جو بغیر کسی مزاحمت و رکاوٹ کے پیہم رواں ہے۔ جس کی شوکت حیرت خیز ہے اور جس کی قوتِ لامتناہی، تاکہ تیری قوتِ ناتواں بھی اُس قوت غیر محدود میں مدغم ہو کر پژمردہ دلوں کی خشک کھیتوں کو شاداب کر دے۔ اور تیرے الفاظ بھی چشمہائے مترنم کے دلآویز زمزموں کی طرح سامعین کو امید و مسرت کا پیغام سنائیں اگر انسان میں عزم راسخ اور وجدانِ کامل پیدا ہو جائے تو تمام وہ زنجیریں خود بخود

شکستہ ہو جائیں۔ جو اس کو انحطاط و زوال کی طرف گھسیٹتی ہیں۔ جنگل کی خزاں دیدہ پتیاں جھڑ جاتی ہیں۔ لیکن شاہ بلوط اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی جگہ پر جما رہتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کو تو اپنی کامیابی و مسرت کے لئے لازمی تصور کرتا تھا۔ افسردہ ہو کر فنا ہو جائیں گی جذباتِ فاسدہ مٹ جائینگے۔ عارضی خیالات نقش بر آب کی طرح معدوم ہو جائینگے۔ لیکن تو یکہ و تنہا اپنے عزمِ راسخ کے ساتھ اٹل پہاڑ کی طرح کھڑا رہیگا۔ ممکن ہے کہ تجھ کو ان محبوب ترین اشیاء سے بھی علیحدگی اختیار کرنی پڑے جن کے بغیر (تیرے خیال سے) بزمِ حیات میں عیش و نشاط کی ایک مجلس بھی ناممکن تھی۔ لیکن اب کسی عزیز کی ناگہانی موت۔ کسی حبیب کی دائمی مفارقت یا مصیبتِ خزاں کی آمد۔ تیرے دل پر کوئی دیرپا صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ اگر تو زندگی کے مختلف تغیرات سے گذر کر فولادی عزم کا مجسمہ بن چکا ہے۔ تو موجودہ امیدوں کی موت تیرے لئے حیاتِ تازہ اور غنچۂ نو کا مژدۂ جانفزا لائیگی۔ تیرے چہرہ پر ایک شان ہوگی۔ تیری ہر ادا آئینہ استقامت ہوگی۔ تو قوتِ عمل کا ایک مرقع ہوگا۔

ہزار داستان

---

مجھ سے ایک خاتون نے سوال کیا کہ "جب مذہب خود ہی عورت کی سعادت اور راحت کا متکفل ہے تو کیا وجہ ہے کہ مرد اور عورت میں ناچاقی ہو جاتی ہے؟ اور کیوں مرد اپنی بی بی پر فرمانروایانہ تسلط قائم کر لیتا ہے" میں نے جواب دیا کہ "ہمارا اصلی مرض جہالت ہے جسکی وجہ سے ان دونوں لڑنے والے میاں بیوی میں اپنے ذمہ دارانہ فرض کے ادا کرنے کی قابلیت نہیں پیدا ہوتی اور یہ تمامتر خرابی تعلیم کا نتیجہ ہے، اگر عمدہ تعلیم و تربیت دینے کے بعد ایک لڑکی کا نکاح کسی مہذب شخص کے ساتھ کر دیا جائے تو وہ نہایت پُر اطمینان اور خوشگوار زندگی بسر کریگی اور انکے درمیان کسی قسم کا بغض و نفاق نہ پیدا ہوگا، مرد کے فرمانروایانہ تسلط و اقتدار کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارے یہاں مرد عورت سے زیادہ تعلیمیافتہ ہوتے ہیں، اور حکومت اُسی شخص کو ملتی ہے جو اسکی صلاحیت رکھتا ہے، اگر خود عورت مرد سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی تو معاملہ بالکل برعکس ہوتا۔

ظل السلطان

# حصۂ نظم

## اشکِ چکیدہ

وفورِ غم میں پڑی کیا تھی جلد بازی کی ؟ جبیں جو چھٹتے ہی تو بن گیا نمازی کی
پڑا جو وقت نہ کچھ تو نے چارہ سازی کی جگر کا ساتھ دیا۔ اور نہ دلنوازی کی
جو کام ضبط سے لیتا تو داغ بن جاتا !
تپش کے فیض سے روشن چراغ بن جاتا!

۲

شعاعِ مہرِ تخیل سے عرش پر ہوتا مہ فلک کے مقابل میں جلوہ گر ہوتا
جو آہ بن کے نکلتا تو پر اثر ہوتا زبان کے سانچہ میں ڈھلتا تو شعرِ تر ہوتا
ٹپک کے آنکھ سے تو گر گیا نظر سے مری
سزا یہ اشکِ چکیدہ ہے بیوفائی کی

ابن حزین

---

## نیچرل غزل

مستانہ جنبشیں ہیں یہ چشمِ نگار کی کہتے ہیں گردشیں جنھیں لیل و نہار کی
دیکھو تو کہکشاں کو ذرا چشمِ غور سے اک سطر آسماں پہ ہے خطِ غبار کی
سبزہ پہ مست ہو کے وہ رندوں کا لوٹنا کیفیتیں ہیں یاد لبِ جوئبار کی
کیوں زندگی بسر نہ کریں نا و نوش میں یاروں کو جب خبر نہیں انجام کار کی
رہ جائیں تلملا کے گھٹاؤں میں بجلیاں آتش بلند ہو جو دلِ بیقرار کی
اک زلزلہ سا جسم میں آیا شبِ وصال یاد آئیں کروٹیں جو شبِ انتظار کی
رکھا ہے ہم نے چادرِ مہتاب جسکا نام اڑتی سی گرد ہے یہ کسی شہسوار کی

کلیاں چٹک چٹک کے ہیں ارگن بجا رہی ق آمد جو ہر چمن میں ہے بادِ بہار کی
شبنم اس آب و تاب سے گل پر ہوئی عیاں شرما گئی چمک گہرِ آبدار کی
بہر سفر ہوائی جہازوں پہ ہیں سوار فوجیں شمیم نافۂ مشکِ تاتار کی
مُردے بھی زیرِ خاک ہوئے مست جھوم کر چھائی ہوئی زمیں پہ گھٹا سبزہ زار کی
پتھر کے دل کو چیر کے سبزہ نکل پڑا سرسبز گھاٹیاں ہوئیں سب کوہسار کی
موجیں ادھر ندی کی گگن کھیلنے لگیں پڑنے لگی بھرن سی اُدھر آبشار کی
پائے نظر کو ہوتی ہے زنجیرِ موجِ رنگ کیا جدّتیں گلوں میں ہیں نقش و نگار کی
پھولوں سے ہیں لدی ہوئی شاخیں جھول رہی کیا لذتیں اُٹھاتی ہیں بوس و کنار کی
ہر باغ اس طرح سے بدلتا ہے رنگتیں جس طرح نوعروس کو دُھن ہو سنگار کی
ہیں الغرض یہ موسمِ گل میں جو ندرتیں صناعیاں ہیں قدرتِ پروردگار کی

وحید الدین سلیم

---

# جذباتِ عالیہ

## فکر آروی

زمیں اپنی بتاؤں میں تجھے یا آسماں اپنا پلا اک گھونٹ ساقی پھر تو ہے دونوں جہاں اپنا
کمالِ نامرادی ہے ذریعہ اپنی شوکت کا چراغِ برق سے ہوتا ہے روشن آشیاں اپنا
لہو میں اپنے پیوستہ ہے تیری تیغ کا پانی نہاں ہے اپنے ہر دورانِ خون میں امتحاں اپنا
رہائی اک طرف۔ زنداں میں اتنا فخر کیا کم ہے پسندِ خاطرِ صیاد ہے شورِ فغاں اپنا
نہاں تھی اپنی آبادی میں بھی اک شکلِ ویرانی کہ آخر وقفِ سبزہ ہو گیا سارا مکاں اپنا
تمنا عیشِ مستقبل کی کانٹوں پر لُٹا یا کی ہوائے سُود میں ہوتا رہا کیا کیا زیاں اپنا
برنگِ کاغذِ آتش زدہ میں جل بجھا ایسا نہیں اب اپنے خاکستر میں بھی نام و نشاں اپنا
خموش اے ہم قفس اپنی اسیری بھی غنیمت ہے چمن میں جا کے پھر پاؤں نہ پاؤں آشیاں اپنا

غضب تھی نارسائی اپنی قسمت کی کہ مر کر بھی ۔ نہ پہنچا اُسکے دامن تک غبارِ ناتواں اپنا

اسی اُمید پر اے فکر ہیں سرگرم طاعت ہوں
کبھی تو مہربان ہوگا بُتِ نامہرباں اپنا

## احسن مارہروی

یہ نیا خبط ہُوا ہے ہمیں سودا ہوکر ۔ ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر بادیہ پیما ہوکر
کیا جیئے کوئی کہ جینے کی حلاوت نہ رہی ۔ زندگی تلخ ہے ناکامِ تمنا ہوکر
منع ہم کرتے ہیں کیوں غیر سے ملنے کیلئے ۔ سوچنا تم کبھی اس بات کو تنہا ہوکر
کیکے غیروں سے عبث تم ہمیں اُٹھواتے ہو ۔ آپ اُٹھ جائیں گے مایوسِ تمنا ہوکر
شیوۂ ضبط نے آہوں کی اجازت بھی نہ دی ۔ دل کا دل ہی میں رہا درد بھی پیدا ہوکر

پاسِ ناموس نہیں کچھ انہیں احسن کی طرح
ہو چکے عشق میں بدنام جو رسوا ہوکر

## اثر صہبائی

شام آئی کب نہ جانیئے اور کب سحر ہُوئی ۔ تیرے خیال میں نہ مجھے کچھ خبر ہُوئی
او مستِ نازِ حسن تجھے بھی خبر ہُوئی ۔ کیسے شبِ فراق کسی کی بسر ہُوئی
بیمارِ غم خموش تھا، دُنیا اُداس تھی ۔ آخر سحر ہُوئی بھی تو ایسی سحر ہُوئی
پھر بر سبیلِ ذکر جو نام اِس کا آگیا ۔ بزمِ خیال پھر مری زیر و زبر ہُوئی
ہر داغ تیری یاد میں رشکِ چمن ہُوا ۔ ہر سانس میری نغمۂ بادِ سحر ہُوئی
کس نامراد کا یہ شکستہ مزار ہے! ۔ او رونے والے تجھکو بھی اسکی خبر ہُوئی

پھُوٹے ہُوئے نصیب تھے اپنے ہی اے اثرؔ
اُسکی نگاہِ لطف تو ہر ایک پر ہُوئی

# تقریظات

**اعظم الاخلاق**۔ نتیجہ خیز اور نصیحت آموز مقولوں کا ایک قابل قدر مجموعہ، جسے سید منظر علی صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ ابتدا میں مولانا تلمذ حسین ایم اے کا ایک مقدمہ بھی درج ہے، جس میں اُنہوں نے بوجہ احسن کتاب کے موضوع اور اغراض و مقاصد کی تفسیر کی ہے۔ اگرچہ آجکل زمانے کی ہوا اخلاقی تصانیف کے حق میں سازگار نہیں؛ تاہم اُمید ہے کہ یہ کتاب اپنی وسعتِ معلومات اور حسنِ ترتیب سے قدردان پیدا کریگی۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ کتابت و طباعت گوارا ہے۔ مصنف کے نام پر حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے۔

**جامعہ**۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ کا ماہوار علمی رسالہ مرتبہ جناب نور الرحمٰن۔ اس وقت تک اس رسالے کے پانچ نمبر نکل چکے ہیں، جن میں سے ہر نمبر بسیط علمی مقالات اور پُر از معلومات مضامین کا مجموعہ ہے۔ ادبی عمومیت کے اس دَور میں ایسے گرانقدر علمی رسائل کا وجود بسا غنیمت ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اگر اہل علم کی سرگرمیوں کا چندے یہی حال رہا، تو وہ دن کچھ دُور نہیں جب ہمیں اُردو کی علمی بے بضاعتی کی کچھ شکایت نہ رہیگی۔ رسالہ کی ایک قابلِ لحاظ خصوصیت یہ ہے کہ مضامین اکثر و بیشتر متعلمانِ جامعہ کے لکھے ہُوئے ہیں۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڈھ سے طلب کیجئے۔ قیمت سالانہ للعہ ر۔

**القریش**۔ اس نام کا ایک اسلامی، تعلیمی، قومی اور اصلاحی رسالہ جناب محمد علی رونق صدیقی کی ادارت میں امرتسر سے ماہوار شائع ہوتا ہے۔ مقاصد کی مفصل فہرست اس بات کا وعدہ کرتی ہے کہ رسالہ کی خدمات زیادہ تر مسلمانانِ ہند کی صلاح و فلاح کے لئے وقف کر دی جائینگی، کتابت و طباعت اصلاح کی محتاج ہے۔

سالانہ قیمت تین روپے۔ طلباء سے عگ۔ ملنے کا پتہ رونق منزل امرتسر۔

**المومن**۔ یہ پرچہ قوم نور باف کا ارگن ہے اور تین مہینے میں ایک بار کلکتہ سے شائع ہوتا ہے، مقامی مقاصد کے ساتھ ساتھ علمی شان بھی لئے ہُوئے ہے۔ کاغذ اچھا اور لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ قیمت سالانہ عمر دفتر المومن کلکتہ سے طلب کیجئے۔

# فہرستِ مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۳ء

**جلد ۴** — **نمبر ۳**

## نثر



## نظم



### جذباتِ عالیہ

# نسوانی دُنیا

گزشتہ مئی میں نسوانی رائے طلبی کی بین الاقوامی کانگرس کا نواں اجلاس شہر روما میں منعقد ہُوا جس میں تینتالیس مختلف ممالک کی عورتیں شامل تھیں۔ ان میں سے پچیس عورتوں کو رائے کا حق حاصل ہے اور باقی پندرہ کو ابھی یہ حق نہیں ملا۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ ہندوستان بھی مہذب ممالک کے زمرہ میں شامل ہُوا اور آٹھ ہندوستانی عورتیں اس مجلس میں شریک ہُوئیں۔ اس مجلس نے جو رزولیوشن پاس کئے وہ حسب ذیل تھے:-

اوّل۔ یہ کہ مزدوری پیشہ عورتوں کو اُتنی ہی اُجرت دی جائے جتنی مردوں کو دی جاتی ہے۔

دوئم۔ عورتوں کو ہر صیغہ میں مردوں کی طرح شامل ہونیکی اجازت ہو اور اُنکو اُسی طرح ہر فن کی تعلیم دیجائے جس طرح مردوں کو دیجاتی ہے نیز سب بڑے بڑے ملکی عہدوں پر عورتوں کو بھی مردوں کی طرح مقرر کیا جائے۔

تیسرے۔ شادی شدہ عورتوں کو اجازت ہو کہ وہ اپنی قومیت کو قائم رکھ سکیں اور مذہب وغیرہ کے بارے میں اُنکے ذاتی خیالات میں کوئی شئے دخل انداز نہ ہو۔

چوتھے۔ میاں بیوی کو اجازت ہو کہ وہ اپنی اپنی آمدنی کو جس طرح چاہیں صرف کریں اور بیوی کو یہ بھی حق حاصل ہو کہ وہ میاں کی آمدنی میں سے حصہ لے سکے۔

پانچویں۔ بیوہ عورتوں اور لاوارث بچوں کی ماؤں کی حفاظت اور خرچ اخراجات کا انتظام میونسپلٹی یا حکومت اپنے ذمہ لے۔ اور اُن کی سب ضروریات کو پورا کرے۔

چھٹے۔ سب مُلکوں سے درخواست کیجائے کہ وہ لیگ اقوام کے ممبر بنیں اور جنگ کے سلسلہ کو ختم کرنیکی کوشش کریں۔

---

لیڈی کونسٹینس لٹن صاحبہ کی بیوقت وفات سے نسوانی دنیا کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے وہ حقوق طلب عورتوں کی پیشوا اور سب سے بڑی "جنگجو سفرجٹ" تھیں اور اپنی دوسری گرفتاری کے زمانہ میں اُنھوں نے قید خانہ میں بہت تکلیفیں اُٹھائیں چنانچہ جبراً خوراک پہنچانے اور دوسرے طریقوں

سے اُنکو بہت سخت اذیتیں دی گئیں۔ وہ قید خانہ میں ایک معمولی مزدوری پیشہ لڑکی کے بھیس میں داخل ہوئیں تاکہ اُنکی عالی نسبی کی وجہ سے اُنکے ساتھ دوسری عورتوں کی نسبت مختلف سلوک نہ کیا جائے لیڈی لٹن صاحبہ ارل آف لٹن گورنر بمبئی کی بہن تھیں اور اُنکی ناگہانی وفات سے ارل آف لٹن کو بیحد صدمہ پہنچا۔ اُنکی ایک کتاب "قیدی اور قید خانہ" انگریزی زبان کی ایک نہایت پاکیزہ اور بیش بہا تصنیف ہے۔ لیڈی صاحبہ موصوفہ نہایت حلیم الطبع اور نیک مزاج خاتون تھیں اور اُنکی تمام عمر اپنی ہمجنسوں کی خدمت اور اُنکی بہتری میں صرف ہوئی۔

---

امریکہ میں ہر سال ایک ہزار ڈالر کا انعام ایک ایسے ناول کے لئے دیا جاتا ہے جو امریکن زندگی اور طرز معاشرت کا سب سے اعلےٰ نمونہ پیش کرے چنانچہ اب کے سال وہ انعام ایک خاتون مس ولا سبرٹ کیتھر نامی کو ملا ہے۔

---

مس امیلیا ارہرٹ آف اچیسن۔ پہلی عورت ہے جس کو ہوائی جہاز کی قومی ایسوسی ایشن نے جہاز رانی کا لائسنس دیا ہے۔ وہ گیارہ ہزار فٹ کی بلندی تک ہوا میں گئیں جس کی وجہ سے اُن کو یہ خاص عزت حاصل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کسی عورت نے ہوائی جہاز میں اتنی بلندی تک سفر نہیں کیا ⁎

---

مصری عورتیں آج کل پردے کے خلاف بڑے زور شور سے جدوجہد کر رہی ہیں اور پرانی قیود کو توڑنے کی بہت تن دہی سے کوشش کر رہی ہیں۔ چنانچہ یہ تحریک ملک کے ہر حصہ میں پھیل گئی ہے۔ وہ اپنی ترکی بہنوں کی طرح نقاب کو خیر باد کہنا چاہتی ہیں اور تعلیم نسوان کو ترقی دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔ نیز نسوانی رائے طلبی کے مسئلہ پر بھی زور دیا جا رہا ہے اسلامی اخبار اس تحریک کی مخالفت میں صدائیں بلند کر رہے ہیں اور اسے احکام قرآن کے خلاف ظاہر کرتے ہیں ⁎

---

عورت نے بحیثیت موجد کے دنیا میں جو کچھ کیا ہے اُسکا حال ابھی تک بہت کم لوگوں کو معلوم ہے چنانچہ اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ فنِ ایجاد میں عورت کا کچھ حصہ ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں میری اینڈرسن صاحبہ نے جو امریکہ کے زنانہ "محکمۂ ایجاد" کی ناظمہ ہیں ایک کتاب موسوم بہ "ایجاد کے میدان میں عورت کا حصہ" لکھی ہے جس میں اُنہوں نے ممالکِ متحدہ امریکہ کے پیٹنٹ آفس کے حالات لکھ کر یہ بتایا ہے کہ مختلف ایجادوں میں عورتوں نے کیا کچھ حصہ لیا ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ عورتوں کے ایجاد مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لیکن اُنکی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور یہ کہ وہ ایجاد محض گھر کی ضروریات اور معمولی اشیاء کے متعلق نہیں ہیں بلکہ فنِ تجارت سائنس اور دیگر علوم وفنون کی بابت بھی ہیں۔ اخیر میں جو رپورٹ مس اینڈرسن صاحبہ نے دی ہے اس سے مندرجہ ذیل نتیجے نکلتے ہیں۔

**اوّل** - باوجود اس امر کے کہ عورتوں کو ایجاد کے بارہ میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے مگر اس فن میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔ اور ایجاد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں عورتوں کے لئے خاص خاص سہولتیں مہیا کرنی چاہئیں تاکہ اُنکو اپنے ایجاد کے پیٹنٹ کرانے اور بیچنے میں کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے۔ دوسرے چونکہ عورتوں کے پاس عام طور پر روپیہ حاصل کرنے کے وسیلے مردوں سے کم ہوتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں خاص طور پر اُن کی مدد کی جائے تیسرے اگر اشیاء کے پیٹنٹ کرانے اور اُن کے فروخت کرنے کی مشکلات کم ہو جائیں۔ اور ایجاد و اختراع کے وسیلے بہم پہنچانے میں زیادہ آسانی ہو تو دنیا عورتوں کی اختراعی قوت سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کر سکے۔

محمد رفیع بیگم

---

اس مرتبہ لیجسلیٹو اسمبلی نے اس تجویز کو منظور کر لیا ہے جسکی رو سے عورتوں کو وکالت کرنے کا حق ملتا ہے اس منظوری سے سب سے پہلے مس ہازرہ یوپی، مس سوبھا بہار میں اور مس ٹاٹا مدراس میں مستفید ہوئیں مس سوبھا کا نام پٹنہ ہائی کورٹ کے زمرۂ وکلا میں درج ہو چکا ہے۔

# خیالات

مجھے گانا نہیں آتا اے آقا! اور میں سنتا ہوں کہ تجھ تک باریاب ہونگی وہی لوگ راہ پاتے ہیں جو تیری فرصت کی آزاد و عمیق ساعتوں کو اپنی راگنیوں سے معمور کر دیں!

گانے والے اپنے ساز تال و سم کے ساتھ بجاتے ہیں اور میری بے سُری صداؤں پر تیوری چڑھاکر سرزنش کرتے ہیں کہ تو عرصۂ حقیقت کو ابھی اپنے نغمۂ خام کی جولانگاہ نہ بنا بلکہ وہ خلوت میں بھی جب مجھے گنگناتا سُن لیتے ہیں تو اُسے تیری تضیعِ اوقات کا موجب قرار دیکر برہم و پریشاں ہوجاتے ہیں +

اے آقا! میں جانتا ہوں کہ مجھے گانا نہیں آتا لیکن یہ سمجھ کر کہ شائد تیرے در تک رسائی اُنہیں لوگوں کو ہے جو اپنی مطربانہ ریاضت کو تیرے حضور پیش کریں میں بھی ایک نغمہ چھیڑنے کی جرأت کرتا ہوں کہ شائد ہزاروں لاکھوں صداؤں کے ہجوم میں میری کمزور آواز کو بھی ایک لمحہ کے لئے سُن لیا جائے" کیونکہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ اگرچہ تو اکثر اُن پُرپیچ و دقیق راگنیوں پر جو دُور دراز دُنیاؤں کے کونے کونے سے تیری طرف اُمڈی چلی آتی ہیں۔ شائد قبولیت کے طور پر مُسکرا یا کرتا ہے تجھے ہمیشہ ننھے ننھے بچّوں کی بے ربط ہنسی اور رنگ رنگ کی تیتریوں کے نازک پروں کی تھرتھراہٹ بھی تڑپا دیتی ہے اور تو اُن مسلسل نغموں کو سُنتے سُنتے اچانک رُک جاتا ہے اور ایسی شکستہ آوازوں پر ہمہ تن گوش ہوجاتا ہے جنہیں نقادانِ فن لائق التفات بھی نہیں سمجھتے!

تیری اس وسیع دُنیا میں اے آقا! کوئی دل ایسا نہیں جس سے میں اُن نغموں کو سیکھوں جو تیری نذر کے قابل ہوں، میں تو اُن ہزاروں لاکھوں صداؤں کو جو ہر روز تیرے لئے بلند ہوتی ہیں سُن سُن کر مایوس و بیدل ہوجاتا ہوں کہ ایسا راگ جو لبریز رقت ہو کر فضائے غیر محدود کو چیرتا ہوا تیری محبت گاہ تک جا پہنچے میرے نصیبے میں نہیں + اتنے میں شام تیری مئے ارغواں کو اپنے جام سیاہ میں چھلکائے آتی ہے۔ میں رات کی تاریک خاموشی میں اپنی تنہائی سے متاثر ہو کر رو پڑتا ہوں اور چلا اُٹھتا ہوں کہ ہائے مجھے گانا نہیں آتا!——

تو مجھے اپنے پہلو میں لے لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں اسی التجائے درد کا منتظر تھا"!

---

وہ خوشیاں جنکا انجام اضمحلال میں ہے چند ساعتیں یا کچھ دنوں زندہ رہکر اپنے ساتھ مجھے بھی مُردہ دل بنائے

دیتی ہیں اور اس لئے میں اُس بند کلی کی مسرت کا جوئندہ رہتا ہوں جو حیاتِ چند روزہ کے دوران میں پھول نہیں بنتی بلکہ عین اُس وقت شگفتہ ہوتی ہے جب انسان کی روح اک نکہتِ شیریں کی مانند فضائے محیط میں صعود کر جائے!

اے تو حقیقی و غیر حقیقی خوشیوں کے سرچشمہ! میری جان کو قہقہہ خیز خوشی کی سختیوں سے بچا لے اور اُسے اس تفکر میں مستغرق رہنے کی توفیق دے جو انہماکِ نفس کو دائمی مسرت کا ہدیہ پیش کرتا ہے!

یہ چند روزہ خوشیاں جلد ختم ہو کر میرے نفس کو دُکھ دیتی ہیں۔ تو مجھے وہ ہمیشہ قائم رہنے والا سکون عنایت کر جو خواب آور ہو۔ نہ ایسی کیفیت جو میرے شب و روز کو اپنے جھگڑوں جھمیلوں سے کاوش و بیداری کا سبق پڑھاتی رہے!

اے آقا! اس دولت و عشرت کی غلامی سے میں رہائی کب پاؤنگا اور تو کب اپنے کھوئے ہوئے خادم کو ڈھونڈ کر اُسے اپنا نورانی چہرہ دیکھنے کی سچی خوشی عنایت کریگا؟

---

کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ عشرت کی اس غلامانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر اپنے آزاد و سبک رو بھائیوں کے زمرے میں جا ملوں! عسرت کا مُنہ دیکھوں اور قناعت سے پیار رلوں، حادثاتِ زندگی سے بے خطر ہو جاؤں اور زمانے کی اونچ نیچ کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ لوں، دُنیا کی بے اعتنائیوں پر مُسکراؤں اور دوستی کو سختی کی کسوٹی پر پرکھ کر جھوٹا ثابت کر دوں!!!

لیکن عشرت کی محبت آہ! اس غلامی کی اُلفت پیچھا نہیں چھوڑتی کہ اپنے نفس سے رہائی ہو، وہ سو سو بہانے ڈھونڈتی ہے۔ کہتی ہے تیرے اقربا تیرے ایثارِ نفس پر دنیا کی سختیاں کیوں جھیلیں، بلکہ خود مجھے تنگی کی خوفناک تصویریں دکھا دکھا کر تنبیہ کرتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ تھوڑی مُدت تو اور اس زندگی سے حظ اُٹھا لے یا اس طرح مناتی ہے کہ اگر متعلقین نہ ہوتے تو اُس حالت میں اچھی طرح سے اس زریں اصول پر عمل کیا جاتا

اس پر پھر پرانی روش کا مقلد ہو کر میں دولت و عشرت کے قدموں میں لوٹ جاتا ہوں اور اک کم مایہ وصل کی چاشنی سے مدہوش ہو کر اپنے تئیں کھو دیتا ہوں، ہاں! جب کبھی بھولے بھٹکے وہ بھلی ساعت پھر آجاتی ہے تو دل اک لمحے کیلئے اپنی بدبختی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے اور کہتا ہے "ہائے اس دُنیا کی زندگی!"

بشیر احمد

# اردو نظم ہندی بحروں میں

جیسا کہ ملکی زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کا قابل سے قابل اور جاہل سے جاہل آدمی اسے سمجھ اور بول سکے۔ بالکل یہی اصول ہمیں کسی ملک کی شاعری کے لئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایسی سہل الحصول ہو کہ اُس ملک کا ہر فردِ عام اس سے کہ وہ اعلیٰ تعلیمیافتہ ہو یا مطلق جاہل اپنے فطری جذبات کو موزوں کر سکے۔ جو شاعری صرف اچھے پڑھے لکھوں کا حصہ بنی رہے، اجسے ملک کا اُجڈ دیہاتی طبقہ اختیار کرنے اور سمجھنے پر بھی قادر نہ ہو حقیقتہً وہ شاعری اس ملک کی شاعری اور اُس شاعری کی زبان اُس ملک کی زبان نہیں کہی جا سکتی۔ کسی ملک کی شاعری اگر اس ملک کی عام زبان ہیں اور اس ملک کے طبعی حالات کے مطابق ہو تو اُس ملک کے وہ شاعر جن پر شہری زندگی کا اثر نہیں۔ جنہیں تمدن کی ہوا تک نہیں لگی زیادہ گرانقدر اور فطرت نگار ہوتے ہیں، اُن شعرا کی بہ نسبت جو تمدن کی مصنوعی رنگینیوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ عرب کی شاعری اس دعوے کی زندہ شہادت ہے۔ عرب جبتک خانہ بدوشی اور صحرانشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ جبتک قدرت کے حقیقی مناظر اُنکے پیش نظر رہے جبتک اُن کے ہاں لکھنا پڑھنا جرم سمجھا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ انکی شاعری عرب کے جغرافی حدود کو بدلتی رہی۔ اُنکی معجز بیانیوں نے اپنے سوا تمام دنیا کو عجم (گونگا) کا خطاب دیا۔ مردوں کو چھوڑ کر اُن کی عورتوں اور بچوں نے اپنی سحر بیانیوں سے باقی دنیا کے مرد شعراء کو مات کر دیا لیکن جب سے ان میں تعلیم اور شہری زندگی کی ابتدا ہوئی انکی شاعری میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ عباسیوں کی سلطنت میں آکر وہ بالکل عجمی ہو گئے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ تمدن کی فراوانیاں اپنے جلو میں۔ تکلفات۔ تصنع اور بناوٹ رکھتی ہیں۔ فطرت کی سادگی جاتی رہتی ہے۔ اور شاعری جب تک نیچرل ہے وہ اصلی معنوں میں شاعری ہے اسکے بعد وہ شاعری کی بجائے تفننِ طبع اور خیال بندی ہو جاتی ہے۔ شاعری نہیں رہتی۔ شیکسپیئر اسی لئے اپنی قوم کے لئے اس ۳۲ کروڑ کی بستی سے زیادہ گراں قیمت سمجھا جاتا ہے کہ وہ فطرت کا سب سے بڑا مصور مانا گیا ہے۔ انسان اپنے فطری جذبات موزوں کرنے میں جس درجہ کامیاب ہوگا اسی حد تک اسکی شہرت میں پر پرواز

پیدا ہوں گے اور فطری جذبات۔ اپنی ملکی زبان۔ ملکی حالات۔ اور ملکی خیالات میں زیادہ دل آویزی۔ زیادہ دلکشی اور خوبصورتی سے نظم ہو سکتے ہیں۔ تو کیا ہماری اُردو شاعری بھی ہماری ملکی شاعری کا نام پانے کی مستحق ہے؟ اس کا جواب ہندو مسلم سوال سے بہت بلند ہو کر۔ اپنی ذاتی پسند سے کوسوں دور رہ کر دیجئے۔ میرے خیال میں غیر جانبدار بن کر آپ اسکے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ "نہیں" اُردو شاعری موجودہ صورت میں ملک کی اصلی شاعری قطعاً نہیں ہے اگر اُردو شاعری یہی ہے کہ "وقتِ انصاف ہے ابرِ کرم لطفِ بتاں ۔ شاخِ نخلِ چمنِ طرزِ فغاں سوکھ گئی"،

تو یہ شاعری سرحد کے آزاد قبائل کی ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک سے تو قطعاً بیگانہ ہے۔ تم اسکے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہو؟ جب تم دیکھ رہے ہو کہ اردو شاعری دیہات اور جنگلوں سے بیر رکھتی ہے لاکھوں دیہاتی اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ بچے تو الگ رہے شہروں کی تعلیمیافتہ عورتوں کے لئے بھی اُردو شاعری ان کہنی بات بنی ہوئی ہے۔ اس ۳۳ کروڑ کے وسیع رقبے میں تین سو عورتیں بھی اُردو شاعری کے میدان میں نہیں نظر آتیں حالانکہ دیہاتی عورتوں اور دیہاتی بچوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو گاتا نہ ہو۔ تو کیا کبھی تم نے انکے گیتوں کو سُنا ہے اور سُن کر غور کرنے کی تکلیف گوارا کی ہے؟ کہ وہ کس زبان کن اوزان میں ہوتے ہیں؟ کیا تم نے انہیں کبھی غالب کی غزلیں گاتے سُنا ہے، یا کبھی تم نے انکے کسی گیت کو "مفاعیلن مفاعیلن ہشت بار" پر تقطیع کر کے دیکھا ہے۔ انکی کوئی نظم "بحرِ رجز و رمل" اور ان کے بے شمار زحافات پر کبھی پوری اُترتی ہے؟ اگر اسکا جواب نفی میں ہے تو کیوں؟ کیا اُردو کے مروجہ اوزان ہندوستانی شاعری کے لئے اصلی سانچہ بن سکتے ہیں؟ اگر بن سکتے ہیں تو کیوں نہیں اردو شاعری میونسپلٹی کی حدود سے تجاوز کرتی؟ اور اگر مروجہ بحریں ہمارے ملک کی شاعری کے لئے بدیشی ہیں تو کیا اصلیت کی جانب قدم اُٹھانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے؟۔ میرے خیال میں ہر ہندوستانی شاعر اور ہر اُس شخص کو جو ہندوستانی ادبیات سے دلچسپی رکھتا ہے اس سوال پر ایک غیر جانبدارانہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سوال یہ نہیں ہے، کہ اُردو نظمیں کن اوزان پر ہمیں اچھی معلوم ہونگی۔ بلکہ یہ کہ حالات کا اقتضا کیا ہے؟ مجھ سے پوچھئے تو اردو نظموں کو ہندی آمیز بنا کر ہندی دوھروں کے اوزان میں منتقل کرنے کی کوشش میرے لئے نشتر بر جگر ہوگی مگر وقت اور مصلحت کا فرمان میری آپکی خواہشوں کے ماتحت

نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم نے اُردو کو فارسی عربی الفاظ کا مجموعہ بنانے پر اصرار جاری رکھا۔ اسکی شاعری کو اس طرح غیر مُلکی اوزان کا پابند بنا یا گیا۔ تو ہمیں اُس خونریز تصادم کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے جو مستقبل میں اردو مٹانے کے لئے کیا جائیگا۔ اور جس کی ابتدائی تیاریاں تقریباً ہر گوشے میں ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلے ہمیں اردو زبان کو غیر مُلکی ثقیل الفاظ سے پاک کر کے ہندوستانی بنانا چاہیئے۔ اردو شاعری کو مُلکی حالات کے مطابق کر کے ہندوستانی شاعری کے قالب میں ڈھالنا چاہیئے۔ ہماری شاعری ہندوستانی شاعری اسی وقت ہو سکتی ہے کہ اسکی زبان ہندی آمیز ہو وہ ہندی وزنوں میں ہو۔ وہ ایسی ہو کہ اس میں ہر ہندوستانی اپنے جذبات آسانی سے موزوں کر سکے۔ جاہل سے جاہل اور گنوار سے گنوار اگر وہ شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے اس میں گُن گُنا سکے۔ میں ولی دکنی کی قائم کی ہوئی عمارت کو یکسر منہدم نہیں کرنا چاہتا۔ نہیں موجودہ اُردو نظم اپنے مروجہ وزنوں میں ہو اور ضرور رہو۔ لیکن ولی کی اس جدت پر اس قدر فریفتگی کو بھی میں اُردو شاعری کے لئے مہلک تصور کرتا ہوں کہ مُلکی حالات اور مُلکی مصلحتوں سے بے نیازی برتی جائے۔ ولی نے تفنن طبع کے طور پر اُردو نظم کو ہندی وزنوں کی بجائے فارسی بحروں میں ڈھالا لیکن اسکے بعد اُس کی عالمگیر پیروی نے سچ یہ ہے کہ اردو کو اپنے کروروں ہمدردوں سے محروم کر دیا۔ میری اس تجویز نے کہ ہندی زبان میں سے سنسکرت کے ثقیل الفاظ نکال کر ہندی ہی کو عام ملکی زبان قرار دیا جائے صرف اسکا کیریکٹر فارسی رکھا جائے۔ میرے بہت سے مسلمان دوستوں کو ناراض کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ میری اس کوشش کو بھی کہ اُردو شاعری ہندی اوزان میں ہو کل قابل نفرین ٹھیرایا جائے۔ لیکن میں تو اس امر میں دوستوں کی لعنت و ملامت سے اسی قدر بے خبر رہنا چاہتا ہوں جس قدر مریخ کی مخلوق دنیا سے۔

اردو شاعری کو مُلکی شاعری بنانے کی کوشش کرنا ہر شاعر کو اپنا فرض سمجھنا چاہیئے اگر مُلک کے دس سر بر آوردہ اردو شاعر بھی اُردو نظمیں ہندی وزنوں میں کہنا شروع کر دیں تو ایک ہی سال میں ہندوستانی جذبات کا سیلاب دجلہ کی بجائے گنگا کے رُخ بہنے لگیگا۔ اگر اس کے جواز پر شعرائے سلف کا فتوے درکار ہے تو اُردو کا خدائے سخن میر اور ملک الشعرا سودا۔ دونوں اسکے جواز پر دستخط کر چکے ہیں۔ سودا اور میر کی بعض مثنویاں رامائن کے وزن میں کہی ہوئی ہیں۔

میر کی کئی غزلیں ہندی وزنوں میں موجود ہیں۔ انہیں پڑھ کر یہ تجربہ بھی ہوا کہ ہندی وزنوں میں اگر اردو نظم بہت شیریں اور پُر اثر ہو جاتی ہے۔ فارسی عربی وزن میں نظم آرائی کرنا کوئی مذہب کا حکم نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی مذہبی جرموں میں شمار کرا دیگی۔ فارسی عربی اوزان ہمارے مُلک کے ہمارے حالات کے اور ہماری شاعرانہ فطرت کے خلاف ہیں پھر کیوں نہ ہم اپنی زبان کی شاعری کو اس طوق و زنجیر سے آزاد کریں۔ کیوں نہ اپنی شاعری کے لئے فطری سہولتیں مہیا کریں۔ وہ زمانہ متحدہ ہندوستان کے لئے کس قدر مبارک ہوگا جب ۳۳ کروڑ ہموطن یکدل و یک زبان ہونگے۔ جب ہماری شاعری ملکی حالات کے زیر اثر مُلک کے ہر گوشہ میں جذبات حب الوطنی پھیلا رہی ہوگی۔ ذیل میں میر تقی مرحوم کی ہندی وزن میں کہی ہوئی سینکڑوں اردو غزلیات میں سے چند غزلوں کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں +

ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ　　جان عزیز گئی ہوتی کاش ایک سال بہار کے ساتھ
وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑی تھی جب اُس سے　　چاہ نکلتی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ

تم کو ہم سے لاگ لگی ہے روتے ہیں تو ہنستے ہو　　ہم نے کمر کو کھول رکھا ہے اپنی کمر تم کستے ہو

دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤنگا　　چہرے سے خوناب ملونگا پھولوں سے گل کھاؤں گا
خاک ملا منہ، خون آنکھوں میں، چاک گریباں تا دامن　　صورت حال اب اپنی اُسکے خاطر خواہ بناؤں گا

چاہت کا اظہار کیا سو اپنا حال خراب ہُوا　　اس پردے کے اُٹھ جانے سے اُسکو ہم سے حجاب ہُوا
شیخ حرم سے لڑکے چلا ہوں، اب کعبے میں نہ آؤنگا　　تا بتخانہ ہر قدم اوپر سجدہ کرتا جاؤں گا

کیا کہئے کچھ بن نہیں آتی جنگل جنگل ہو آئے　　چھاؤں میں جا کے ببولوں کی ہم عشق و جنوں کو رو آئے
دل کی تلاش میں اُٹھ کے گئے تھے شاید یاں پیدا ہو سو　　جان کا اپنی گرامی گوہر اُس کی گلی میں کھو آئے

# نکولو میکیولی اور اُس کا فلسفہ

یونان کے مایۂ ناز حکما افلاطون و ارسطا طالیس کے بعد جن کی شہرۂ آفاق تصانیف نے فلسفۂ سیاسیات کی بنیاد ڈالی، اس فن سے بحیثیت ایک مستقل علم کے بحث کرنیوالوں میں کسی شخص کو اس قدر شہرت حاصل نہیں ہوئی، جتنی سرزمین اطالیہ کے ایک محبِ وطن نکولو میکیولی کو۔ اگرچہ اس نے مختلف مباحث پر بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں۔ ناول۔ ڈراما۔ سیاسی مراسلات اور ذاتی خطوط، غرضکہ لٹریچر کی کوئی ایسی شاخ نہیں ہے جو اُسکے رشحات دماغ سے بار آور نہ ہوئی ہو۔ لیکن حیرت افزا امر یہ ہے کہ اُسکی شہرت اور بقاء دوام کا باعث ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس کو خود اُس نے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، اور جس میں بقول ڈیوڈ ہیوم کے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جس کو ہر شخص نہ جانتا ہو۔

میکیولی ۳ مئی ۱۴۶۹ء کو فلارینس میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۷ء میں اُس نے انتقال کیا چودہ برس سے زیادہ وہ جماعت صلح و آزادی کا امین خاص رہا۔ یہ جماعت فلارینس کے تمام فوجی و ملکی معاملات کی نگران و محافظ تھی۔ داخلی و خارجی انتظامات و معاملات کے متعلق جس قدر خط و کتابت ہوتی تھی وہ میکیولی کیا کرتا تھا، اور یہ فرائض اُس نے اس قدر خوبی کے ساتھ انجام دئے کہ اُس کے سیاسی تجربات سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے اُسکو کم از کم ۳۵ سفارت ہائے خارجیہ پر مامور کر کے بھیجا گیا اور جمہوریہ فلارینس کے ماتحت جو ریاستیں تھیں اُنکے تصفیہ طلب معاملات کا فیصلہ اور عہدنامجات کی ترتیب اسی کے توسط سے ہوا کرتی تھی۔ اُسکے سیاسی مراسلات جو ۱۷۶۷ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوئے نہایت دلچسپ اور بیش قیمت معلومات سے لبریز ہیں۔ اُس کی سیاسی زندگی کا زمانہ ملک اٹلی کی تاریخ کا وہ تاریک دور ہے، جبکہ ملک بیرونی دشمنوں کی باہمی رقابت اور ہنگامہ آرائیوں کا دنگل بنا ہوا تھا۔ فرانس۔ اسپین اور مقدس سلطنت روما کے فرمانروایان سینر زداگسٹس کی سرزمین پر جنگ آزمائی کیا کرتے تھے تمام ملک چند خود مختار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، اور اُن میں باہمی کوئی رشتہ یگانگت یا موانست نہیں تھا۔ بعض حصے فرانس۔ ہسپانیہ اور آسٹریا کے زیر تسلط تھے۔ غرضکہ ملک

اس وقت علمی، سیاسی اور قومی انحطاط کے اُس دور میں سے گذر رہا تھا، جبکہ افراد قوم میں جذبۂ وطنیت یا احساس قومی بالکل مردہ ہو جاتے ہیں، اور اعلیٰ مقاصد و بلند مطامح نظر تک پہنچنے سے پہلے اُن کی پست بین آنکھوں میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہے +

اس زمانہ میں اُسکو دو مرتبہ سیزر بورجیا کی خدمت میں باریابی حاصل ہُوئی۔ جن لوگوں کو پاپایانِ روم کی پُراسرار زندگی، اور تقدس و روحانیت کے پردہ میں نہایت مکروہ اور شنیع افعال کے ارتکاب کا کچھ علم ہے، وہ شاید اس انسان کے محیرالعقول کارناموں کو سُن کر، اور اُس کی انسانی جذبات سے یکسر معرا زندگی کا حال پڑھ کر، انگشت بدنداں نہ ہوں، اس لئے کہ اُنکو معلوم ہے کہ جن تاثرات کے ماتحت اُس کی نشوونما ہُوئی تھی، اُن کا لازمی نتیجہ ایسی ہی ہستیوں کا عرصۂ وجود میں آنا تھا۔ لیکن جو لوگ یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کا سطحی مطالعہ کرنے سے قبل رینالڈز کے مشہور ناول و رومان، فاسٹ کو پڑھتے ہیں، اُنکے دل پر الگزنڈر بورجیا، سیزر بورجیا اور لوکریزا کے کارناموں کا جو حیرت انگیز اثر پڑتا ہے، وہ ناقابل بیان ہے، انکو یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ دنیا کی امن و عافیت اور انسان کی روحانی مسرت و اطمینان قلب کے لئے شیطان کا وجود زیادہ خطرناک ہے یا اس خاندان کا، جسکا ہر فرد وساوس شیطانی اور صفات طاغوتی کا ایک مجسم نمونہ نظر آتا ہے۔

اول موقعہ ملاقات کا وہ تھا جب بورجیا نے اپنی عدیم المثال چالاکی کی مدد سے ایک نہایت عظیم الشان کامیابی حاصل کی تھی، اور اپنے تمام حریفوں کو ایک ہی دام میں گرفتار کر کے ایک ہی جھٹکے میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ دوسری ملاقات اُس وقت ہُوئی تھی جب وہ بیماریوں سے تباہ و خستہ حال ہو کر، اور ناکامیوں و نامرادیوں سے عاجز آکر، اپنے خاندان کے سب سے زبردست دشمن کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ اپنے مراسلات میں میکیولی نے یہ واقعات بالتفصیل درج کئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان دونوں شخصوں میں گہری دوستی اور مرافقت تھی، اور میکیولی کے سر یہ الزام تھوپا جاتا ہے کہ اس کے افعال شنیعہ اور حرکات مذمومہ کا محرک وہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن سرکاری کاغذات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ملاقاتیں [illegible] اگرچہ بظاہر اتفاق و مراسم دوستانہ پر مبنی نظر آتے تھے، لیکن حقیقت

میں وہ معاندانہ و مخالفانہ پہلو لئے ہوتے تھے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ میکیولی کے دماغ نے ان صحبتوں کا بہت اثر قبول کیا، اور یہ تو ایک قدرتی بات تھی کہ حکومت و طریقہ حکومت کے متعلق اُس کے خیالات ایک ایسے شخص کی رائے کا عکس ہوں جس نے نہایت مخالف حالات و اسباب کے مقابلہ میں درخشاں کامیابیاں حاصل کیں۔ سیزر بورجیا وہ شخص تھا، جسکے قوائے دماغی کو جب خواہشاتِ نفسانی سے تحریض و تحریک نہیں ہو سکتی تھی، تو حصول سلطنت اور دشمنوں سے انتقام لینے کے عزم سے وہ اپنی بے چین طبیعت کو آمادہ کار بناتا تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جو کلیسائے روما کے پرعیش، اور قوائے عمل کو شل کر دینے والے ماحول سے نکلکر بادشاہ اور جنرل ہوا۔ اپنے حیرت انگیز مکروفریب سے دشمنوں کو تباہ کر کے سلطنت حاصل کی، اور پھر اُنہی لوگوں کو جو اُسکے حصول مقصد کا آلہ بنے تھے، تباہ کر کے بدنامی کے داغ کو دھونا چاہا اور نیکنامی حاصل کرنیکی کوشش کی۔ اُسکے بعض افعال کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرتے وقت، ہمکو یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ وہ پندرھویں صدی کا ایک اطالوی تھا، اور اُس زمانہ میں اُسکے جرائم اُس معیار اخلاق سے نہیں جانچے جاتے تھے، جس سے وہ اب پرکھے جاتے ہیں۔ اُس کی موت پر میکیولی نے جو افسوس کیا ہے، وہ ممکن ہے کہ جذبات حب الوطنی پر مبنی ہو، جنھوں نے اُسکو ایک ایسے شخص کی موت پر اظہارِ حسرت و غم کرنے پر آمادہ کیا ہو، جو مُلک اطالیا کی خود مختاری کو قائم رکھنے اور اغیار کی دستبرد سے بچانے کا اہل تھا، اور اُن لوگوں کا مقابلہ کر سکتا تھا جو اُس کے مُلک کے حصّے بخرے کرنے پر تلے ہوئے تھے

اپنے مُلک کی حفاظت میں میکیولی نے بھی اپنے مقدور بھر حصّہ لیا۔ مُلک کی بربادی اور کمزوری کے اسباب اور اُن کا دفعیہ اُس نے اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ نظام فوجی کی خرابی اور بے ترتیبی نے اطالویوں کو یہ روز بد دکھایا ہے، کہ ملک خود مختاری سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اجانب کی حرص و آز کا شکار ہو رہا ہے۔ اُس نے کرایہ کی فوجوں سے لڑنے کا طریقہ، جو ملک میں عام ہو رہا تھا، بالکل منسوخ کر دیا، اور ایک قومی فوج قایم کی۔ اس مقصد کے لئے اُس نے فن جنگ کا بغور مطالعہ کیا، اور اُس کے تمام اصول اور جزئیات پر بخوبی حاوی ہو گیا۔ اُس کی یہ کوششیں جو دانشمندی اور جوش حب الوطنی پر مبنی تھیں

بہت کچھ مفید ثابت ہوئیں۔ لیکن اٹلی اُس وقت ایک طرف تو بیرونی خطرات سے گھرا ہُوا تھا اور دوسری طرف سیاسی جتھابندی و اتحادِ عمل کے فقدان نے اندرونی خدشات پیدا کردئے تھے، چنانچہ وہ اپنی اسکیم کو پورے طور سے عملی جامہ پہنا بھی نہیں سکا تھا، کہ ۱۵۱۴ء میں فلارینس کی جمہوری سلطنت کا چراغ گُل ہوگیا، اور پوپ وامپرر کی مدد سے میدیسی کی شخصی حکومت قائم ہوگئی۔ میکیولی کی تکالیف و مصائب کا دور اب شروع ہُوا۔ اُس کے تمام مناصب اُس سے چھین لئے گئے اور بالآخر فلارینس سے نکلجانے کا اُسکو حکم دیا گیا +

اس طرح اُس کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہُوا۔ اب اُس نے اپنے وطنی گاؤں میں سکونت پذیر ہوکر اس جبریہ فرصت کو مطالعہ اور تالیف میں صرف کیا۔ اگرچہ اُسکو حکومت کی جانب سے سخت اذیتیں دی گئیں، یہانتک کہ ایک سازش میں شرکت کے جرم میں اسکو داخلِ محبس بھی کیا گیا، لیکن ان تمام مصائب کو میکیولی نے نہایت صبر و استقلال سے برداشت کیا چنانچہ وہ خود کہتا ہے "قریب تھا کہ میں اپنی زندگی کو خیرباد کہدوں، لیکن خدا نے اور میری بیگناہی نے مجھکو بچایا، میں نے قید اور دیگر مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا" ان واقعات سے اُس کی غیر معمولی شجاعت و شہامت اور عدیم النظیر ثبات و استقلال کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ یاس و نااُمیدی سے گھبرانے کے بجائے اُس نے اپنی قسمت کو مطالعہ کتب و تعلیمی شغف سے بلند کرنیکا ارادہ کیا۔ اکثر اُسکو فلارینس کے علما و فضلا سے اپنے مسودات کے متعلق بحث کرنے اور مشورہ لینے کا بھی موقعہ مل جاتا تھا۔ اپنی عمر کے آخری زمانہ میں اُس نے حکمرانِ فلارینس سے مصالحت کرلی، اور جلاوطنی کی مدت ختم کرکے فلارینس واپس آیا۔ اور یہاں کی تاریخ ترتیب دینے میں مصروف ہوگیا اپنی ملازمت اور سیاسی مصروفیتوں کے دَوران میں اور مختلف ممالک میں سفراء کی حیثیت میں کام کرنے کی وجہ سے اُسکو جو مفید معلومات و تجربات یورپ کے سیاسی و معاشرتی حالات کے متعلق حاصل ہُوئے تھے، اُن سے اپنی تصنیفات میں اُسکو بہت مدد ملی۔ ان واقعات و حالات سے اُس نے جو فلسفیانہ نتائج مستنبط کئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے، کہ اُسکے معلومات و مشاہدات بہت وسیع صحیح اور غائر تھے۔ بخلاف اکثر لوگوں کے جو اپنے علم و مطالعہ سے تجربات حاصل کرنے میں مدد لیتے

ہیں، میکیولی نے اپنے مفید اور وسیع تجربات اور مشاہدات سے اپنی تصانیف میں مدد لی۔ ملازمت سے سبکدوش ہو جانیکے بعد اُس نے اپنا وقت قدیم مورخین کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کیا پلوٹارک کی شہرۂ آفاق تالیف سوانح مشاہیر روم سے اُسکو عشق تھا۔ ایک خط میں وہ خود اپنے شوق و شغف کا اظہار اس طرح کرتا ہے " دن بھر کی پریشانیوں اور تفکرات کے بعد میں نے اپنے گرد آلود کپڑوں کو اتار کر پھینکدیا، اور ایک خلعتِ شاہی پہن کر گویا ان مشاہیر متقدمین کے دربار میں بصد عجز و نیاز حاضر ہوا۔ وہاں میں نے ان زندہ جاوید روحوں سے ہمکلام ہونیکی قابل فخر عزت حاصل کی، اور میرے کام و دہن ایک ایسی غذاء لطیف سے لذت یاب ہوئے، جو صرف میرے لئے ہی مخصوص تھی اور جس سے شیریں کام ہونیکے لئے میں پیدا کیا گیا تھا۔ ان اوقات میں میں تمام دنیوی تفکرات و آلام کو بھول گیا، مفلسی کو سوہانِ روح خیال میرے ذہن سے بالکل محو ہو گیا۔ اور موت کے اطمینان کش خوف سے قطعاً آزاد ہو کر میں ہمہ تن ان برگزیدہ و پاک روحوں کے ہمیشہ زندہ رہنے والے کارناموں کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو گیا، وہ صرف پڑھنے اور غور کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا تھا جو کاہلی و تن آسانی کی بہترین تدبیر ہے، اُسکے قوائے عمل و تشویق کا اُسکو مجبور کرتے تھے کہ میدان عمل میں وہ اپنی دماغی تگ و تاز کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ تصنیف و تالیف تحریر و ترتیب میں وہ پورے شوق اور انہماک کے ساتھ مشغول ہوا۔ حکمران فلارینس نے ملک کی انتظامی و اصلاحی خدمات پر مامور کرکے اُسکو [illegible] اظہار قابلیت کا اور موقعہ دیا۔ معدہ کی شکایت نے اُسکو بہت کمزور کر دیا تھا، آخر کار جون ۱۵۲۷ء کو ملک اٹلی کا یہ مشہور محب وطن، فلسفی، مورخ اور مدبر دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ اطالیہ کا قومی اتحاد اور اسکی سیاسی آزادی کا زمانہ ابھی بہت دُور تھا، اُس کی تاریخ کے صفحات میزینی، گریبالڈی اور کیور جیسے مایۂ ناز فرزندوں کے مخلصانہ و مدبرانہ کارناموں سے ہنوز خالی تھے، لیکن انیسویں صدی کے ان پیغمبرانِ سیاسی و علمبردارانِ حریت نے جس مقصد کی تکمیل کی، اُسکی اہمیت اور ضرورت پندرھویں صدی میں میکیولی کے ذہن نشین ہو چکی تھی، اور اُسکے حصول میں اُس نے اپنے مقدور بھر حصہ بھی لیا ✦

محمد حامی الدین خاں۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر تاریخ
مہاراجہ کالج جے پور

# بنارسی ساڑھی

گاڑی کے چلنے میں ایک منٹ باقی تھا۔ لاہور کو جانے والی گاڑی پرلی طرف کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہوتی ہے اسلئے مجھے پل پر سے گذر کر وہاں پہنچنا تھا۔ بمشکل تمام جب میں وہاں پہنچی تو انجن نے سیٹی دیدی۔ انٹر کلاس کے کمرے کہیں دور تھے۔ گاڑی آہستہ سے ہلنا شروع ہوئی۔ کیا میں آج نہ جاسکونگی؟ میرے نوکر نے جلدی سے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں اسمیں داخل ہوگئی اور اس نے اسباب کی دو تین چیزیں جو تھیں انکو کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کردیا۔ امرتسر کا اسٹیشن آہستہ آہستہ پیچھے رہنے لگا۔

میرے پاس انٹر کلاس کا ٹکٹ تھا اور یہ سیکنڈ کلاس کا کمرہ! کیا مجھے باقی کرایہ ادا کرنا پڑیگا یا مجھے پولیس کے حوالے کردینگے؟ جرمانہ ہوگا۔ میں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیجاؤنگی یا کیا؟

چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں اور میں واپس کالج کو جارہی تھی گو ابھی دو روز مجھے ایک سہیلی کے ہاں رہنا تھا۔ میرے دل پر گھبراہٹ اور خوف طاری تھا کہ یکلخت گاڑی دائیں طرف کے بڑے بڑے کارخانوں کے شور میں سے نکل کر اسٹیشن کی حدود سے باہر آگئی اور بڑی تیز رفتار سے چلنے لگی۔ کیا یہ میل ٹرین تھی؟ اگر تھی تو انٹر کلاس کے مسافروں کو اس میں لاہور تک سفر کرنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ میں نے نوکر کو بھیج کر علی الصبح اسٹیشن سے ٹکٹ منگوالیا تھا۔ اُف! اب کیا ہوگا؟

میں نے خوف زدہ ہوکر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کمرہ خالی تھا۔ اور کوئی مسافر اس میں نہ تھا۔ لیکن خاکی رنگ کا ایک لمبا سا کارڈ بورڈ کا بکس میرے سامنے والی نشست پر پڑا تھا۔ اس کی رسی کھلی ہوئی تھی اور ایک سرا نیچے لٹک رہا تھا۔ بکس کے اوپر موٹے حروف میں "دونی چند بھگوان داس۔ بنارسی پارچہ فروش۔ بنارس سٹی" لکھا ہوا تھا۔ اس میں کیا ہوگا بکس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ساڑھی ہوگی۔ بنارسی ساڑھی؟ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

مجھے مدت سے بنارسی ساڑھی پہننے کی خواہش تھی۔ خواب میں کئی دفعہ مجھے عمدہ عمدہ بنارسی ساڑھیاں پہن کر پارٹیوں اور کالج کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن ہر دفعہ کچھ دیر کے بعد آنکھ کھل جاتی تھی۔ مجھے اپنا انٹر کلاس کا ٹکٹ بھول گیا اور اس بکس کو کھول کر دیکھنے کی خواہش تکلیف دینے لگی۔ کیا رنگ ہوگا؟ بیل بوٹے کس نمونہ کے ہونگے؟

اپنے دل پر پتھر رکھ کر میں نے مُنہ پھیر لیا اور کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ جی گھٹا چلا جاتا تھا۔ میں نے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ ٹرنک میں سے زنانہ اخبار کا پرچہ نکالا لیکن اسکے پہلے صفحے پر نظر پڑنا تھی کہ اور غضب ہوگیا۔ وہاں بھی بنارسی ساڑھی کا اشتہار تھا۔ "زنانہ مشورہ" خدا جانے کہاں سے طلب کرو۔

بے ساختہ میری آنکھیں اُس خاکی بکس کی طرف اُٹھیں۔ کس کی نہ اُٹھتیں؟ رسی کھلی ہوئی تھی۔ "بنارس سٹی"۔ اگر میں ڈھکنا اُٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں تو کیا برائی ہے۔ کسی کو علم بھی نہ ہوگا۔

میں نے رسی کو علیحدہ کرکے ڈھکنا اُٹھا دیا۔ باریک کاغذ کے کئی تختے ہٹائے۔ پیاز رنگ۔ نہیں ہلکا شربتی۔ اور کیسے بڑے بڑے پھول۔ اور نئے بنارسی کپڑے کی خوشبو۔ کیوں کیسے اور کس طرح پر بحث کرنا فضول ہے۔ میں نے بکس میں سے ساڑھی کو نکال لیا۔ اسکی تہیں کھل گئیں۔ میں نے اسکی نرمی کو محسوس کیا۔ اسے اپنے گھٹنوں پر پھیلا دیا۔ اور سچ کہنا ضروری ہے۔ اُٹھی اپنا دوپٹہ اُتار دیا اور اُسے پہننے لگی۔

ساڑھی کے پلّے کو سر پر لاکر میں نے غسلخانہ کا دروازہ کھولا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ میرے سامنے چوکھٹے میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی جسکے پیچھے کی جانب کھڑکی میں سے روشنی کی شعاعیں چہرے کے ایک طرف پڑتی تھیں۔ اور ایک شعاع قدرے بکھرے ہوئے سیاہ بالوں میں سے گذر کر ناک کی چوٹی پر چمٹ رہی تھی۔ کیا یہ میں ہی تھی؟ میں؟

گاڑی کی رفتار یکلخت دھیمی ہونا شروع ہوئی۔ میں غسلخانہ سے نکل کر کمرے میں اپنی جگہ پر آکے بیٹھ گئی۔ مغل پورہ کا اسٹیشن آگیا۔ وقت گذرتا معلوم بھی نہ ہوا تھا۔ مجھ پر خوف طاری ہوگیا۔ اگر بکس کا مالک اس وقت آگیا تو؟ میں نے جلدی سے خالی بکس کا ڈھکنا بند کرکے رسی کو اس پر رکھا ہی تھا کہ کسی شخص نے دروازہ کھولا۔

کیا یہ پولیس کا سپاہی ہوگا؟ اس وقت کوئی بھی میری جگہ ہوتا۔ پرائی ساڑھی پہن کر انٹر کلاس کا ٹکٹ لے کر سیکنڈ کلاس کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے اُسے ضرور پولیس کا خیال آتا۔ وہ خوبصورت نوجوان تھا اور اُسکا لباس بھی نہایت اچھا تھا لیکن ——

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ظاہر کیا کہ میں سو رہی ہوں۔

.......................................

.......................................

گو قصور میرا ہی تھا لیکن پھر بھی ریل والوں کو میل ٹرین ایسے پلیٹ فارم پر ہرگز کھڑی کرنا نہیں چاہیئے جس پر کتب فروش کی الماری نہ ہو۔ میں امرتسر کے اسٹیشن پر اتر کر دوسرے پلیٹ فارم پر گیا اور چند کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ گاڑی چلدی۔ میں بھاگا۔ لیکن میرا کمرہ چونکہ بہت آگے انجن کے قریب لگا ہُوا تھا۔ مجبوراً مجھے ایک اور کمرے میں سوار ہوجانا پڑا۔ میری توبہ ہے۔ آج سے میں بملا کے کسی کام کا ذمہ اپنے سر نہ لونگا۔ یہ عورتیں تو جب ہمیں کہیں جانا ہوجائے سمجھ لیتی ہیں کہ ہم انکے پارسلوں کا چھکڑا ہیں۔ خدا جانے اُسی وقت تمام بھولے ہُوئے کام کس طرح یاد آجاتے ہیں "میرے لئے اس رنگ کی اس نمونے کی اس طرز کی اس پھول کی اس قیمت کی ساڑھی لیتے آنا" ایسا ورباگی ہوئی آرہی ہے کہ بھائی بنارس جاتے ہو تو میرے فلاں لباس کا کپڑا کم ہوگیا ہے فلاں بازار کی فلاں دکان سے اس ساتھ کا آدھ گز کپڑا ضرور لانا ورنہ کبھی نہیں بولونگی" ہمارا دماغ ہے یا مختلف رنگوں پھولوں نمونوں قسموں طرزوں اور تراشوں کا تھیلا ہے۔ اور پھر ہم سے یہ امید بھی رکھی جاتی ہے کہ انکی تمام باتیں ہمیں حرف بہ حرف یاد رہیں ——

مغل پورہ کے اسٹیشن پر میں اُترا اور اپنے کمرے کا جا کر دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے کی نشست پر ایک نہایت حسین لڑکی سو رہی ہے۔ اس نے شربتی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی ہے۔ بالکل اُسی نمونہ کی جو میں اپنی ہمشیرہ بملا کے لئے بنارس سے لایا تھا اور جو اسی کمرے میں بکس میں رکھی ہوئی تھی۔ میں ٹھٹھر کر کمرے سے پیچھے ہٹ گیا اور کچھ عرصہ کھڑا سوچتا رہا کہ کیا اسی کمرہ میں داخل ہوجاؤں یا کہیں اور جا بیٹھوں۔ لاہور میں اُتر کر اپنا

بکس لے لونگا۔ اتنے میں ریل نے سیٹی دی اور چل نکلی۔ میں وہیں سوار ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں آنکھیں اُٹھا کے دیکھتا ہوں تو لڑکی نے ساڑھی کو اُتار لیا ہے۔ اور بڑی احتیاط سے اُسے تہ کر رہی ہے۔ تہ کر کے اُس نے بکس کا۔ میرے بکس کا۔ ڈھکنا اُٹھایا اور اُس میں ساڑھی کو رکھ کر باریک کاغذ لپیٹ دئے اور بند کر دیا۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس میں کچھ شبہ نہ تھا کہ یہ بکس میرا یا دوسرے لفظوں میں میری ہمشیرہ بملا کا تھا۔ اس پر دُکان کا نام لکھا تھا۔ اور ساڑھی بھی وہی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ لڑکی کے چہرے کی طرف میں نے دیکھا تو سُرخ ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کسی طرح گفتگو کی صورت پیدا کرنا چاہیئے۔

میں نے پوچھا "اگر آپ چاہیں تو میں کھڑکی بند کر دوں۔ ہوا آرہی ہے؟"

اس نے مشکل سے جواب میں یہ الفاظ ادا کئے "نہیں۔ آپکی مہربانی۔ مجھے فقط اس ساڑھی کو اُتارنا تھا"

یہ تو ظاہر ہی تھا۔ لیکن اس کا سبب ظاہر نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ اس سے بھی وہ ساڑھی کا بھید نہ کُھلا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس معاملہ کو دوبارہ چھیڑا جائے۔ لیکن طریقے سے۔ میں نے سوال کیا "ساڑھی کے بغیر آپکو سردی لگ رہی ہو گی۔ آپ اسے پھر کیوں نہیں پہن لیتیں؟"

اسکے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا "میں۔ میں۔ پہن تو لیتی اگر میری ہوتی" اور پھر ایک شرم آمیز ہنسی کے ساتھ "جب میں کمرے میں آئی تو یہ اسی جگہ پڑی تھی۔ اور اور۔ میں اسے پہن کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکی ———"

اس سے زیادہ اسکے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ وہ بہت حسین تھی اور گھبراہٹ نے اُسکے عرق آلود چہرے پر ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا تھا۔ خود میں اپنے دل میں بے چینی سی محسوس کر رہا تھا اور اُس پر بکس کے میری ملکیت ہونے کے اظہار کا خیال مجھے اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسکو تسلی دینے کی خاطر کہا ———

"تو اس کا کیا حرج ہے؟"

"لیکن آپ نے مجھے دیکھ لیا!"

میں ہنس دیا "نہیں۔ آپ اسکی کچھ فکر نہ کریں"

"میں پہلے سمجھی تھی کہ آپ شاید پولیس کے آدمی ہیں"

"میں؟ اور پولیس؟"

"کیونکہ میرے پاس انٹر کا ٹکٹ ہے۔ ایک تو میں دیر سے پہنچی اور فوراً مجھے سوار ہونا پڑا۔ دوسرے مجھے علم نہ تھا کہ یہ میل ٹرین ہے"

"یہ قصور کوئی اتنا اہم نہیں ہے۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیجئے گا کہ جلدی میں سوار ہونے کی وجہ سے غلطی ہوئی۔ وہ سمجھ جائینگے۔

واقعی وہ نہایت حسین تھی۔ اور اسکی باتیں کیسی بھولی اور میٹھی تھیں۔ میرے دل میں خواہش تھی کہ اسکے ساتھ مزید واقفیت پیدا کروں۔ پھر خیال آتا تھا کہ خدا جانے آج سے بعد پھر کبھی اس کی صورت دیکھنے کا بھی موقع ہوگا یا نہیں۔ اس خیال سے میرے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔ نہ معلوم کیوں؟ گاڑی سگنل نہ ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے ٹھیر گئی خدا کانٹے والے کا بھلا کرے۔

وہ بکس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا "یہ ساڑھی کس کی ہوگی؟ غالباً کسی سے اتفاقیہ رہ گئی ہے"

میں نے پوچھا "کیا آپکو پسند ہے؟"

"بہت۔ اس قسم کی ساڑھی پہننے کی مجھے مدت سے خواہش ہے"

"اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس بات کو ترس رہی ہوگی کہ آپ اسے پہنیں"

"براہِ مہربانی اس کا ذکر نہ کیجئے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے اب اسے پہن لیا تو اُتارنا دشوار ہوگا"

ایسی ایسی دو چار باتیں ہم کرنے پائے تھے اور میں امرتسر کے اسٹیشن پر گاڑی کو عین مناسب وقت پر چلا۔ میں نے دل ہی دل میں انجن ڈرائیور کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ ٹرین پھر ہلکی ہلکی شروع ہوئی اور متعدد ریلوے لائنوں پر سے کھٹا کھٹ کرتی ہوئی گذر کر متکبرانہ

شان کے ساتھ لاہور کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ میرے دل کو اس خیال سے تقویت تھی کہ شاید وہ لڑکی لاہور میں کچھ عرصہ ٹھیرے یا اسکا وطن لاہور ہی ہو اور پھر کبھی سامنا ہو جائے۔ اتنے میں گاڑی ٹھیر گئی وہ باہر نکلی اور اپنا اسباب ایک قلی سے اٹھوا کر چلدی۔ میں بھی بکس کو وہیں چھوڑ کر اتر لیا اس خیال سے کہ اگر میں نے اسے اٹھا لیا تو لڑکی خیال کریگی کہ بکس میرا تھا۔ وہ گھبرائیگی اور میں یہ نہ چاہتا تھا۔

پلیٹ فارم پر تھوڑی دور جا کر وہ ٹھیر گئی اور پیچھے مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "وہ بکس تو وہیں پڑا رہ گیا۔ کیا میں اسٹیشن ماسٹر سے کہہ دوں کہ اسے لے کے رکھ لے؟" میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں میں اس کا بندوبست کر لونگا"!

اس نے سر ہلایا اور سلام کا اشارہ کر کے اسٹیشن کے دروازے کی طرف روانہ ہوئی۔ اسکا نظر سے غائب ہونا تھا کہ میں واپس ہوا۔ اور بکس کو اٹھا کر اسٹیشن سے باہر نکلا۔ دیکھا تو میری ہمشیرہ بملا کی موٹر کار کھڑی ہے اور اس پر کچھ اسباب بھی پڑا ہے مجھے پہلے تو حیرت ہوئی کیونکہ اُسے میرے آنے کا علم نہ تھا لیکن پھر میں سمجھا کہ شاید کوئی مہمان آیا ہوگا۔ شوفر نیا تھا مجھے جانتا نہ تھا۔ اس لئے مزید یقین کے لئے میں نے اس سے پوچھا "کیا مسز ہیرالال کی موٹر ہے؟" اُسکے سر ہلانے پر میں نے وہ بکس نشست کے نیچے رکھ دیا اور اپنا باقی اسباب بریک میں سے لینے کے لئے واپس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ اتنے میں میں نے ایک پہچانی ہوئی آواز سنی جو کہہ رہی تھی "بس اور کچھ نہیں ہے۔ اب چلو" مڑ کر دیکھتا ہوں تو وہی لڑکی بملا کی موٹر میں سوار ہو رہی ہے۔ ایک لمحے کے بعد موٹر چلدی اور میں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

میں نے اپنا اسباب لیا اور ایک ٹانگہ میں سوار ہو لیا۔ لیکن میرے دل میں آئی کہ جب معاملہ سلجھا تو وہ مجھے کس قسم کا جانور خیال کریگی۔ یہ ضروری بات ہے کہ وہ بملا کی مہمان ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ساڑھی کے بکس کو نہ دیکھے۔ لیکن وہ تو اسکے اسباب کے ساتھ اسکے کمرے میں پہنچا دیا جائیگا۔ بملا مجھ سے اپنی ساڑھی مانگیگی تو میں کیا جواب دونگا؟ عجیب الجھن ہے۔

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

گو بیاہی جانےکی وجہ سے اب اس نے کالج آنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی بملا میری سب سے پیاری سہیلی ہے۔ اس نے ایسے انداز سے میرا خیر مقدم کیا کہ وہ نوجوان مجھے قریباً بالکل بھول گیا۔ اس سے میں انکار نہیں کرسکتی کہ اُسے خدا حافظ کہتے وقت مجھے افسوس ضرور ہوا۔ اگر اسکا ذکر بیچ میں آنا لازم نہ ہوتا تو ساڑھی والا تمام معاملہ بملا کو کہہ سنایا ہوتا۔ کیونکہ گو وہ میری ساڑھی کو پہن کر دیکھنے کی خواہش کو معمولی انسانی کمزوری پر محمول کرتی لیکن ممکن تھا کہ میرا اُس سے باتیں کرنا اُس انسانی کمزوری کا جائز حد سے تجاوز کر جانا خیال کیا جاتا۔ اس لئے میں چپ رہی۔ بہرحال کہنا کیا ضرور تھا وہ ساڑھی اُسکی تو نہ تھی۔

میں اپنے کمرے میں پہنچی اور غسل کرکے کپڑے بدلنے لگی۔ جب میں بالکل تیار ہو چکی تو میری نظر کمرے کے کونے میں ایک سوفے پر پڑی جہاں ایک خاکی رنگ کا لمبا سا بکس رکھا ہوا تھا۔ "دونی چند بھگوان داس۔ بنارسی پارچہ فروش۔ بنارسی سٹی" میرا سر د ہو گئی۔ یہ بکس تو ریل کے کمرے میں رہ گیا تھا اور اس نوجوان نے اس کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا تھا ——

میں نے دوسری بار لیکن اس دفعہ بالکل مختلف وجہ سے اس کی رسّی ڈھیلی کرکے ڈھکنا اُٹھایا۔ وہی ساڑھی تھی۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ مجھے تمام قصہ بملا کو سُنانا ہوگا۔ اور اس نوجوان کا ذکر بھی کرنا ہی پڑیگا۔ بملا سے ملنے کی میری تمام خوشی جاتی رہی۔ میں ساڑھی کے خیال میں گھومتے ہُوئے سر کے ساتھ مڑی اور باہر جانے کے لئے کمرے کا دروازہ کھولا۔

لیکن دروازے کا کھلنا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا اور ہاتھ ہینڈل کے ساتھ زور سے چمٹ گیا۔ ہال میں سے اُسکی آواز آرہی تھی۔ "اجی وہی بکس نا۔ دونی چند بھگوان داس کی دکان کا جس میں ساڑھی ہے —— کھانے کے بعد سہی"

اس سے زیادہ میں نہ سُن سکی اور دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔ تو گویا وہ واقعی خفیہ پولیس کا آدمی تھا؟ اور اسکو مجھ پر شبہ تھا؟ اب تھوڑی دیر میں دروازہ کھٹکھٹایا جائیگا اور مجھ سے سوالات کئے جائینگے۔ مجھے پولیس پکڑ کے لے جائیگی۔ ثبوت بھی تو مکمل ہے۔ اُس نے مجھے ساڑھی کو پہنے ہُوئے دیکھا۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہُوئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا میں لڑکھڑا کے پلنگ تک پہنچی اور اس پر لیٹ گئی۔

نہ معلوم کتنی دیر میں اسی طرح پڑی رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور میں چونکی بملا اندر آئی " آؤ کھانا تیار ہے - ہیں! تم اتنی زرد کیوں ہو - طبیعت تو اچھی ہے ؟"

" نہیں - مجھے ضعف معلوم ہوتا ہے - اور سر گھوم رہا ہے "

" اوہو ! تو ذرا صبر کرو میرا بھائی پریتم ابھی آیا ہے - وہ ڈاکٹری کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے - میں اُسے بلاتی ہوں - سفر کی تکان ہے اور کچھ نہیں " میں نے آہستہ سے سر کو ہلا دیا -

میری طبیعت ضرور خراب تھی لیکن ڈاکٹر میرا علاج نہ کر سکتا تھا - میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ کھلی رکھنے سے وہ بار بار اُس بکس کی طرف جاتی تھیں -

دروازہ پھر کھلا اور بملا کی آواز آئی " پریتم دیکھو تو سہی کیا ہے ؟ اتنے میں ایک خادمہ کے جلدی سے آنے کی آہٹ ہوئی اور اس نے کہا " بابو جی آگئے ہیں اور ایک منٹ کے لئے آپکو بلاتے ہیں " بملا یہ کہہ کر کہ میں ابھی آتی ہوں خادمہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی -

میں نے اپنی آنکھیں کھولیں -

ڈاکٹر - اور خفیہ پولیس کا آدمی اور وہ ٹرین والا نوجوان سب ایک ہی تھے -

میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا " کیسا جھمیلا ہے - میں اسے نہیں لائی لیکن ـــــ یہ خود بخود نہ معلوم کس طرح میرے ساتھ چلا آیا - کسی کو مجھ پر یقین نہ آئیگا - میں نہیں جانتی کہ اسے کون لایا ہے - وہ دیکھو سوفے پر پڑا ہے اور میں نے بکس کی طرف اشارہ کیا " یہی میرا مرض ہے - یہ تمام آفت اس ساڑھی کی برپا کی ہوئی ہے "

" واقعی مجھے بے حد افسوس ہے "

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا - مجھے تو ہتکڑیوں جیل اور کیا کیا کا خیال تھا - اوہ یہ تو معافی مانگنے کھڑا ہو گیا - میرے منہ سے شکستہ الفاظ میں نکلا -

" تو پھر کیا آپکو ...... مجھ ...... پر ...... شبہ نہیں ہے ؟"

" شبہ ؟ وہ کس بات کا ؟ میں تو آپ ...... لیجئے میں آپکو سمجھاتا ہوں -

..............................................

سمجھانے میں مجھے بیس سیکنڈ سے زیادہ عرصہ نہ لگا - اور اختتام تک پہنچنے سے پہلے ہی اُسکے

چہرے پر رنگ آنے لگا اور آنکھوں میں نمی پیدا ہو گئی۔ اس نے بکس کو میرے ہاتھوں میں دیدیا اور مجھے کمرے سے قریباً دھکیل کر باہر نکالدیا۔ "ابھی اسے بملا کے پاس لیجائیے۔ اور کہنا کہ آپ اپنے کمرے سے لائے ہیں۔ جلدی"۔ گلی کے آخیر میں مجھے بملا آتی ہوئی ملی "کہو مریض کا کیا حال ہے؟" میں نے جواب دیا "اُسے بالکل صحت ہو گئی"۔ اسکے چہرے پر حیرانی کے آثار ظاہر ہوئے میری لیاقت کا کوئی اعتراف نہیں کرتا سچ ہے کہ گھر کے ڈاکٹر کی قدر نہیں ہوتی۔ اُس نے پوچھا "تو تم نے اُسے کیا دیا تھا"؟

مجھے اُسے کیا دینا تھا۔ جو دینے کی چیز تھی وہ تو مدت سے وہ لے چکی تھی۔ البتہ اگر کوئی پیغام اور وہ بھی میری آنکھوں نے دیدیا ہو تو اسکا مجھے علم نہ تھا۔

میں نے کہا "بملا یہ لو یہ تمہاری ساڑھی ہے"

مجھے خیال تھا کہ وہ یہ سُن کر خوش ہو گی لیکن بجائے اسکے اسکی پیشانی پر بل آ گئے "واہ کیا آپ لے آئے؟ کل آپکے بھائی ٹھنڈی سڑک پر سے ایک نہایت قیمتی ساڑھی میرے لئے خرید لائے تھے۔ اس پر مُفت میں روپیہ خرچ ہوا۔ خیر اسے میرے کمرے میں بھجدیجئے"۔ میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح دوڑا "تو کیا واقعی تمہیں اسکی ضرورت نہیں ہے؟"

"نہیں۔ لیکن اب آ گئی ہے تو رہنے دو"

"تو پھر اسے آپ میرے ہی پاس رہنے دیں"

"کیوں۔ آپ اسے کیا کرینگے؟"

میں نے جواب دیا "میں اسے ایک لڑکی کو مع اپنے آپکے تحفتہً پیش کرنا چاہتا ہوں"۔ اسکے چہرے پر دوبارہ نااُمیدی کا اظہار ہُوا۔ وہ کہنے لگی "افسوس میرے تمام منصوبے خاک میں ملے جاتے ہیں میں نے تو تمہارے لئے سوشیلا کو انتخاب کر رکھا تھا" میں نے پوچھا "سوشیلا کون؟" اصل بات یہ ہے کہ مجھے اسکا نام بھی تو معلوم نہ تھا۔ کیسا پیارا نام ہے۔

..........................................

کالج میں گئے ہوئے ابھی مجھے دو ہی دن ہوئے تھے کہ میرے بڑے بھائی آئے اور ہماری پرنسپل سے کچھ باتیں کیں پھر مجھے ساتھ لیکر امرتسر کو روانہ ہو گئے دوسرے روز صبح کے وقت میں اپنے کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہی لمبا سا خاکی رنگ کا بکس میری سنگار میز پر پڑا ہوا ہے۔ اس دفعہ مجھے خوف و ہراس کا احساس ہُوا۔ میں نے اُسے کھولکر ساڑھی کو نکالا اور بڑے اطمینان سے پہن لیا۔ اسی بکس میں ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیہ تھی۔ اسمیں سے ہیرے اور زمرد کی انگوٹھی نکلی جسے پہن کر میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

آخر کار مجھے وہ بنارسی ساڑھی مل گئی۔ گو مہنگی ملی۔

عطاء الرحمٰن

# علم الجرائم

## (۲)

سید صاحب کا ہندوستان کے چند ایک مشہور مقامات کی سیر کرنیکا مدت سے ارادہ تھا مگر انکی قلیل آمدنی کا پس انداز کئی سال تک انکے مصارفِ سیاحت کا کسی طور بھی متحمل نہ ہو سکا۔ مگر استقامت اور عزم صمیم میں ایک ایسی طاقت و قوت مضمر ہے جسکے سامنے دنیا کے بلند ترین پہاڑ۔ وسیع صحرا۔ گنجان جنگل طویل و عریض دریا۔ دشوار گذار وادیاں بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ یہی حال سید صاحب کا تھا اگرچہ روپے کی قلت سر بار انکے حوصلے پست کر دیتی تھی مگر آخر کار عزم و استقلال اُن تمام سطحی اور عارضی رکاوٹوں پر غالب آیا۔ جو انکی خواہشِ سیاحت میں دریائے بے پایاں کی طرح حائل ہو رہی تھیں اور وہ مختصر سا رختِ سفر لیکر توکل بخدا اپنے دل کی مدتوں سے دبی ہوئی آرزوں کو پورا کرنیکے لئے دہلی روانہ ہو گئے۔ شاہ صاحب کا حلقۂ دوستی نہایت وسیع تھا کیونکہ وہ نہایت با اخلاق، زندہ دل اور خوش مذاق انسان تھے اور ایسے ستودہ صفات اور اوصافِ حمیدہ رکھنے والے انسان کا اجنبی شہروں میں نہ بھی کوئی واقف ہو تو وہ خود چند روزہ قیام میں ہی اپنے بہت سے مداح اور مددگار پیدا کر لیتے ہیں۔ دہلی کی سیر کے بعد وہ آگرہ پہنچے جہاں انکے ایک قریبی رشتہ دار بسلسلۂ ملازمت قیام رکھتے تھے چنانچہ انہیں کے ہاں ٹھیرے رہے۔ اسکے بعد انہیں بنارس جانا تھا جہاں منڈل گھاٹ پر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کی تعمیر کرائی ہوئی عظیم الشان مسجد دیکھنے کیلئے انکا جی تڑپ رہا تھا جس وقت وہ بنارس پہنچے اُس وقت صبح کے دس بجے ہونگے۔ وسطِ جون کی قیامت خیز لُو سے تمام مطلع گرد آلود ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے اپنا مختصر سا بستر بغل میں دبا کسی سرائے میں ٹھیرنے کی نیت سے شہر کا رُخ کیا۔ وہ بمشکل بیس گز کے فاصلہ پر ہی پہنچے ہونگے کہ کسی نے انکا نام لیکر پکارا مگر اس خیال سے کہ ایسے اجنبی شہر میں جہاں کسی متنفس سے انکی آشنائی تو کجا رسمی سلام و کلام بھی نہیں انہوں نے مُڑ کر نہ دیکھا اور برابر قدم بڑھائے چلے گئے۔ مگر وہ دو چار قدم ہی آگے گئے ہونگے کہ "سید محمد طفیل" کی ایک آواز نے انہیں کھڑا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک نہایت مقدس صورت بزرگ سر پر عربی طرز کا عمامہ لپیٹے ایک لنبا چوغہ پہنے ہاتھ میں تسبیح

لئے اُنکی طرف متبسم نگاہوں سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ پہلے تو شاہ صاحب نے یہی خیال کیا کہ شاید اس سفید ریش بزرگ کو کچھ پہچاننے میں غلطی ہُوئی ہوگی مگر اُنکے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے نہایت بے تکلفی سے "السلام علیکم" کہتے ہُوئے اُنکا ہاتھ مصافحہ کے لئے پکڑ لیا۔ یہ حیران پریشان کہ وطن مالوف سے کالے کوسوں دور اس شہر میں ایسا کون رفیق نکل آیا۔ اتنے میں اُس جہاندیدہ بزرگ نے اُنکی حیرانی و تعجب کو دُور کرنیکے لئے خود ہی کہا "معلوم ہوتا ہے آپنے مجھے پہچانا نہیں۔ میرا نام غلام شہید ہے"

جنابِ غلام شہید ایک طویل القامت فربہ اندام آدمی تھے۔ اُنکا چہرہ سرخی مائل تھا۔ سفید لمبی ڈاڑھی نے چہرے پر ایک قسم کا نور برسا رکھا تھا۔ پیشانی بھاری اور بلند لیکن پُرشکن۔ آنکھیں بڑی ناک لمبی جس کے فراخ نتھنے صاحب موصوف کی مضبوطی بدن کی تصدیق کر رہے تھے۔ ہونٹ پتلے اور سُرخی مائل کشادہ دہن جس میں مضبوط چوڑے جبڑے اور دانت باوجود پیرانہ سالی خوب کام دے رہے تھے۔

سید محمد طفیل نے مصافحہ کرتے ہُوئے نہایت مُودبانہ طریق سے سلام کا جواب دیکر کہا "افسوس ہے کہ میں اب بھی آپکو نہیں پہچان سکا"

مُسن بزرگ کے متین و پُرجلال چہرے سے ایک تبسم عیاں ہُوا۔ پھر آہستہ سے کہا "صاحبزادے میں آپکے والد بزرگوار کا ایک پُرانا دوست ہوں۔ اگرچہ مدت ہُوئی کہ اُنکی طرف سے کوئی خط موصول نہیں ہُوا اور میں بھی اپنی پیرانہ سالی، دُنیا کے مخمصوں اور گھر بار کے دھندوں سے فراغت نہ حاصل کرسکنے کے باعث اپنی خیر و عافیت کی اطلاع نہ بھیج سکا۔ مگر شاید اُنکی زبانی آپنے کئی دفعہ میرا نام تو سُنا ہوگا۔ آپ ابھی بالکل نوجوان ہی تھے جب میں نے پچھلی دفعہ آپکو دیکھا تھا اور اب بھی بڑی مشکل سے پہچانا ہے، کہیئے وہ بخیریت تو ہیں؟"

یہ سنتے ہی شاہ صاحب کے آبگینہ صبر و شکیب کو ایک ٹھیس سی لگی اور اُنکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے پھر بھرآئی ہُوئی آواز میں جواب دیا "افسوس انکے انتقال کو ایک سال سے زائد ہوگیا"

"انا للہ وانا الیہ راجعون" اُس بزرگ کے مُنہ سے نکلا اور پانی کی رُکی ہُوئی ایک رَو تھی۔ کہ اُنکی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ نشیب و فرازِ زمانہ کے مناظر سے بہرہ اندوز آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر سفید و مقدس ریش پر لولوئے آبدار کی طرح بکھر رہے تھے۔ اِدھر سید صاحب آنسو بہا رہے تھے اُدھر وہ پیرمرد رو رو کر اُنکے واجب التعظیم والدِ مرحوم سے اپنی قلبی مؤانست کا اظہار فرما رہے

تھے۔ آخر چند لمحوں تک دل کا بخار نکال لینے کے بعد اُنہوں نے نہایت شفقت سے سید محمد طفیل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "خیر مرضئ مولا از ہمہ اولےٰ۔ دم مارنے کی جا نہیں، اگر چہ مرنا تو سبھی کو ہے مگر ایسے شفیق و غمگسار دوست کی موت جتنا بھی صدمہ پہنچائے کم ہے۔ قدرتِ خدا کے کارخانے ہیں۔ کہنے کو تو میں اُن سے آٹھ نہیں دس برس بڑا ہونگا مگر دیکھئے مٹا کٹا اس دنیا میں ابھی تک آثام و معاصی سے اپنا دامن ملوث کرنے کے لئے زندہ بیٹھا ہوں" پھر آنسو پونچھ کر فرمایا "ہاں یہ تو کہیئے کہ اس شہر میں کیسے آنا ہُوا؟"

شاہ صاحب کے دل میں بدگمانی اور تردد نے ایک دھڑکن پیدا کر دی اور اُنکے دماغ میں برق رفتاری کے ساتھ خیالات زیر و زبر ہونے لگے مگر فقیر صورت بزرگ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی جملہ شبہات فوراً کافور ہو گئے، اُنہوں نے دھیمی آواز میں جواب دیا "میں تو سیر و سیاحت کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ تین دن تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے پھر کلکتہ چلا جاؤنگا"

یہ سُنتے ہی بارعب غلام شہید صاحب کی آنکھوں میں بجلی جیسی چمک پیدا ہو گئی پھر سید محمد طفیل کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا "صاحبزادے آپ بیخبری میں یہاں آتے دو دن چھوڑ مہینوں رہ کر چلے جاتے تو ہمیں افسوس نہ ہوتا۔ مگر یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے والدِ مکرم کے ایک ادنےٰ نیازمند کے شہر میں رونق افروز ہوں اور یوں ہمیں شرمندہ کریں۔ آپکا گھر ہے جتنی مُدت جی چاہے رہیئے ہم پر کوئی بار نہیں۔ آپکو تو معلوم نہیں مگر میں تو جانتا ہوں کہ آپکے والد بزرگوار کے کتنے احسان مجھ پر ہیں، اگر تمام عمر بھی آپکے پاؤں دھو دھو کر پیئوں تو بھی حق الخدمت ادا نہیں ہو سکتا"

سید محمد طفیل کے دماغ میں بارِ دگر چند متناقض خیالات پیدا ہو گئے کیونکہ کسی کے قریبی اعزا و اقارب کی موت کی خبر سُن کر تھوڑے نہ سہی بہت سے آنسو بہانا اور صرف صبر کی تلقین کر دینا کسی کی نیک چلنی، شرافت، محبت اور ایمانداری کا کافی و بین ثبوت نہیں ہو سکتا۔ ادھر ایسی حالت میں جبکہ ایسے اظہارِ غم کرنیوالے کو عمر بھر میں صرف اُسی وقت اور پہلی مرتبہ ہی دیکھا ہو مگر اُنکی مقدس صورت۔ اُن کا مشفقانہ طرزِ تکلم اُنکا شریفانہ لباس اور سب سے بڑھ کر اُنکے زہد و تقوےٰ کا مظہر ماتھے پر محراب سید صاحب کے نوزائیدہ شبہات پر آنِ واحد میں غلبہ حاصل کر گیا۔ اور اس خیال سے انکو اور بھی تقویت ہو گئی کہ میرے ساتھ کونسا لاؤ لشکر یا گرانقدر خزانہ ہے

جس کے لُٹ جانیکا احتمال ہو۔ غرضیکہ وہ ابھی تک اپنے انہیں خیالات کے مابین جنگ کا قطعی فیصلہ نہ کرنے پائے تھے کہ میاں غلام شہید صاحب نے دھڑکتے ہوئے دل کو سینے میں سنبھال کر کہا " لائیے یہ بستر میرے حوالہ کیجئے اور غریب خانہ پر تشریف لے چلئے "۔

شاہ صاحب کے انکار و شکریہ کے باوجود میاں غلام شہید نے زبردستی اُنکا بستر اپنی بغل میں دبالیا اور اُنکے والدِ ماجد کے خصائل پسندیدہ کا نہایت ہی مؤثر اور درد بھرے الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے جہاں ایک پُر رونق بازار میں دو نوجوانوں نے اُنہیں دیکھ کر آداب عرض کیا پھر شاہ صاحب کی طرف نہایت اعزاز و متانت کی نگاہوں سے دیکھکر میاں غلام شہید سے دریافت کرنے لگے " آپکا اسم مبارک "

یہ دونوں نوجوان نہایت سادہ مگر مصفا لباس میں ملبوس تھے۔ ایک اُن میں سے لمبا اور قدرے چھریرے بدن کا آدمی تھا اور سر پر آگرہ کی زریں لیس کی کشتی نما ٹوپی اوڑھ رکھی تھی۔ دوسرا جو ذرا بھاری اور پستہ قد نوجوان تھا عنابی رنگ کی ترکی کلاہ زیب سر کئے ہوئے تھا۔ موخر الذکر ذرا تیز طرار اور نڈر طبیعت کا آدمی تھا اور اُسی نے شاہ صاحب کا نام دریافت کرنیکی جرأت کی تھی۔ چنانچہ غلام شہید صاحب نے نہایت احترام سے سید محمد طفیل کا بلند الفاظ میں اپنے عزیزوں سے تعارف کرایا اور وہ دونوں بھی انہیں کے ساتھ اُلٹے پاؤں چلدیئے۔ سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ تمام ایک متوسط درجہ کے مکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے جسکے نیچے ایک بنئے کی دوکان تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد چاروں اُوپر چلے گئے۔ کمرہ معمولی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ فرش پر صاف ستھری کانپوری دری بچھی ہوئی تھی اور جنوب رویہ دیوار کے ساتھ ایک پلنگ پڑا تھا دیواروں پر جرمنی اور انگلستان کی بنی ہوئی چند ایک معمولی قسم کی رنگین تصاویر کے ساتھ ایک ولایتی دیوارگیری بھی آویزاں تھی۔ ایک کونے میں ہلکے سے قالین کے پاس صاف ستھرا گاؤ تکیہ رکھا تھا اور اُسکے ساتھ ہی دوسرے کمرہ کا دروازہ تھا جس پر اس وقت ایک ادنیٰ قسم کا چک لٹک رہا تھا جسے سید صاحب نے زنانہ مکان سے تعبیر کیا۔ میاں غلام شہید نے شاہ صاحب کا بستر جو ایک دری ایک نہایت نازک تکیہ اور ایک چادر پر مشتمل تھا کھول کر پلنگ پر بچھا دیا اور پھر چاروں فرش پر بیٹھ کر زمانہ بھر کی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ آدھ گھنٹہ بعد ایک نوجوان اُسی دروازہ سے زنانہ مکان میں داخل ہو کر نہایت صاف و شفاف طشتریوں میں ملائی کا برف لے آیا اور اپنے معزز مہمان اور دوسرے صاحبوں کے سامنے پیش کیا۔ چنانچہ ٹھنڈے یخ بستہ

شہر نے سب کے دل و دماغ بے اندازہ مسرت سے لبریز کردیئے اور سید صاحب کی سفر کی تمام کوفت دُور ہوگئی۔
دوپہر کو کھانیکے لئے دسترخوان بچھایا گیا جس پر رنگارنگ اور طرح طرح کے اطعمہ لذیذ کھانوں کی نمایش کیگئی
پلاؤ۔ زردہ۔ قورمہ۔ فرنی۔ پسندے۔ چٹنی۔ آچار مربے غرضیکہ ہر قسم کے کھانے بافراط موجود تھے۔ اور
سید محمد طفیل صاحب دل ہی دل میں اس بات کا اندازہ لگا رہے تھے کہ اُنکا میزبان نہایت متمول رئیس معلوم
ہوتا ہے۔ مگر وہ یہ دیکھ کر نہایت حیران ہوئے کہ وہ تمام کے تمام نوجوان معہ میاں غلام شہید سخت پُر خور
اور چٹورے معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ کھانے پر ایسے ٹوٹے پڑتے تھے جس طرح کسی مہینوں کے بھوکے
آدمی کے سامنے مزیدار پلاؤ کی ایک پلیٹ رکھدی جائے۔ خیر اس بات سے اُنہیں کچھ تعرض نہ تھا اُنکی ملکیت
تھی کیا ہوا جو وہ آداب طعام سے قطعاً بے خبر تھے قسام ازل بخت و دولت کی تقسیم کے وقت سلیقہ و
آداب کو مدنظر نہیں رکھتا۔

شام ہوئی تو دروازہ پر ایک دو اسپہ فٹن حاضر تھی اور چاروں اصحاب شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی
مسجد دیکھنے اور دریا کے دلکش و پُر لطف مناظر سے بہرہ اندوز ہونیکے لئے روانہ ہو گئے اور خوب جی بھر کر
وہاں کے عالیشان مندر اور پختہ و سنگین گھاٹوں کا سورج غروب ہونیکے بعد تک لطف اُٹھاتے
رہے چنانچہ ایسے ہی دل خوش کن مشاغل اور سیر و تفریح میں تین چار روز گذر گئے تو سید صاحب نے میاں غلام شہید
سے رخصت چاہی مگر اُنھوں نے ہرگز نہ مانا اور چند یوم اور رہنے کیلئے اصرار کیا۔ مجبوراً شاہ صاحب کو مقدس
بزرگ کے احکام کی بجا آوری میں سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ غرضیکہ دس بارہ روز اور گذر گئے اور سید محمد طفیل بہت
گھبرائے کیونکہ دن بھر سو رہنے اور دو وقت عمدہ اور مرغن غذا کھا لینے یا پُر فضا باغات و مشہور مقامات
کی سیر کر لینے کے سوا اُنہیں کوئی کام نہ تھا۔ بنارس کی سیر تو ہوئی اور خوب ہوئی مگر پھر بھی اُنکا جی اُکتا
گیا بالاخر جملہ میزبانوں کے صلاح مشورہ سے یہ قرار پایا کہ علی الصبح بعد از نماز فجر شاہ صاحب عازم کلکتہ ہوجائیں

دوسرے روز صبح چار بجے کے قریب سید محمد طفیل بستر استراحت سے اُٹھ کر حوائج ضروریہ سے فارغ
ہو نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئے اور اس انتظار میں بیٹھے کہ اُنکے معزز میزبان آئیں تو رخصت حاصل کیجائے
پانچ بج گئے۔ ساڑھے پانچ بج گئے۔ چھ بج گئے اور گاڑی کا وقت بھی گذر گیا۔ جون۔ جولائی۔ کے دن
تھے آفتاب نہایت تزک و احتشام سے اپنی پوری مدت میں اہالی بنارس کو گرمی اور لو کے تھپیڑوں
سے جھلسنے کا تہیہ کر کے سرعت رفتاری سے جھپٹا چلا آرہا تھا اور اُسکی اولین لانبی و سنہری کرنیں مکان

کے آئینوں اور دریچوں سے ٹکرا ٹکرا کر آنکھوں میں خیرگی پیدا کر رہی تھیں۔ شاہ صاحب قبلہ کے میزبانوں سے نہ کسی کو آنا تھا نہ آیا۔ لایعنی اور بے ترتیب خیالات کی اُلجھن نے اُنکا دماغ پریشان کر دیا اور اُنکے شریف، بے لوث دل پر اندیشہ، تردد اور بدگمانی کا رنگ چڑھنے لگا۔ جیب میں روپے دیکھے تو وہ بجنسہ موجود تھے بلکہ گذشتہ دس پندرہ روز میں اُنہوں نے اپنی جیب سے ایک پائی بھی خرچ نہ کی تھی۔ اُنکا بستر اور مکان کا فرش معہ اپنے مختصر سے سامانِ آرایش کے اُسی طرح پڑا تھا البتہ اُنکی بدگمانی کو محکم کرنیکے لئے وہ غالیچہ اور گاؤ تکیہ ندارد تھے۔ سید صاحب نے چلمن کے ساتھ کھڑے ہو کر آہستہ اور بلند آواز میں کئی دفعہ "میاں غلام شہید صاحب" کہہ کہہ کر پکارا کوئی جواب نہ تھا اور کوئی صدا نہ تھی۔ بالآخر اُنہوں نے جی کڑا کر کے چک اُٹھالیا اور اندر جھانک کر دیکھا تو اُنکے مُنہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ کمرہ جہاں سے ہر روز رنگا رنگ کے طعام آتے تھے ایک ویران کمرہ تھا جس کی کل کائنات ایک چولھا اور بے ترتیبی سے بکھری ہوئی چند سوختنی لکڑیاں تھیں اور اُسی کمرہ سے کسی دوسرے بازار کو راستہ نکل گیا تھا۔ شاہ صاحب کیلئے یہ مرحلہ نہایت اہم اور مصیبت خیز تھا کیونکہ فوراً ہی ایسے تناقص اوہام اور بُرے خیالات کا اُنکے پراگندہ دماغ میں ہجوم ہونے لگا اور اُنہیں فوراً اس بات کا احساس ہو گیا کہ اگر فی الحقیقت وہ محسن یہاں سے چلدیئے ہیں تو مجھ پر عنقریب کوئی بلائے بیدرماں آسمان سے نازل ہُوا چاہتی ہے۔ سید صاحب کا سانس زور زور سے چلنے لگا اور مرگ آسا کمزوری سے بے قابو ہو کر اُنہوں نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور دوسرے لمحہ میں اُنکے مُنہ سے نکلا "خدا کی پناہ۔ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا!!"

یہ صرف سید محمد طفیل کی دماغی پریشانی کی تصویریں تھیں جو مختلف صورتوں میں اُنکے پیشِ نظر ہو کر ناگفتنی مصائب کا نقشہ کھینچ رہی تھیں۔ اگرچہ یہ تمام عجیب و غریب افسانہ نمط خیالات نہایت ہی تمسخر انگیز اور بزدلانہ تھے مگر پھر بھی ایک غیبی طاقت تھی جو شاہ صاحب کو اس بات کا یقین دلا رہی تھی کہ وہ غیروں کے خرچ پر کھائی ہوئی امیرانہ اور پر تکلف دعوتیں آج اُنکے لئے کوئی نیا گُل کھلانے کو ہیں۔ اُنہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مکان کے نیچے سینکڑوں قرضخواہ اُنکا راستہ روکے کھڑے ہیں اور اُنہیں کے خوف سے وہ دروازہ بند کیئے کمرہ کے اندر لرزہ براندام ہو کر دبکے بیٹھے ہیں۔ اسی قسم کے دیگر ذہن خراش تفکرات کے شدید صدموں سے اُنکا دل قابو سے

باہر ہونے لگا اور صدہا قسم کی بھیانک اور مکروہ ڈراؤنی شکلیں اُنکے ارد گرد ہجوم کرنے لگیں اسی بے بسی اور بیچارگی نے آنِ واحد میں اُنہیں بیخودی کی اُس دُنیا میں لا پھینکا جہاں ایک ذی ثروت اپنی لاانتہا دولت و امارت سے متمتع نہیں ہو سکتا اور جہاں ایک دردمند اپنے جگر کوب صدموں اور دلی خلفشاریوں کو محو کر دیتا ہے۔ کچھ دیر تک سید صاحب اسی حالت میں دیوار کے ساتھ سہارا لگائے پڑے رہے اور سُورج کی تیز و تند کرنیں اس عرصہ میں اُنکے تمام بدن کو پسینہ سے شرابور کر گئیں۔ چنانچہ سخت حبس اور بیحد گرمی اور پسینے نے اُنہیں اپنے متوحش خواب سے بیدار کر دیا۔ اس وقت اُنکے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا اور یکلخت ایک قسم کی نئی اُمیدوں اور ولولہ خیز آرزوؤں نے اُنکا حوصلہ بندھا دیا کہ اُٹھ اور مردوں کی طرح ہمت و بہادری سے آنے والی مُصیبتوں کا مقابلہ کر! ہر راحت کے بعد مُصیبت اور ہر خلش کے بعد فرحت ہے اور یہی قانون قدرت ہے۔ جو شخص دُنیا کے مصائب و تردد ات کا مردانہ وار مقابلہ نہیں کر سکتا اُسکے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں اور اُسے اس دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی استحقاق حاصل نہیں۔

یہ دو تین منٹ کی بات تھی کہ سید صاحب اپنے ملول و حزین جسم کو سنبھال کر پلنگ سے اُٹھ بیٹھے اور بازار کے دوکانداروں سے میاں غلام شہید وغیرہ کا پتہ دریافت کرنیکے لئے مکان سے نیچے اُتر آئے وہ بمشکل بازار میں پہنچے ہی ہونگے کہ سیڑھیوں سے ملحقہ دوکان سے ایک ادھیڑ عمر بنیا ہاتھ میں ایک کاغذ لئے اُنکے سامنے آکھڑا ہوا اور نہایت عزت و تکریم سے آداب بجا لا کر وہ پرزہ کاغذ سید صاحب کے ہاتھوں میں دیدیا۔ بالآخر شاہ صاحب کے جملہ شکوک دوسرے لمحہ میں ہی اپنے اصل رنگ و روپ میں عیاں ہونے لگے اور جس بات کا اُنہیں کھٹکا تھا وہی پیش آگئی کیونکہ وہ پرزہ کاغذ اُنہیں دعوتوں کا بل تھا جو سید صاحب اور میاں غلام شہید معہ اپنے یارانِ شاطر کے خوب جی بھر کر پندرہ بیس روز اُڑاتے رہے تھے۔ یہ کوئی معمولی بیس پچیس روپے کا بل نہیں تھا بلکہ چھ سو اٹھارہ روپے کی رقمِ خطیر تھی جو کچھ تو اُنہوں نے خود سید صاحب سے مل کر کھائی اور کچھ مہینہ دو مہینہ کا اثاثہ سید محمد طفیل کی بدولت اپنے ہمراہ بھی لے گئے۔ اس پرزہ کاغذ پر نظر ڈالنے سے شاہ صاحب موصوف کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اب کیا پیش آنیوالا تھا۔ اُنکا کلیجہ مُنہ کو آنے لگا۔ اور سائیں سائیں کی آوازوں نے اُنہیں ایک نئی انقلاب انگیز دُنیا میں لا ڈالا جسکے چپہ چپہ میں سانپ بچھو اور اسی قسم کے زہریلے حشرات الارض انہیں نگلجانے

پر ستعد نظر آرہے تھے اور ہر طرف سے نکبت و فلاکت کی آندھیاں اُٹھ رہی تھیں اور شش جہت سے "گھیرلو۔ گھیرلو" کی دلدوز صدائیں اُنکا خونِ جگر پی رہی تھیں۔ خدا معلوم وہ اس حالت میں کتنی دیر مشوش و ہراساں رہتے کہ بنئے کی اس آواز نے اُنہیں چونکا دیا "حضور یہ تمام اشیاء آپکا منیم لیجاتا رہا ہے اور اُس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جناب پنجاب کے ڈپٹی ہیں اس لئے میں نے کبھی کسی چیز کے دینے میں عذر نہیں کیا پندرہ روز کا مکان کا کرایہ اور تیس روپے فٹن کا کرایہ بحساب دو روپیہ یومیہ بھی اسی میں درج ہے اور کل رقم چھ سو اٹھارہ روپے کی ہے۔ فٹن کا کرایہ کل شام میں نے خود ادا کیا تھا"

سید صاحب کی آنکھوں سے دیوانوں جیسی وحشت برسنے لگی مگر کسی خیال کے برق نما تیزی کے ساتھ دماغ میں سما جانیکے باعث اُنکے چہرے پر ایک لطیف و خوشگوار تغیر پیدا ہوگیا پھر بنئے کی تمسخر انگیز اور ابلہ فریب صورت دیکھکر کہنے لگے "کچھ ڈر نہیں ابھی آپکو دس پندرہ منٹ کے اندر یہ تمام رقم ادا کر دیجائیگی مگر ہاں اس حساب میں کچھ غلطیاں معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھئے تین تاریخ کو ۱۲ سیر گھی آیا مگر آپنے پندرہ سیر لکھ رکھا ہے اور یہ پانچ تاریخ کو تولہ بھر زعفران کی ہمیں کیا ضرورت ہوسکتی تھی؟ یہ چار من چاول اور اڑھائی من کھانڈ کی رقوم بھی کچھ مشکوک ہیں اور بہت سی اشیاء کا نرخ بھی بازار سے مہنگا لگایا ہے" غرضیکہ شاہ صاحب ابھی بنئے سے نمٹنے بھی نہ پائے تھے کہ سامنے کی دکانوں سے شیر فروش اور قصاب اپنے اپنے حسابات کے پرچے ہاتھوں میں سنبھالے شاہ صاحب کے حضور میں آداب عرض کہکر خاموش کھڑے ہوگئے۔ سید صاحب کے چہرہ کا رنگ اُنکی اندرونی کیفیت کا بہترین مظہر تھا۔ حلق خشک۔ زبان ببول کا کانٹا معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے اضطراب و خلجان کے نازک ترین مرحلہ پر پہنچ چکے تھے جسکے آگے جنون و بربادی کی تاریک خندق نظر آرہی تھی۔ اُنکا سر چکرا گیا اور آنکھوں میں خوف و تردد کی تاریکی پیدا ہوگئی مگر آدمی تھے سمجھدار جھٹ پینترا بدل کر جھوٹے تبسم سے اپنے قرضخواہوں کی طرف دیکھ کر کہا "میرا منشی ریل پر اسباب چڑھانے گیا ہے آپ سب صاحبان پندرہ بیس منٹ کے بعد اوپر تشریف لے آئیں تو سب کا حساب صاف کر دیا جائے" یہ سُن کر تینوں صاحبوں نے سر جھکا کر تسلیم کہا اور سید صاحب نہایت متفکرانہ انداز میں جان چھڑا کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔

لیکن کیا ایسی طفل تسلیوں کا منتر سر پر چڑھ کر بولنے والے جادو کو کسی طور باطل کر سکتا تھا؟ آدھ گھنٹہ بعد قرضخواہوں کی فوج بلائے بیدرماں کی طرح سر پر سوار ہونے کو تھی اسوقت شاہ صاحب

کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجروح حالت میں کسی تاریک خندق کی گہرائیوں میں پڑے کراہ رہے ہیں سات سو روپے کی رقم کہاں سے ادا کریں اُنکی جیب میں اُسوقت کُلہم دو سو روپے کے قریب تھے۔ اب ہر طرف سے مایوسی اور تباہی ہی تباہی نظر آتی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک گھرنے والی دنیا میں ایک گمنام و بے دست و پا چیونٹی کی طرح رینگ رہے ہیں۔ اُن میں اتنی سکت بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر حرکت کر سکیں۔ اس بے بسی، وطن اور عزیز و اقربا سے سینکڑوں کوس کی دُوری اور سب سے بڑھ کر اس نئی مُصیبت کا خیال کرکے اُنکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور نہایت الحاح و زاری سے اُنہوں نے بارگاہِ ربِ غفور میں گڑگڑا کر کہا۔ "یا اللہ العالمین میری تمام خطاؤں اور گناہوں کو معاف کر دے اور مجھے اس مُصیبت سے نجات دلا۔ یا رب العزت میں بیگناہ ہوں اگرچہ میری ہی کج فہمی۔ لالچ۔ خودغرضی اور غیر مآل اندیشی نے مجھے اس جگہ پھنسا رکھا ہے۔ صدقہ اپنے حبیبؐ پاک کا میرے گناہوں کی پردہ پوشی فرما اور مجھے اطمینانِ قلب عطا کر"

اس خضوع و خشوع کی حالت میں دس پندرہ منٹ تک گرم آنسوؤں کی رَو اُنکی آنکھوں سے بہتی رہی اتنے میں اُنہیں سیڑھیوں پر آدمیوں کے چڑھنے کی آواز آئی اور اُنکا دل بیٹھنے لگا۔ دروازہ اندر سے بند تھا وہ گھبرا کر دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ پھر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اُنہوں نے اُسی کمرہ کی سیڑھیوں سے اُترنا شروع کیا جو کسی دوسرے بازار کی طرف نکل گئی تھیں۔ اپنا بستر وغیرہ تو اُنہوں نے وہیں چھوڑا اور بازار میں پہنچ کر سیدھا اسٹیشن کا رُخ کر دیا چنانچہ دو چار بازار نکلجانیکے بعد سید صاحب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے اور تمام دن نہایت احتیاط سے اسٹیشن کے بیت الخلا میں چھپے رہے۔ شام کے وقت ایک قلی کی معرفت دو چار آنے کے پیسے دیکر اُنہوں نے دہلی کا ٹکٹ خریدا اور بڑی مشکلوں سے جان بچا کر اپنے وطن پہنچے۔ اسکے بعد اُنہوں نے پھر کبھی سیر و سیاحت کا نام تک نہ لیا ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اس قسم کی جرائم پیشہ اقوام کی طرح ایک اور قماش کے لوگ بھی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ذی عزت اور متمول رؤسا کا بھیس بدلے لوگوں کو لوٹنے کے لئے ایک ماہ و سال گردش میں رہتے ہیں، اس قسم کے ایک نہیں بیسیوں واقعات آئے دن اخبارات میں نظر سے گذرتے ہیں جہاں کسی جعلی راجہ یا نواب صاحب نے اپنی ندرت آفرینیوں اور جدت طرازیوں سے کسی جوہری یا صراف کو لوٹ لیا ہو۔ اس قسم کے رؤسا اپنے لاؤ لشکر۔ امیروں۔ وزیروں

اور سیکرٹریوں سمیت نہایت آن بان اور طمطراق سے کوئی عالیشان مکان یا بنگلہ کرایہ پر لے کر ہفتہ عشرہ کے لئے بود و باش اختیار کرتے ہیں اور اُنکے معتمد کئی خفتہ بخت جوہریوں کو راجہ صاحب کی خدمت میں مختلف اقسام کے نادر و نایاب جواہر پیش کرنے کے لئے پھانس لاتے ہیں راجہ صاحب اپنی تلبیس آمیز وجاہت کے اظہار کی خاطر ایک دو گرانبہا جواہر خرید کر جوہری کی ہمت افزائی فرماتے ہیں۔ چنانچہ چند دنوں بعد جوہری کی دوکان سے بہت سے گرانقدر جواہر معزز پردہ دار بیگمات اور رانیوں کے ملاحظہ کے لئے لائے جاتے ہیں۔ جب وقت مقررہ تک جواہر واپس نہیں آتے تو جوہری صاحب بل کھاتے راجہ صاحب کی قیامگاہ پر جوتیاں چٹخاتے جا پہنچتے ہیں مگر مکان کو خالی یا مقفل دیکھ کر قسمت کو روتے واپس آجاتے ہیں اور ہز ہائینس راجہ صاحب "نامعلوم الاسم" کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ حال ہی میں ایک ایسے نواب صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے بمبئی میں اپنا پارٹ ادا کرنیکی کوشش کی تھی مگر مشاق و تجربہ کار پولیس کے قابل قدر افسران نے اُنہیں فوراً قانونی شکنجہ میں کس دیا[1] لیکن ان سب سے عجیب تر ایک واقعہ ایچ۔ ایل آدم نے قلمبند کیا ہے اور وہ یہ ہے :۔

(باقی آئندہ)

محمد ضیاءالدین شمسی

---

اک نقاش کی موت کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے افسوس اُسمیں کتابت کی چند غلطیاں ہو گئیں ہیں

| صفحہ | | سطر | | کتابت میں | | اصل میں |
|---|---|---|---|---|---|---|
| صفحہ | ۸ | سطر | ۶ | کتابت میں۔ شہرت صحت۔ | | اصل میں شدت صحت |
| " | ۹ | " | ۴ | " برس گذر گئے | " | برسوں گذر گئے |
| " | ۹ | " | ۶ | " فرمائم | " | ذ مائم |

---

[1] بخوف طوالت میں اس واقعہ کا ذکر اسجگہ مناسب نہیں سمجھتا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو اخبار مسلم آوٹ لک مورخہ یکم اپریل ۱۹۲۳ء

# مخزن المعلومات

اُردو میں ابتک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جسے مخزن المعلومات *Encyclopaedia* کہا جا سکے - انگریزی میں بیسیوں ایسی کتابیں ہیں جس صیغہ کے متعلق آپ معلومات دریافت کرنا چاہیں فوراً مل سکتی ہیں۔ بیل اڈرکین صاحبان نے ایک *Oriental Biographical Dictionary* تالیف کی تھی اس میں ہندوستان کے بعض لوگوں کے مختصر سے حالات درج ہیں۔ لیکن وہ مکمل نہیں اور انگریزی زبان میں ہے۔ انگریزی زبان میں کئی انسائیکلو پیڈیا *Encyclopaedia* موجود ہیں ان میں سے *Britanica* کے اب طبع یازدہم فروخت ہو رہی ہے چند سال تک طبع دوازدہم بھی شائد نکلیگی اُردو خوان اس سے استفادہ نہیں کر سکتے اور دریافت معلومات کے لئے بھٹکتے رہتے ہیں +

میری تجویز یہ ہے کہ ناظرین ہمایوں اور اُسکے مضمون نگار بلکہ عوام سے درخواست کیجائے کہ جو واقعات جس صیغہ کے متعلق کسی کو معلوم ہوں وہ مختصر طور پر قلمبند کرکے ہمایوں کے دفتر میں بھیجدیں۔ چند سال میں ایک ذخیرہ جمع ہو جائیگا ۔ چیدہ چیدہ مضامین وقتاً فوقتاً ہمایوں میں چھپتے رہیں گے باقی جمع رہینگے ۔ جب کافی سامان جمع ہو گیا تو بطور لغات کے ابجد کے سلسلہ کے مطابق چند جلدوں میں شائع ہو جائینگے ۔ سائنس کے تحقیقاتی مصالحہ کے فراہم کرنے کی تکلیف نہ اُٹھانی چاہیئے کیونکہ وہ بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے مجوزہ لغات میں صرف وہ معلومات آنے چاہئیں جو وقت گذرنے پر تقویم پارینہ نہ ہو جائیں ذیل کی قسم کی کتب سے بہت امداد لیجا سکتی ہے۔

۱- امپریل گیزیٹر۔

۲- گیزیٹر اضلاع ہندوستان۔

۳- سوانح عمریاں۔

۴- تاریخہائے ہندوستان۔

۵- جغرافیہ ہند۔

۶- تصانیف انشاپردازانِ ہند۔

۷۔ دیوان ہائے شعراء ہند۔
۸۔ کتب سیر و سیاحت ہند۔
۹۔ فہرستہائے کتب خانجات عام واقعہ ہند۔
۱۰۔ رپورٹ ہائے سرکاری نسبت عمارت ہائے قدیم۔
۱۱۔ تذکرہ اولیا و فقرائے ہند۔
۱۲۔ مذہبی کتب متعلق ہر مذہب کے۔
۱۳۔ رپورٹ مردم شماری کے اعداد۔
۱۴۔ اقوام ہند کے حالات۔
۱۵۔ مشاہیر ہند کی سوانح عمریاں۔
۱۶۔ اجناس ہند۔ اُنکی نسبت مفصل حالات۔
۱۷۔ بعض اصطلاحی الفاظ کی تشریح۔
۱۸۔ ادویہ نباتاتی و معدنی۔

غرض ایسی جامع کتاب اُردو میں تالیف کیجائے جس میں سے آپ معلومات حاصل کر سکیں۔ اُردو کی ترقی محض عبارت آرائی اور مسجع الفاظ یا محض فصاحت و بلاغت سے ہی نہیں ہو سکتی جبتک اس میں ذخیرہ ہر قسم کا داخل نہ ہوگا اسکو کوئی پایہ حاصل نہ ہوگا۔ ہمیشہ غیر زبانوں کی محتاج بنی رہیگی +

ہماری مجوزہ مخزن المعلومات کو بہت عرصہ درکار ہے ہمیں تو سردست کوئی اُردو۔ انگریزی اُردو لغات بھی اچھی نظر نہیں آتی ۔ مروجہ لغات اعلیٰ قسم کی نہیں ہیں ۔ اکثر اوقات ہمکو ترجمہ کے لئے ضرورت پڑتی رہتی ہے لیکن بہت دقت پیش آتی ہے ۔ کاش کوئی انگریزی دان جو اُردو میں کافی مہارت رکھتا ہو ایک لغات ہی شائع کردے یہ بھی غنیمت ہو گی اور مخزن المعلومات کی پہلی قسط ہو گی +

شمیم

# فلسفۂ حقیقت

اے محبت میری آنکھیں بند کر دے، کیونکہ اب یہ نظارۂ مسرت سے مایوس ہو چکی ہیں.....اس چراغ کی طرح جو تیز و تند جھونکوں میں ٹمٹما رہا ہو۔

اے خاموشی میرے لب کو بوسہ دے کیونکہ اب یہ نغمۂ مسرت سے نا آشنا ہیں۔

اے میری تمنا! میری رُوح کو بیقرار نہ کر، کیونکہ اب یہ محبت کے بار اور درد و الم کی کثرت سے اداس ہے اُس پھُول کی طرح جو کثرتِ بارش سے اپنی بہار کھو چُکا ہو.....بس میری رُوح کو اپنے چہرے سے پناہ میں رکھ ؎

۲

جب میں اپنے رُخ سے نقاب اُلٹ دیتی ہوں تو گُلاب کی کلیوں کا رنگ رشک سے بدلجاتا ہے، اور اُنکے مجروح سینے رنج والم سے شق ہو جاتے ہیں۔ اور اُنکی خوشبو اُنکے نیرنگ حُسن کی خبر لیکر فضائے گلستاں میں پھیلجاتی ہے...... اور جب ہوا کی اٹکھیلیاں میری زلفوں سے کھیلتی ہیں تو سنبل پر ایک عالمِ انتشار طاری ہو جاتا ہے اور اُس مسرور کن پریشانی کے اثر سے اُس پر افسردگی چھا جاتی ہے، اور جبکہ میں اُن سبزہ زاروں میں ٹھہر جاتی ہوں جو میری ہی طرح خوبصورت ہیں تو بلبلیں گیت گاتی ہوئی جمع ہو جاتی ہیں۔ جن کی روحیں بھی اُنکے جگر دوز نغموں کی طرح مست ہوتی ہیں ؎

۳

موسم بہار! اے موسم بہار تیرا لب لباب کیا ہے؟

بلبل کی آہِ جگر دوز یا پھُولوں کا زیرلب تبسم، قطراتِ شبنم کا شعاع ماہتاب پر رقص ........ یا نسیم سحر کے دلنواز ترانے" جبکہ وہ اپنی تبسم آفریں رفتار سے پھُولوں کو ہنساتی چلتی ہے" کسی عروس نوخیز کی امید یا کسی دوشیزہ کا خواب شیریں جو اپنے غنچہ اُمید کی بہار دیکھنے کی منتظر ہو، موسمِ بہار! موسم بہار آخر تیرا راز کیا ہے؟

کیا وہ سحر انگیز مسرت جو ارماں بھرے دلوں پر طاری ہوتی ہے۔

۴

میرے چراغ زندگی! موت کے ہونٹوں نے یکبارگی سانس لیکر تجھے ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا کردیا، آہ یہ نظروں سے غائب ہوجانے والی روشنی اب کبھی نظر نہ آئیگی۔

محبت، محبت، کیا میں اس تاریکی میں رہ سکتی ہوں؟

زندگی کے پودے! موت کے بے رحم ہاتھوں نے تیری چھپی ہوئی جڑوں کو کھود ڈالا، آہ اب اس میں نازک و خوشنما پتیاں کبھی نہ لگینگی۔

کیا درخت کے پژمردہ ہوجانے کے بعد غنچے نکل سکتے ہیں؟

میری بیقرار روح! موت کی تیز تلوار نے تجھے میرے جسم سے اس طرح جدا کردیا ہے جس طرح قطع کلام کرنے میں کوئی لفظ دو ٹکڑے ہوجائے، آہ اسی طرح تیرا رشتہ اس کالبد خاکی سے ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا۔

کیا روح نکلجانے کے بعد جسم زندہ رہ سکتا ہے؟

۵

آہ! اے میرے دل، مجھے اُن خوابہائے گذشتہ کو نذر آتش کردینے دے جو کہ پریشاں ہوچکے ہیں ہاں مجھے اس جنگل میں گری ہوئی سُرخ و سفید پتیوں اور کلیوں کا ایک "چتا" بنانے دے تاکہ میں اُن منتشر خوابوں کو آگ کی شعلہ افروز مشعلوں سے جلادوں،

آہ اے میرے دل، میں عرصے تک خواب محبت کے گراں بوجھ برداشت کرنے سے تھک گئی ہوں، اب مجھے آرام کرنے دے، ہاں مجھے اُنکی خاک کو منتشر کردینے دے تاکہ میں کچھ لمحوں کیلئے اُنکا ماتم کرسکوں +

اے میرے دل، میں آرام کرونگی یہانتک کہ سایہ مغرب میں بھورا نظر آنے لگے، لیکن ہاں اے میرے دل مجھکو فوراً اُٹھ کر ایک مرتبہ پھر دُنیا کی جنگ اور مجمع کے جھگڑوں میں دیوانہ وار پھرنا چاہئے۔

اے میرے دل، مجھکو اُٹھنے دے تاکہ میں اُن خوابوں کو جمع کروں جو کہ باقی رہ گئے ہیں۔ ہاں سنو کہ میں زندگی کے مصائب و آلام کو اپنے غم انگیز نغمے سے فتح کرونگی +

(مسز نائڈو) سید ابو محمد ثاقب کانپوری

# خطوطِ اکبر

الہ آباد - ۱۴ ستمبر ۱۹۱۳ء

حبیبی و مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ - آپ جب یہاں مجھ سے ملے تھے اُس کے بعد میں شدید مصائب میں مبتلا ہو گیا۔ میرا لڑکا سید ہاشم جو نہایت ذہین۔ ہونہار۔ توانا۔ بالا بلند۔ موزون طبع۔ عاقل۔ خدا پرست شعر فہم میرا خادم اور مشیر و مطیع تھا اور جس نے چودھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ یکایک سرسام میں مبتلا ہو کر مجھ سے ہمیشہ کو جدا ہو گیا۔ بی بی پہلے مر چکی تھیں۔ وہی لڑکا دنیاوی زندگی کا سہارا تھا۔ مذہب اور فلسفہ تصوف نے دیوانگی سے محفوظ رکھا لیکن بے حد افسردہ اور دنیا سے بے تعلق ہو گیا ہوں۔ ہوش و حواس سے مجبوری ہے۔ میں نے الہلال کے آرٹیکل نہیں دیکھے تھے صرف اسی پر نظر پڑی تھی کہ حظ و کرب و لذت و الم میں کس کو ترجیح ہے۔ پچھلے دونوں لفظ بہت مانوس تھے۔ میں نے الہلال کو دو سطریں لکھ بھیجیں۔ اُس کے میں نے آرٹیکل[1] پڑھے۔ آپکی مشکلات کا خیال آیا۔ لہذا میں نے دست برداری کی۔ نگفتہ ندارد کسے با تو کار۔ ولیکن چو گفتی دلیلش بیار۔ دانم چرا نگویم کی تو افراط ہے لیکن مدد اور کام کی بات بہت کم ہے۔

آپنے اپنے پہلے خط میں بہت صحیح خیالات ظاہر کئے تھے کہ اس کام کے اہل ہندوستان ہی میں نہیں ہیں۔ بیشک کیوں ہونے لگے۔ لوگ کہتے ہیں ابوالفضل کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ اکبر پیدا ہوں تو وہ بھی پیدا ہوں یہ میرا خیال ضرور ہے کہ ترجمہ کرنیوالے کو اُس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جائے زیادہ تبحر چاہیئے کیونکہ بہ نسبت سمجھنے کے سمجھانا مشکل ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ماشاءاللہ آپ زبان عربی کے قواعد سے بیگانہ نہیں ہیں لہذا آپ پر ہر طرح اطمینان ہے۔ مجھ کو بہت شبہ ہے کہ آیا یہ الفاظ جنکو ہم آپ جمع کرتے ہیں کبھی وہ زندگی پائینگے جو مغربی فلسفانہ الفاظ کو حاصل ہے لیکن بہر کیف کوشش کرنی چاہیئے۔ سید سلیمان سے مجھ سے شائد ملاقات ہو یاد نہیں اگرچہ انکی تحریریں جیسا کہ آپنے خود نوٹ کیا ہے irrelevant باتیں بہت ہیں اور بغیر انکے وہ کام ہی نہیں چل سکتا۔ کچھ اچھے suggestions بھی ہیں۔ اگر وہ آپکے مشیر اور خادم بنیں تو بہت آسانی ہو سکتی ہے وہ وہیں موجود ہیں اور بلا تکلف بحثیں ہو سکتی ہیں۔ میں تو اولاً خود بے بضاعت

[1] دیکھو مکتوب اول و دوم

دوسرے بیحد مخدور ہو رہا ہوں۔ چار دن سے اعضاء شکنی ہے۔ داہنے کان میں درد ہے۔ دیکھئے کب سفر کے قابل ہوں۔ ارادہ تو ہے کہ جون پور جاؤں وہاں دو ایک دن رہ کر لکھنؤ آؤں میرا دل تو اب زیادہ دنیاوی زندگی کے نتائج سے متعلق ہے۔ منطقی شائد کہتے ہیں کہ بلا مدد الفاظ خیال نہیں ہو سکتا لیکن مجھکو تو غم بلا مدد الفاظ ہوتا ہے اور پھر شاعر کی زبان کا ٹھکانا۔

میں آپکو مذاقِ شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں۔ غالب[1] کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دلاویز ہے درحقیقت جو شعر ہیں نے آپکو لکھے تھے وہ شعر نہ تھے۔ پولٹیکل ہنگامے[2] کے متعلق ایک رائے کا اظہار تھا۔

آج مشکل سے لکھنے کو بیٹھ سکا کچھ نوٹ کر دئے ہیں۔

عضویات[3]۔ مجھکو بھی بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن یائے نسبت لگئیے تو الف اور تے کو حذف کر دینا ہی اولیٰ نظر آتا ہے۔ طبعیات سے طبعی۔ متنازعہ لفظ تو خط ہے اور شاید کرب بھی۔ اس کے متعلق کچھ نوٹ لکھ دئے ہیں۔ طبیعت نہایت مضمحل ہے۔ کتابیں بند پڑی ہیں اور بے ترتیب۔ میں کچھ مدد نہ لے سکا۔ درد سر سے پریشان ہوں۔ میں آپ کے مشاغل اور عادات اور حالات سے آگاہ نہیں ہوں۔ لہذا اسکے لکھنے کی جرأت نہ کر سکا کہ دو چار دن کو یہیں تشریف لائیے۔ خدا آپ کو ترقیات ظاہری و باطنی عطا کرے اور آپ اس مصرعہ کے مصداق ہوں" ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد"

افسوس ہے کہ اسباب انتشار قومی بہت جمع ہیں اور کوئی شخص اتنا فارغ البال نہیں نظر آتا کہ پوری آزادی سے طلب علم میں زندگی صرف کرے۔ اچھی سوسائٹی بھی ہمکو میسر نہیں۔

آپ سے انشاء اللہ ملاقات ہو گی تو بہت باتیں ہو سکینگی۔

آپ کا نیاز مند اور دعاگو
سید اکبر حسین

---

[1] مکتوب الیہ کا ایک مضمون فلسفہ غالب پر رسالہ ادیب (الہ آباد) میں نکلا تھا۔ [2] دیکھو مکتوب دوم
[3] مکتوب الیہ نے فزیالوجی کا ترجمہ عضویات، اور فزیالوجیکل کا عضویاتی تجویز کیا تھا۔

# ورجل

ورجل کے وقت روم کی حالت

نصف صدی قبل مسیح سلطنتِ روم دُنیا میں ممتاز و سرفراز تھی۔ اسکی افواج ہر جگہ مظفر و منصور۔ اس کے قوانین مفتوحہ ممالک میں رائج اور دریافت شدہ دُنیا کے گوشہ گوشہ سے باج و خراج اسکے خزانہ میں آتا تھا۔ فصیل کے اندر شہر روم کا نظارہ بہت ہی مہتم بالشان تھا۔ عظیم الشان معبد۔ رفیع قصر و ایوان۔ اور جا بجا خوبصورت پُل اور نہریں بنی ہُوئی تھیں گلی کوچوں میں ہر ملک و قوم کے افراد نظر آتے تھے۔ شہری اپنا قومی لباس یعنی رنگین حاشیہ دار سفید ٹوگا (چوغہ) زیب تن کئے تنومند گھونسا باز اور شہ زور پہلوان۔ جلیل القدر شرفا و کم مرتبہ غربا اور غلام ہر وقت بازاروں میں سے گذرتے ہُوئے ملتے۔ ان ایام میں اہل روم تعلیم و تربیت سے عاری نہ تھے مگر فن تقریر کی ان میں از حد قدر و منزلت تھی۔ ورجل کے وقت سسرو (Cicero) شہرۂ آفاق مقرر تھا۔ جس کے خطوط اور تصنیفات سے دُنیا واقف ہے۔ اسی زمانہ میں سیزر (Caesar) بحیثیت قابل مصنف اور جری سپاہی۔ اور ہیوریس Horace بحیثیت شاعر مشہور ہستیاں گذری ہیں۔ پراپریٹس (Propertius) ایک اور قابل شاعر ان کا ہمعصر تھا۔ جس کی تصنیفات کا رنگ بالکل موجودہ زمانہ کے مذاق کے مطابق ہے۔

اہل روم کی زندگی کی تصویر کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ غربا کی حالت ان دنوں میں بہت ہی زار تھی ان میں سے اکثر نان شبینہ تک کے محتاج تھے۔ اور اپنا پیٹ پالنے کی خاطر کسی رئیس کی ملازمت کر لیتے جس کی رضا جوئی میں وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے۔ اس لئے ملک میں دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اول طبقۂ امراء دوم طبقۂ غربا۔ ان معاشرتی جماعتوں سے پھر دو سیاسی پارٹیاں رو پذیر ہُوئیں۔ ان میں سے ایک تو غربا کی ممد و معاون تھی اور دوسری امراء کی حامی۔ جماعت اول الذکر میں کئی طبقۂ اعلیٰ کے خاندان بھی شامل تھے۔ ان پارٹیوں کے باہمی نزاع و پرخاش کی وجہ سے ملک میں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک وسیع جال بچھا ہُوا تھا۔

ورجل کے عنفوان شباب میں سیزر اور اسکے رقیب پمپے (Pompey) کے مابین ایک بہت ہی تلخ اور دقیق و وسیع الاثرات تنازعہ جاری تھا۔ سیزر عوام کا حامی تھا۔ گو اس کی یہ ہمدردی بنائے مخاصمت نہ تھی۔ دونوں سیاسی اقتدار اور ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ایک دوسرے کے خلاف چالیں چل رہے تھے۔ آخر الامر میدان سیزر کے ہاتھ رہا۔ اور اگر وہ چاہتا تو بغیر کسی مزاحمت کے روما جیسی عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ بن جاتا۔

سیزر اگرچہ از روئے پیدائش طبقۂ افضل میں سے تھا۔ لیکن طبقۂ اسفل سے اسے بہت ہی ہمدردی تھی۔ جس کی وجہ سے تمام امرا اسکے مخالف ہوگئے۔ علاوہ ازیں اس کی اپنی کامیابی بھی اس مخالفت کی موجب و محرک ہوئی۔ اسکے مخالفین میں بروٹس (Brutus) کا سیس (Cassius) اور ان کے چند رفقا ایسے اشخاص تھے جو کہ مطلب براری کی خاطر قتل و غارت سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ سیزر کے مقابلہ میں جب انکی چالبازیاں ناکام رہیں تو اُسکے قتل کے درپے ہوگئے۔ اور آخر وہ غریب ان سفاکوں کے ہاتھوں ۴۴ قبل مسیح میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اسکے بھتیجے آگسٹس اور اسکے دوست مارک اینٹونی نے ایک لشکر جرار لیکر قاتلوں کو بمقام فلپی (Philippi) شکست فاش دی۔ اس روز سے آگسٹس دن دونی رات چوگنی طاقت و ترقی حاصل کرتا گیا۔ اسکے عہد میں لاطینی ادبیات کو ازحد فروغ حاصل ہوا۔ جس کی وجہ سے اسے "عہد زرین" کہتے ہیں۔

ورجل کے حالات زندگی | ورجل ۷۰ قبل مسیح میں ایک دہقان کے گھر پیدا ہوا۔ وہ اٹلی کے تمام مصنفین میں سب سے زیادہ محب وطن تھا۔ جس طرح شیکسپیئر کو انگلینڈ سے بدرجۂ غایت الفت تھی اسی طرح اسکو بھی اپنے ملک سے محبت تھی۔ اس کی پرورش دیہات میں ہوئی جس وجہ سے وہ تمام عمر دیہاتی زندگی اور دہقانی طرز معاشرت و سادہ روی کا والہ و شیفتہ رہا۔ اوائل عمر ہی سے اسکے دل پر مناظر قدرت کی گوناگوں دلفریبیوں کا گہرا نقش ثبت ہوگیا تھا۔ اپنی نظم "جارجکس" (Georgics) میں اس نے دیہاتی زندگی کا مرقع کھینچکر اسے بے حد سراہا ہے۔ بہت سے شعرائے نامور اسکے ہمعصر تھے۔ وہ سب کے سب معاش کی خاطر کسی نہ کسی رئیس کے دامن عاطفت میں پناہ گزیں تھے۔ ان کی خوش قسمتی سے ان دنوں روم میں ایک لکھپتی

علمدوست میسیناز (Maecenas) نامی موجود تھا جس کا دروازہ ہر وقت ایسے لوگوں کے لئے کھلا تھا۔ جب ورجل کی شہرت اسکے کانوں تک پہنچی تو اس نے فوراً اسے اپنے ہاں بلالیا اور باقی تمام عمر اسے احتیاج سے مصون و مامون رکھا۔ ورجل نے اپنے کلام میں جابجا اس کی فیاضی و خلق و دوستی کی تعریف کی ہے۔ میسیناز شاہنشاہ آگسٹس کا مشیر اور رفیق تھا۔ اور سیاسی معاملات میں بہت حصّہ لیا کرتا۔ مگر ایک دفعہ بادشاہ سے کسی معاملے میں شکر رنجی ہوجانیکی وجہ سے اس نے اپنا تعلق سیاسیات سے منقطع کرلیا۔ اور باقی عمر دنیا سے علیحدہ ان ادیبان فاضل و شعرائے کامل کی صحبت میں گذارے جوکہ اسکے زیر سایہ تھے۔ اسکی شہرت ہم تک سیاسی کارناموں کی وجہ سے نہیں بلکہ ورجل ہوریس اور دیگر قابل قدر مصنفین کا مربی ہو جانیکی وجہ سے پہنچتی ہے۔

ورجل کی پیدائش کے وقت اسکا باپ ایک بہت ہی مفلوک الحال دہقان تھا! اسکے پاس صرف ایک کھیت تھا جس کی آمدنی پر اس کی گذران تھی۔ لیکن محنت شاقہ اور کفایت شعاری سے اس نے رفتہ رفتہ کچھ جائداد پیدا کرلی جس سے وہ اپنے بیٹے کو تعلیم دینے کے قابل ہوگیا ورجل پہلے تو کریمونا Cremona اور بعد ازاں میلان Milan گیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اس نے نیپوس (Neapolis) میں یونانی زبان سیکھی آخر روم میں تکمیل تعلیم کرکے وہ اپنے والد کے پاس چلا گیا۔ اور سنہ ۴۲ء قبل مسیح تک وہاں مقیم رہا۔ اسی سال اسکے باپ کا کھیت چھین کر ان سپاہیوں کو بطور انعام دیدیا گیا جنہوں نے شاہنشاہ کی خدمت کی تھی مگر چند صاحب اثر دوستوں کی وجہ سے انہیں پھر قبضہ مل گیا۔ اپنی ممنونیت کے اظہار میں اس نے شاہنشاہ کی تعریف میں نظم ایکلوگس (Eclogues) تحریر کی۔ اسی نظم کی خوبیوں نے میسیناز کو ورجل کا ایسا گرویدہ کرلیا کہ اس نے اسے اپنے ہاں بلالیا۔ اب ورجل نے روم میں اقامت شروع کی اور اسکی شہرت رفتہ رفتہ شہنشاہ کے کانوں تک جا پہنچی۔ سنہ ۲۷ء قبل مسیح میں شہنشاہ نے اسے ہسپانیہ سے لکھا کہ میرے اعزاز میں ایک نظم تحریر کرو۔ اس درخواست سے قبل ورجل خود ایک نظم لکھنے کی ادھیڑ بن میں تھا۔ جب شاہنشاہ کا پیغام اسے پہنچا تو اس کے عزم کو اور بھی تقویت ہوگئی۔ اور آخر اس کے تخیل کا اظہار اسکی شہرہ آفاق نظم اینیڈ (Aeneid) میں ہوا۔

۲۲ء قبل مسیح میں شہنشاہ کے نوجوان بھتیجے مارسیلس Marcellus کی وفات
وقوع میں آئی۔ چونکہ ورجل کو شہنشاہ کی دلجوئی ہر طرح سے منظور تھی۔ اس لئے اس نے اس
سانحہ کا ذکر نہایت ہی پُردرد الفاظ میں اپنی نظم کے چھٹے بند میں کیا۔ اور متوفی کے خصائل جمیلہ کو جتایا
روایت ہے کہ جب اس نے یہ سطور اس جوانمرگ کی وہ غمزدہ والدہ اکٹیویا Octavia کو
سُنائیں تو وفور غم سے اسے غش آگیا۔ ۲۰ء قبل مسیح میں ورجل کو مقام ایتھنز شاہنشاہ آگسٹس
کی باریابی کی عزت نصیب ہوئی۔ اسکا ارادہ تو تھا کہ تمام یونان کی سیاحت کرے مگر اسکو
فسخ کرکے شاہنشاہ کے ہمرکاب ہو لیا۔ اور میگارا Megara ہوتے ہوئے اٹلی پہنچا
کچھ عرصہ سے اسکی طبیعت علیل تھی۔ سفر کی کلفت سے حالت اور بھی خراب ہوگئی اور آخر
اکاون سال کی عمر میں ستمبر ۱۹ء قبل مسیح مقام برنڈسیم Brundusium اس نے داعی اجل
کو لبیک کہا۔

ورجل کی تمام عمر متمول و صاحب اثر دوستوں اور میسیناز جیسے لکھ پتی مربی کی وجہ سے نہایت
ہی عیش و آرام سے گذری۔ فکر معاش کے خلجان سے مامون و مصئون ہونیکی وجہ سے اس کا تمام
وقت بہت چین سے کٹا۔ اور وہ سکون قلب اور راحت دل جسکی ضرورت شعرا کو خاص طور
پر ہوتی ہے اسے میسر تھی۔ میسیناز اسکی خداداد لیاقت کا مداح اور ہوریس اس کا شیدائی
تھا۔ اور شاہنشاہ آگسٹس کو اس کی خاص طور پر قدر و منزلت منظور تھی۔ اسکے اوصاف و
اخلاق بجائے خود ایسے پسندیدہ تھے کہ ہر ایک کو گرویدہ کر لیتے۔ اسکی طبیعت بغض و حسد اور
دیگر کمینہ عادات سے بالکل مبرا تھی۔ دُنیا میں اسے صحت جیسی نعمت غیر مترقبہ کے سوا ہر ایک
چیز مثلاً عزت حشمت۔ دولت۔ عیش و آرام اور مربی و رفیق حاصل تھے۔ مگر اس ایک ہی چیز
کی کمی نے اس کی زندگی کو بہت حد تک تلخ کر دیا تھا۔

**اینیڈ** ورجل نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "اینیڈ" ۱۹ء قبل مسیح میں اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے
ختم کی۔ اسکا ارادہ ابھی اسکو اور کاٹنے چھانٹنے اور سنوارنے کا تھا مگر افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی
اسلئے وہ وصیت کر گیا کہ میری وفات کے بعد اسے آگ کی نذر کر دیا جائے۔ مگر دنیا کی خوش بختی سے اسکے
پسماندگان نے اس پر عمل نہ کیا اور یہ نادر تصنیف غارت کی دستبرد سے محفوظ رہ گئی۔ ورجل نے

اسکو ہومر کی شہرہ آفاق نظموں "الیڈ" اور "اوڈیسی" کے نمونہ پر لکھا ہے۔ اسکا مقصد دنیا کے سامنے اس زمانہ کے روم کی حالت کا مرقع پیش کرنیکا تھا کہ رومن قوم کا آغاز کہاں سے اور کیسے ہوا اور اسکی زندگی در تہذیب و تمدن کا مقصد کیا ہے جیسا کہ "ریڈ" اور "اوڈیسی" میں یونانیوں کی بابت مذکور ہے اسوقت تک رومن قوم کی کوئی قومی نظم موجود نہ تھی جسے وہ دنیا کے سامنے اپنی ادبی فضیلت کے ثبوت میں پیش کر سکتے۔ وسعت مملکت۔ سیاسی اقتدار اور فوجی عظمت و جبروت کی وجہ سے انہیں یہ ضرورت خاص طور پر محسوس ہو رہی تھی کہ وہ دنیا کو دکھائیں کہ ہماری قوم محض تیغ آزماؤں اور جرنیلوں ہی پر مشتمل نہیں بلکہ ان میں ممتاز ادیب بھی موجود ہیں جنکی ہستی پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ورجل نے اسکو قومی رنگ دیکر قوم کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا اور روم کی فضیلت ادبی کو چار چاند لگائے۔ اس نظم کا آغاز ہومر کی نظم "الیڈ" کے اختتام سے ہوتا ہے اور جنگ ٹرائے کے سورماؤں میں سے ایک شخص اینیاز Aeneas اسکا ہیرو ہے۔ جب یونانیوں نے شہر پر اسپ چوبی کے ذریعہ سے قبضہ کرلیا تو اینیاز نے شہر کو الوداع کہا اور چند رفقا کی معیت میں جانب شمال روانہ ہو گیا اور سات سال کے بحری سفر کے بعد افریقہ کے شمالی ساحل پر کارتھیج میں اُترا۔ وہاں کی دلفریب ملکہ ڈڈو Dido اسکے دام محبت میں اسیر ہو گئی اور اِدھر وہ بھی ملکہ کی تیغ نگاہ کا گھائل ہو گیا اور آخر دونوں نے شادی کر کے اپنی آرزوں کو پورا کیا۔ مگر فلک کجرفتار کو انکی یکجائی منظور نہ تھی۔ کچھ دیوتا نہیں چاہتے تھے کہ اینیاز ایک جگہ آرام کر کے بیٹھے۔ اسلئے انہوں نے اسکو تنبیہ کی کہ ملکہ کو فوراً چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔ قہر درویش برجان درویش وہ چپکے سے کارتھیج سے روانہ ہو گیا اُدھر اُسکے فراق میں ملکہ نے خودکشی کر لی۔ کچھ عرصہ کے سفر کے بعد وہ اٹلی کے شمالی ساحل پر وارد ہوا اور بعجلت تمام سبل[1] کے غار کی طرف روانہ ہوا۔ اور اُس سے ملکر کہنے لگا کہ میں اپنے متوفی والد اینکائسس Anchises کی ملاقات کیلئے عالم ارواح کو جانا چاہتا ہوں اور تمہاری معیت کا خواستگار ہوں سبل کے ہمراہ وہ طبقۂ زیریں میں اترا جہاں اسے ملکہ ڈڈو اور جنگ ٹرائے کے کئی بہادر ملے آخرالامر وہ بہشت میں اپنے والد سے ملاقی ہوا جس نے روم کی عظمت مستقبل کی پیشینگوئی کی۔ اور اسے وہ روحیں دکھائیں جو کہ آئندہ روم میں ظاہر ہو کر اسکی شان و شوکت کو دوبالا کرنیوالی تھیں عالم ارواح سے نکلکر اینیاز دنیا میں دریائی ٹائبر Tiber کے دہانے پر نمودار ہوا جہاں لیٹینس Latinus کے لاطینیوں کے بادشاہ نے کمال گرمجوشی سے اسکا استقبال کیا اور اپنی بیٹی سے اسکی شادی کردی اور اینیاز نے ایک عظیم الشان شہر کی بنیاد ڈالی جو بعدازاں روم کے نام سے مشہور ہوا۔

غلام سرور ایم ۔ اے

[1] سبل یونان کی قدیم پیشین گو عورت

# بھادوں کی شام

شام کا وقت تھا۔ ہلکا سا مینہ برس کر آسمان کا رنگ نکھر گیا تھا۔ میں اپنے مختصر سے جھونپڑے سے باہر، دریا کے کنارے افق بعید میں ڈوبنے والے سورج کی عارضی موت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ آفتاب کی آخری شعاعیں درختوں کے گنجان پتوں سے گذر کر سطح آب کو زریں بنا رہی تھیں۔ اور پانی کی ننھی ننھی لہریں مستانہ وار رقص کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ بادلوں کے چند پریشان ٹکڑے کسی جادہ مستقیم سے بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح آسمان پر اِدھر اُدھر چکر لگا رہے تھے۔ میرے سامنے مکی کے سرسبز لہلہاتے کھیت کسان کی شبانہ روز کی محنت اور آرزو کی کامیابی کی زندہ شہادت پیش کر رہے تھے۔ ان سے بہت پرے جہاں زمین آسمان ملتے معلوم ہوتے ہیں درختوں کی لمبی قطار شام کے دھندلکے میں ایک نیلی سی لکیر نظر آ رہی تھی۔ ان سب کا نظارہ میرے دل میں ماضی کی خوابیدہ اور دھندلی یاد کو تازہ کر رہا تھا۔ جب اسی دریا کے کنارے۔ اسی جھونپڑی کے سامنے۔ ایسی ہی شام کو میں اور وہ اکٹھے تھے۔ میری ساون کی راتیں اور بھادوں کے دن ایسے اُداس نہ تھے جیسے آج ہیں۔ اُنکا قرب حاصل تھا اور میرے ایام حیات کھلے ہوئے پھول کی مانند شگفتہ تھے۔ قدرت کے دلفریب مناظر جو آج میرے دلِ افسردہ میں اک ہوک پیدا کر دیتے ہیں۔ اُنکی معیت میں۔ اُنکے سحر تبسم سے ہنستے نظر آتے تھے۔ دریا کا یہ ساحل میری ہزاروں آرزؤں کا مرقد ہے جہاں میں زندگی کے بقیہ دن ایک پریشان خواب میں گذار رہا ہوں۔ کہ شاید جاگنے پر میری چھینی ہوئی مسرت مجھے واپس مل جائے۔ یہ سبزہ زار یہ شاداب و پُرفضا میدان۔ یہ خنک ہوا کے جھونکے اُس عہدِ طلسمی کی یادگار ہیں جب دنیا و مافیہا سے بے خبر اُن میں جذب ہو کر میں ایک نشے کی حالت میں ایک سرور کے عالم میں وہی دیکھتا تھا جو مجھے دکھاتے تھے اور وہی کرتا تھا جو مجھے حکم دیتے تھے۔ آہ! میرے تخیل کی ملکہ! دیکھ کہ میرا دل اُن خوش نصیب دنوں کی یاد میں جو تیری رُوح افروز محبت کے سایہ میں کٹے کس طرح آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے۔ میرا سینہ جو تو نے عشق کی پاکیزہ کرنوں سے معمور و منور کر دیا تھا۔ اب

تیری محبت کی سنہری روشنیوں کے گُل ہو جانے سے تاریک ہو رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ میرے ایام و لیالی کس پژمردگی کے عالم میں گذر رہے ہیں۔ سینکڑوں بادل آئے اور برس گئے۔ ایسی کئی برساتیں آئیں اور گذر گئیں۔ سبزہ خشک ہُوا اور پھر ہرا ہو گیا۔ مگر تیرا انتظار بدستور قائم رہا۔

چاندنی راتوں میں، جب چاند بے نقاب ہو کر اپنے نور کی سفید چادر دریا کے نیلگوں پانی پر بچھا دیتا ہے۔ جب تمام کائنات ایک خاموش نور میں مبدل ہو جاتی ہے اور جب فضائے علوی میں نیک ارواح آسمانی راگنیاں چھیڑتی ہیں تو میرا دماغ ان تاثرات سے محفوظ ہو کر اُس رات کی یاد کو زندہ کر دیتا ہے، جب پہلی مرتبہ۔ ہاں پہلی مرتبہ میں نے تیرے حضور میں بصد عجز و انکسار ہدیہ نیاز پیش کیا تھا۔ چاند تب بھی اپنی ضیا پاشی میں مصروف تھا۔ اُسکی نورانی کرنیں تیرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اور میں کیا بتاؤں کہ اُس وقت تو کیا معلوم ہو رہی تھی۔ ایک بیخودی کے عالم میں، اک خود فراموشی کی حالت میں میری نظریں تیری جادو بھری آنکھوں کو جن میں ایک کشش تھی، جس سے شائید تو بھی آگاہ ہو اور جس سے میرا رُواں رُواں تیری جانب کھنچا جا رہا تھا، تک رہی تھیں۔ میں رعب حسن سے خاموش تھا۔ یہ خاموشی ارادی نہ تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ عرض مدعا کے لئے میری زبان کھُلے۔ مگر جیسا کہ تو نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ میرا چہرہ ہی کیفیاتِ قلبی کا بہترین ترجمان تھا میرا قلب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی تیز دھڑکن اپنی آخری جنبش کے ساتھ مجھے ہمیشہ کے لئے ساکن و خاموش کر دیگی۔ تُو ایک استغنا کی لئے ہیں، اک بے نیازی کے سُر میں دریا کی ہلکی لہروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ تیرے لبوں کا پُر اسرار تبسم مجھے ہمت دلا رہا تھا کہ اپنا حالِ دِل تیرے سامنے منکشف کروں۔ اپنے دل کے شکستہ ٹکڑے تیرے قدموں میں پھینک دوں کہ شائید اُنکی قبولیت کا وہی مقام ہو۔ کہ تو نے میری طرف منہ پھیرا اور تیری نگاہوں نے بتلا دیا کہ اُن میں رحم بھی ہے۔ شفقت بھی ہے۔ عفو بھی ہے اور وہ جذبہ بھی ہے جو ٹوٹے دلوں کو جوڑ سکتا ہے۔ مگر

آہ! محبوبہ! اب تو وہ طلسم ہی ٹوٹ گیا۔ نشہ جاتا رہا اور حقیقت کی تلخکامیوں نے

مجھے اپنا شکار بنا لیا۔ یہ کیا زندگی ہے جس میں میں اب اپنے دن پورے کر رہا ہوں۔ میری آرزؤں اور خواہشات کا جنم بھوم اور مرگھٹ میرا ہی دل و دماغ ہے۔ خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اندر ہی اندر مر جاتے ہیں۔ آستانہ ناز کہاں رہا جہاں اپنے فرسودہ دماغ۔ اپنے الم آگیں دل کو تمام عاجزی اور درد کے ساتھ لیکر جاؤں اور جبین فرسائی کروں؟ تم ہی بتاؤ۔ یہ کوئی جینا ہے؟ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو پُر لطف تھا۔ اب ہر چند آنکھیں بند کرتا ہوں مگر وہ نظارہ نظر نہیں آتا۔ اُس رات کا سماں میرے ذہن سے کبھی نہیں اُتر سکتا جب گھنگور گھٹائیں آسمان پر چھا رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی پھوہار پڑ رہی تھی اور رعد کی گرج سے تیرا ننھا سا دل لرز رہا تھا۔ میں باہر سے آیا تو تو نے اپنے دونوں نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں دیدیئے۔ ایک برقی رَو تھی جو سارے جسم میں دوڑ گئی اور میں نہیں جانتا اُس وارفتگی کے عالم میں تجھ سے کیا کچھ کہہ گیا۔ اتنا یاد ہے کہ میرا آخری فقرہ یہ تھا کہ "کیا ان تمام باتوں کے عوض تم مجھ سے محبت کر سکتی ہو؟" جواب میں تمہاری آنکھوں سے ایک گرم گرم آنسو گرا اور اُس کے ساتھ تم نے آہستہ آواز میں جواب دیا "مجھے تم سے عشق ہے،" آہ وہ عشق تو غیر فانی تھا مگر تم ہی نہ رہیں۔ میں اپنے میں ایک خلا محسوس کر رہا ہوں جس کو پُر کرنیکے لئے تمہاری ویسی ہی بے لوث، پُرجوش محبت کی ضرورت ہے۔ کاش تم آؤ اور مجھے اِس بدمزہ زندگی سے نجات دلانے کی کوشش کرو، نہیں تو مجھے بھی وہاں بُلا لو جہاں میری رُوح کے لئے سامانِ زیست موجود ہے۔ !!!!

عاشق بٹالوی

---

کاتب کے صحیح اندازہ نہ کرسکنے کے سبب اخیر کے دو مضمون بعد ترتیب بلا ترتیب درج کئے گئے ہیں

# بیزار ہو

بیزار ہو؟ آخر کیوں۔ تمہارے اُس استغنا کی قسم جس نے حُسن بے مثال کے آغوشِ بے پروائی میں پرورش پا کر میری زندگی کی ظلمتوں پر نور پاشی کر کے مجھے حقیقتِ درد سے خبردار کیا ہے۔ پوچھنے کیلئے مجبور ہوں۔ وہ جذبۂ اشتیاق جسکی گہرائیاں وصل کی تمناؤں کو بے بسی کی پریشانیوں سے سرگرداں رکھتی ہیں میرے دل کو بے قابو کئے ہُوئے ہے۔ اور تم بیزار ہو میری تمنائیں تمہاری صرف ایک نگاہ محبت بھری نگاہ کو حاصل کرنیکے لئے تمہارے پاؤں میں لوٹتی ہیں اور تم پروا نہیں کرتے میری آرزوئیں اس ارمان میں کہ تم انہیں دیکھو تمہاری رفتار پر قربان ہونیکے لئے بڑھتی ہیں مگر تم ٹھکرا دیتے ہو میری نگاہیں تمہارے دلفریب حسن کی بلائیں لینے کے لئے گھنٹوں بھٹکتی پھرتی ہیں مگر تم پردہ نہیں اُٹھاتے۔

سرد۔ بے اثر آہونکی مایوسانہ جد وجہد کے ہجوم میں۔ بے تاثیر نالونکی یاس انگیز شورشوں کے درمیان جبکہ آرزوں کا تقاضہ پُر ارمان دل کی حسرتوں کو چھیڑتا ہوتا ہے جبکہ شوقِ آرزو کی فراوانیاں تخیل کی وسعتوں سے تنگ آکر مایوسیوں کے دامن میں مُنہ چھپائے روتی ہوتی ہیں۔ کس قدر چاہتا ہوں۔ کہ تمہاری دُوری کو قُرب سے بدل کر تمہیں اپنا بنا لوں۔ اور مہجور دل کو تمہارے جلوؤں سے بھر کر مستغنی ہو جاؤں۔

ان راتوں میں کہ چاند کی حسین کرنیں بیخود ہو ہو کر تمہارے حُسن جاں افروز کی نورانی شعاعوں سے ہمکنار ہونیکی آرزوئے لاحاصل میں میری نا اُمیدیوں کی طرح سر پٹکتی ہوتی ہیں اور میں . . . . آہ میں تنہائی اور کس مپرسی کی اندوہ افزا اذیتوں میں گرفتار فرقت زدہ دل کی بیقراریوں پر ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا اپنے جذباتِ محبت کو تمہارے آرزو کُش تغافل کی یاد کے پاؤں پر ڈالنے کیلئے بیخود ہو کر تڑپتا ہوتا ہوں۔ جبکہ آغازِ محبت کی پریشانیاں۔ انجام الفت کی ناکامیوں سے اپنی تلخیوں کا گلہ کرتی ہوتی ہیں اور تم میری بیقراریوں سے محض بے پروا۔ اقلیم خواب کی شیریں اور دلچسپ نیرنگیوں کے رُوح پرور نظاروں میں محو ہوتے ہو۔ جبکہ میری اشک آلُود آنکھیں جنہیں تمہارے دائمی انتظار کی طوالت نے نیند سے محروم کر دیا ہے میری بدقسمتی پر حسرت کا رونا روتی ہوتی ہیں اور تمہارے آہ۔ گلابی ہونٹ جنہیں مسکراہٹ نے زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دیا ہے ہلکے تبسم کی دلفریب گودوں میں کھیلتے ہوتے ہیں دل مایوس کی گھبراہٹوں سے تنگ آ کر پکار اُٹھتا ہوں " کاش تم میرے ہو جاؤ " میرے ہو جاؤ۔ تو اس مختصر سی زندگی کو تمہارے تبسم کے دل افروز جلوؤں کی حرکتوں کے حوالے کر دوں اور دُور کسی ندی کے سرسبز کنارے پر کنجِ خلوت میں بیٹھا ہُوا تمہارے حُسنِ دلکش کے منور نظاروں میں محو ہو کر فنا ہو جاؤں ۔

امیر حسن ناز۔ سیالکوٹ۔

# محفلِ ادب

**شاعری اور فلسفہ** ۔ منطق ایک خاص قسم کی عقلیت ہے، جو عقل ہی پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اور وجدان ایک قدرتی واقعیت ہے، جو وہم و صنعت کے فریبوں کو مٹاتی ہے۔ منطق عقل کے لئے ذلت ہے؛ اور وجدان عقل کے لئے مجلّی۔

فلسفہ اشیاء کی حقیقت کا متجسّس ہے، اور وجدانِ حقائق پر محیط ہے۔ پھر فلسفہ جس کی تلاش میں گم ہے وہ وجدانی دنیا ہے، اور وجدانی دنیا کا ہی دوسرا نام شاعری ہے۔ اس لئے شاعر جو اپنی فکر کی قوت، احساس کی ذکاوت، اور خیال کی رفعت کے باعث وجدانیت ہی کی ترجمانی کرتا ہے، ہر منطقی اور ہر فلسفی سے افضل و اشرف ہے!

ایک فلسفی کی نگاہ کے سامنے جب کوئی چیز آتی ہے، تو وہ بالکل اجنبی اور جاہل ہوتا ہے۔ اور ایک شاعر کے سامنے جب کوئی چیز آتی ہے، تو وہ معلوم شدہ اور بے نقاب آتی ہے۔ فلسفی ڈھونڈھتا رہتا ہے اور شاعر پہچانتا رہتا ہے! وہ منتشر حقیقتوں میں ربط دے دیکر ایک حقیقت الحقائق مان لیتا ہے۔ اور یہ حقیقت الحقائق کے اُس آفتاب کو اپنے پہلو میں دیکھتا ہے، جس کی شعاعوں کو حقائق عالم سے تعبیر کیا جانا چاہیئے! اُس کا منتہائے نظر ایک نقطۂ تاریک و مجہول ہے، اور اسکا مطمحِ نگاہ یکسر نور!

سُہا (مقدمۂ مطالب الغالب)

---

**شعر، حکمت** ۔ اور الہام کو وحی سے کیا نسبت ہے؟ شعر زندگی کی ایک تڑپ ہے، ایک جذبہ ہے، ایک شرر ہے جو خود زندگی کے بہترین و منزہ ترین حاصلِ تعمیر، خدا کے گھر یعنی انسانی دل سے بہ لباسِ صوت باہر ٹپکتا ہے اور فضائے بیرونی میں قرار نہیں پکڑتا، جب تک کہ دوسرے دلوں میں جاکر دل نہیں بن جاتا، یا پھر عین زندگی نہیں ہو جاتا ..........

حکمت کمالِ علم و کمالِ عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایک جستجوئے صداقت ہے؛ گو عین صداقت نہیں۔ وحی شعر و حکمت دونوں پر حاوی ہے۔ اور دونوں کے کمالات کا

مجموعہ۔ وحی میں جو بات بالخصوص ممیز ہے، وہ اس میں صداقتِ حقہ کا جوہر ہے جس پر حیاتِ حقیقی کا تمامتر دارومدار ہے۔ وحی کا حامل اس صداقت پر بدرجۂ اتم ایقان و ایمان رکھتا ہے۔ "لاریب فیہ" وحی کے ہر جملے، ہر لفظ، ہر حرف کی شان ہوتی ہے۔ پس جو فرق عینِ صداقت و جستجوئے صداقت میں ہے، وہی فرق مُرسل و حکیم میں ہے۔ یہی نورِ صداقت جس آتشی لباس میں خدا کی طرف سے آراستہ کرکے عطا کیا جاتا ہے، اُسی کا نام شعریت ہے۔ صداقتِ کاملہ لاینفک ہے۔ محض شاعر کبھی کامل شاعر نہیں ہوتا، بعینہٖ اُسی طرح محض حکیم کبھی کامل حکیم نہیں ہوتا۔ شاعر کی بھی حاملِ وحی سے وہی نسبت ہے جو حکیم کی ہے۔ صرف پہلو دوسرا ہے بغیر مجدد و دِ وحی ہونے کے شاعر شعریتِ حقہ کا مالک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہی الفاظ میں جستجوئے شعر میں سرگرداں رہتا ہے۔ لہذا جو فرق عینِ شعریت و جستجوئے شعریت میں ہے وہی ایک حاملِ وحی شاعر میں ہوگا۔ گویا شعر و حکمت وحی کے دو ایسے اہم خواص ہیں جو محض شاعر و محض حکیم میں اپنے کمال کو نہیں پاتے۔ شعر و حکمت بلاتکلف قلبِ انسانی پر نازل و وارد ہوں، مگر اُنکے اندر کی صداقت انتہائی صداقت کا درجہ نہ رکھتی ہو یا مُشتبہ ہو تو اُسے الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ پایہ کا شاعر اور اعلیٰ پایہ کا حکیم عموماً ملہم ہوتا ہے۔　　(ہزار داستان)

---

**ہندی شاعر کا نغمۂ صباحی۔** اے نیند کی متوالی اب جاگ اُٹھ۔
چاند ڈوب گیا ہے؛ ستارے دُھندلے ہو گئے ہیں، رات کے یہ سب ساتھی کوچ کر چکے ہیں۔
چراغ کی روشنی جھلملا رہی ہے، کیونکہ بادِ نسیم چل رہی ہے۔
صبح کا تڑکا ہو گیا ہے، گویا یہ معلوم ہو رہا ہے کہ کسی مہجور کا سینہ شق ہو گیا ہے۔
کنور شاعر تجھے جگا رہا ہے کہ اے مستِ خواب، اب جاگ اُٹھ، کہ تیری قسمت سے پھر رات ہو گی۔　　مترجمہ حضرت کیفی (خادمِ کعبہ)

---

**ازلیت رُوح۔** ازلیتِ رُوح کے مسئلہ کو حل کرنے کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ نہ صرف انسان ہی کو زیرِ غور رکھا جائے بلکہ حیوانات و نباتات اور مختصر یہ کہ تمام اُن اشیاء کو شامل کیا جائے جو پیدا ہوتی ہیں ہر صفت یا موصوف جو اپنی ضد رکھتا ہے اپنی ہی ضد یا مقابل سے مستنبط ہوتا ہے۔ عزیز و ذلیل منصف و

غیر منصف وامتاالیم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ آیا ہر وہ شے جو اپنی ضد رکھتی ہے بالضرور اپنی ضد ہی سے مستخرج ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو چیز آج چھوٹی ہے وہ پہلے ضرور بڑی ہوگی۔ اسی طرح بڑی چیز کا ماضی میں چھوٹا ہونا بھی یقینی ہے، ضعف قوت میں منتقل ہوتا ہے اور سرعت آہستگی سے تبدیل ہوجاتی ہے، علیٰ ہذا برائی بھلائی سے اور انصاف ناانصافی سے۔ واقعی یہ ایک نہایت جامع قانون ہے کہ ضدین مبڈیکدیگر ہیں اور یہ سلسلہ نہایت محکم و استوار ہے۔ خواب کے بعد بیداری پیدا ہوتی ہے اور بیداری کے بعد خواب وقوع پذیر ہوتا ہے۔ گویا انکی دو اقساط ہیں، اول سونا دوم جاگنا اس دوامی تبادلۂ باہم کی ضرورت بھی ظاہر ہے۔ اگر اشیاء کی حالتوں کا یہ دور مسلسل اور غیر منتہی نہ ہو تو نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر خواب و بیداری مؤدی بہ یکدیگر نہ ہوں یعنی قسط اول کے بعد قسط ثانی ظاہر نہ ہو تو ایک وقت ایسا آئے کہ ہر ذی روح سیاست ابدی میں پڑجائے۔ اب زندگی اور موت کو لیجئے ان دونوں اقساط میں سے ایک قسط یعنے مرنا یقینی ہے۔ تو ہم کیا اس کی کوئی ضد قرار نہ دینگے؟ کیا اس صورت میں قدرت نامکمل ہے؟ نہیں مرنے کی ضد ضروری ہے اور وہ سوائے زندہ ہونے کے اور کچھ نہیں ہوسکتی جب موت کی ضد زندگی، اور زندگی کی ضد موت ٹھیری تو لازم آیا کہ تمام جاندار اشیاء مردہ اشیاء سے زندگی پائیں اور اس سے ہماری روحوں کا ازلی وجود ثابت ہوتا ہے۔ (نگار)

---

انتقام۔ انتقام ایک قسم کا وحشیانہ انصاف ہے اور انسان کے دل سے اس ناپاک جذبہ کی بیخکنی قانون کا پہلا فرض ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جرم کا پہلا ارتکاب قانون کے خلاف اور قانون کو نقصان پہنچانے کے لئے ہوتا ہے لیکن اس جرم کا بدلہ لینے والا تو قانون کو بالکل بیکار اور معطل کردیتا ہے۔ انتقام لیکر انسان خود مجرم بن جاتا ہے لیکن اگر وہ بدلہ لینے سے درگذر کرے تو وہ یقیناً اپنے دشمن سے بہتر اور افضل ہے سلیمان کا قول ہے کہ خطا سے درگذر کرنا انسان کے اعلیٰ ترین فضائل میں سے ہے جو کچھ ہوچکا وہ تیراز کمان رفتہ کا مصداق ہے اور گذشتہ کا افسوس کرنا عقلمندوں کا کام نہیں پس وہ لوگ جو انتقام کے جذبہ کو اپنا خون دل پلا کر پرورش کرتے ہیں خود اپنے دشمن اور بدخواہ ہیں۔ دنیا میں کوئی شخص جرم کا ارتکاب محض مجرم بننے کے لئے نہیں کرتا۔ ارتکاب جرم عموماً کسی فائدہ یا نفع کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ مجرم اپنی ذات سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اب یہ انتہائے حماقت ہوگی کہ کوئی کسی سے اس بات پر لڑے کہ وہ اپنے کو دوسروں کی

نسبت کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اگر بفرض محال کوئی شخص اپنے خبث نفس سے مجبور ہو کر جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس سے باز پرس فضول ہے۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت ہے۔

نیشِ عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است　　　(آئینہ)

---

**انسان کی رُوحانیت** ۔ اگر ہم انسان کی قوتوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انکی وسعت محض شہوانی زندگی تک نہیں بلکہ اس سے پرے تک پہنچتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک جنگلی انسان کی خواہش اپنی حفاظت تک محدود ہو مگر کثرت سے اقوام انسانی ایسی ہیں جن کی حالت اس سے مختلف ہے۔ انکی آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دماغ میں وہ روشنی پہنچتی ہے جو ہماری زندگی کے اُس حصے کو منور کرتی ہے جسے حیوانی یا مادی زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ ہمیں رنگوں کے تناسب حسن صورت اور آوازوں کی موزونیت میں خاص لطف آتا ہے۔ حیوانی زندگی کو انکی مطلق ضرورت نہیں۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس میں حیوانی احساس کے علاوہ ایک اور احساس بھی ہے جسے روحانی کہنا چاہیئے کیونکہ اگر ہم اسے نہیں مانتے تو ایک خاص سلسلہ فطرتی تمیزوں احساسات اور قوت ارادی کا محض بیکار جاتا ہے انسان ایسی اشیاء سے بیحد مسرت اور لطف حاصل کرتا ہے جنہیں اس کے حیوانی احساس سے کچھ تعلق نہیں۔ آسمان پر خوشنما اور خوش رنگ دھنک کو دیکھ کر کتے یا گھوڑے کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔ حالانکہ انسان اس سے لطف اُٹھاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دیکھنے سے اُسکی روحانی زندگی پر اثر پڑتا ہے جو اسکی نشوونما کے لئے ضروری ہے یہانتک کہ بچے بھی اس لطف کا اظہار کرتے ہیں لوری یا گانا سننے سے نہیں بھی مزہ ملتا ہے۔ خوبصورت پھول دیکھنے سے وہ بھی اسی طرح خوش ہوتے ہیں"

(نظام کالج اُردو میگزین)

---

**مذاقِ عامہ کی قدامت پرستی** ۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں دوسرے مُلکوں کی شاعری کے نمونے روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، مگر ہمارے مُلک کے عام مذاق کی وہی کیفیت ہے جو پہلے تھی زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ مگر جہاں تھے وہیں ہیں۔ کبھی ایسی چیز جو زمانہ کے مطابق نہ ہو دیر پا

اثر پیدا نہیں کرتی۔ مانا کہ شاعری کو جذباتِ عشق و محبت سے نہ مٹنے والا تعلق ہے مگر ہر زمانہ کے عشق و محبت کی شان جدا ہوتی ہے، اور یہ ضرور نہیں ہے کہ اس کا تعلق کسی سادہ رُو ہی سے ہو بلکہ فطرت کی بوقلمونی، وطن کی کشش اور دلفریبی، قوم کی ترقی اور مُلک کی حُریت بھی اسکا موضوع ہو سکتے ہیں

(مولینا محمد عزیز مرزا مرحوم)

---

**انسان کے محرکاتِ عمل**۔ انسان کی تمام تحریکات کا سر بنیاد، محبت و خوف اور رغبتِ نفع و نفرتِ ضرر ہے۔ خدا اور اُس کے صفات کے متعلق انسان کے جو خیالات اور تصوّرات ہیں وہ بھی اسی اصول کے ماتحت ہیں۔ وحشی اقوام کے مذہبی خیالات پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ وہ مناظر و موجوداتِ فطرت کی پرستش اسی اصول کے مطابق کرتے ہیں، بعض چیزوں سے وہ ڈرتے ہیں، تو وہ اُن کی پُوجا کرتے ہیں، کہ ان کے ضرر سے محفوظ رہیں۔ بعض دوسری اشیاء کے لُطف و کرم کے متوقع ہوتے ہیں کہ اُن کے منافع سے بہرہ اندوز ہو سکیں ॰ (معارف)

---

**نفس اور مادے کا تعلق**۔ نفسیات کے یورپین معلمین کا قول ہے کہ نفس انسانی میں صرف خارجی اور مادی تحریک ہی کی وجہ سے کوئی کام ہو سکتا ہے اور اُس حالت میں بھی جب وہ اپنے طور پر بالکل علیحدہ مشغول ہو، وہ کچھ نہیں کرتا مگر صرف عالمِ شہود کی مادی اشیاء اور مادہ کے متعلق اپنے گذشتہ تجربات کی تشریح و تنویع۔ غرض نفس کا تختہ مشق صرف مادہ ہے۔ یوگی اس نظریہ کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور اُن کے خیال میں اک بالکل جداگانہ اور بہتر دُنیا موجود ہے جو دماغ کی حقیقی کارگاہ ہے اور جسے مادی دنیا سے بالکل تعلق نہیں ہے۔

وہ حیاتِ انسانی کا مرکز نفس قرار دیتے ہیں نہ کہ دماغ۔ اور مانتے ہیں کہ اگر نفس چاہے تو جملہ حواس کو جسم سے علیحدہ کر کے اس غیر مادی دُنیا میں مصروف کر سکتا ہے۔ وہ انسان کو خواص نسل اور اثر ماحول کا بندہ تصوّر نہیں کرتے بلکہ وہ نفس کی اختیاری قوت کے قائل ہیں، جو ان طوقوں کو توڑ کر انسان کو آزاد اور صاحب ارادہ کر سکتی ہے ॰ (نظام کالج اُردو میگزین)

---

**ایک سلطنت کا استحکام کن امور پر منحصر ہے؟** ۔ ایک سلطنت کو حاصل کرنے میں عوام الناس کا جوش بہت بڑا عنصر ہے۔ جب ایک قبیلہ یا فوج کے افراد میں ایسا اتفاق ہو اور ان کے اغراض و مقاصد اور احساسات اس طرح متحد ہوں کہ وہ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں اور ہر قسم کا ایثار کرنے پر راضی ہوں تو ان کا قائد نہایت آسانی کے ساتھ ایک سلطنت قائم کرسکتا ہے۔ لیکن اس قائد کو اپنے تابعین ہی کے جوش اور ہمدردی پر تکیہ نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کو چاہیئے کہ اُن لوگوں کو اپنے قابو میں اور اپنا مطیع رکھے جن کے جوش اور عقیدت کی وجہ سے اس کو یہ سلطنت حاصل ہوئی ہے۔ وہ ایک دیرپا اور مستقل سلطنت صرف اسی وقت قائم کرسکتا ہے جب وہ انتظام اچھا رکھے عدل و انصاف اور امن و امان کو ترقی دے، عاقلانہ قوانین بنائے، ایک باقاعدہ فوج کھڑی کرے، اور اپنے اور اپنے خاندان کا رعایا کو گرویدہ بنالے، (اسکے بعد مصنف نے بیان کیا ہے) کہ چونکہ مذہب ہی صرف ایک ایسی قوت ہے جس کی بدولت سلطنت میں بغض و عداوت، لڑائی جھگڑے اور رقابت کی جگہ دوستی، اتفاق، تعاون اور جوش کا دور دورہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے ایک بڑی سلطنت کے استحکام کے لئے اس سے بہتر کوئی اور بنیاد نہیں ہوسکتی۔ لیکن جوش مذہبی اس وقت تک بیکار ہوتا ہے۔ جب تک کہ اس کا حلقۂ اثر وسیع نہ ہو۔ اور جب تک کہ منافقوں گروہ اسکے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے۔ خدائے تعالٰے اصلاح کا کام صرف اُن لوگوں کے سپرد کرتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔ یا جن پر اکثر الناس ایمان نہ لائیں وہ اس کے رسول نہیں ہوسکتے جمہور کا اجماع اور عملی کامیابی ایک ربانی صداقت پر شاہد ہوا کرتی ہیں ؂

(الناظر)

# پیارا پیارا گھر اپنا

(نتیجۂ فکر جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی۔اے)

وہ چین کہاں اپنے گھر کا وہ بات کہاں اپنے گھر کی
پیارا پیارا گھر اپنا

وہ راج کہاں اپنے گھر کا وہ رات کہاں اپنے گھر کی
آنکھوں کا تارا گھر اپنا

سُکھ چین اگر دُنیا میں ہے اپنے ہی گھر میں ملتا ہے
سُکھ کا سہارا گھر اپنا

دُکھ درد کی گر کوئی دوا ہے اپنے ہی گھر کی سیوا ہے
دُکھ کا مداوا گھر اپنا

وہ گھر والی سُندر چترا گھر کی سیوا کرنے والی
دل کا دلاسا گھر اپنا

آرام ہمیں دینے والی آپ مُصیبت بھرنے والی
جان سے پیارا گھر اپنا

آنکھوں کے تارے لاڈلے گھر کے سب مل کر گھر سر پہ اُٹھاتے
دودھوں نہایا گھر اپنا

کھیلتے ہنستے روٹھتے منتے سُنتے کہانی سوتے سلاتے
بسا بسایا گھر اپنا

ہم پر جان چھڑکنے والا وہ پروان چڑھانے والا
پالنے والا گھر اپنا

وہ بلوان بنانے والا وہ انسان بنانے والا
ڈھالنے والا گھر اپنا

وہ پاک ہُوا اپنے گھر کی پیار کی جلا اپنے گھر کی
دل میں سمایا گھر اپنا

ایثار وفا اپنے گھر کی وہ درد دیا اپنے گھر کی
روح پہ چھایا گھر اپنا

جڑ بنیاد وطن کی گھر ہے وطن گھروں کا اپنے گھر ہے
اپنے گھروں کا گھر اپنا

اپنے گھر پہ نثار وطن ہے اور وطن کے صدقے گھر ہے
وطن کا شیدا گھر اپنا

وطن کی چاہت اپنے گھر سے وطن کی طاقت اپنے گھر سے
وطن کا پیارا گھر اپنا

وطن کی دولت اپنے گھر سے وطن کی عزت اپنے گھر سے
راج دُلارا گھر اپنا

(اُردو)

# حصۂ نظم

## گُلِ آخرِ بہار

اے گُلِ آخرِ بہارِ چمن ننگ و ناموسِ شاخسارِ چمن
مائیہ نازِ جانِ زارِ چمن نشۂ باغ کا خمار ہے تو!
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو!

ایک جانب خزاں کی یورش ہے اک طرف آسماں کی یورش ہے
یعنی دورِ زماں کی یورش ہے سب کے پہلو میں گویا خار ہے تو!
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو!

رنگ و بو ہے مگر ترنگ نہیں ڈھنگ تیرے سلف کے ڈھنگ نہیں
اپنے آبا سا شوخ و شنگ نہیں پُر تہوّر نہ باوقار ہے تو!
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو!

گو ترا عہد شاندار نہیں گو ترا بخت کامگار نہیں
گو تری وضع باوقار نہیں پھر بھی گلشن کا تاجدار ہے تو
عہدِ ماضی کی یادگار ہے تو!

ابنِ حزین

## سارناتھ

(بے قافیہ)

وہ طرازِ دامنِ کاشی، زمینِ سارناتھ باعثِ صد افتخارِ ہند ہے جس کا وجود

قبلۂ اُمیدِ مشرق، کعبۂ جاپان و چین
آستاں جس کا کبھی تھا مرجعِ ہر خاص و عام

مرکزِ تعلیمِ گوتم درس گاہِ رازِ حق
ہند نے پایا جہاں سے درس رحم و لطف کا

رہ چکی ہے مدتوں روشن جہاں وہ شمعِ حق
جس کے پرتو سے تھا ہر ذرّہ یہاں کا آفتاب

مجلسیں یاں گرم رہتی تھیں جو وعظ و پند کی
مجمعِ قدوسیاں سے وہ نہ تھیں رتبہ میں کم

جس کا ذرّہ ذرّہ ہے سازِ نوائے باستاں
جسکا گوشہ گوشہ ہے اک داستاں تاریخ کی

انقلابِ دہر کی واضح یہ اک تفسیر ہے
ہند کی عظمت کی اک بگڑی ہوئی تصویر ہے

کل جہاں استادہ تھی اک خانقاہِ شاندار
یادگار اُس کی وہاں اک تودۂ خاکی ہے آج

ابرِ باراں، بادِ صرصر، گرمیٔ خور، خاکِ شور
سب کے سب ہیں درپئے تخریبِ آثارِ قدیم

پھول پتے جو بنے تھے اُسکے سنگ و خشت پر
آج اُگ آئے ہیں خودرو پودے اُنکے درمیان

رنگ سبزے نے جمایا ہے در و دیوار پر
سیم و زر[۱] ملتے تھے جن پر پیروانِ بدھ کبھی

بلبلِ حق گو جہاں تھا زمزمہ پیرائے حق
اُس کی وہ سنت ادا کرتے ہیں اب واں زاغ و بوم

یاد اسی ویرانے سے دُنیا میں اُس گوتم کی ہے
جس نے نورِ حق کی خاطر تج دیا سب تاج و تخت

عیش و عشرت، دولت و ثروت سے نفرت تھی جسے
پادشاہی جو سمجھتا تھا حکومت نفس کی

جس کی چشمِ رازبیں خونبار رہتی تھی، جو وہ
دیکھ پاتا تھا کہیں آہوئے صحرا کو فگار

ہاتھ اُٹھانا جانداروں پر جسے تھا ناگوار
اپنے نالوں سے کیا تسخیر جس نے اک جہاں

آج تک اُسکے قدم کا فیض ہے اس خاک میں
ہے اثر اکسیر کا اس سرزمینِ پاک میں

سید حسن

---

۱ بدھ کے پیرو جب سارناتھ کی زیارت کو آتے تھے تو اسٹوپا کی دیواروں پر سیم و زر ملتے تھے۔

# جذباتِ عالیہ

## مرزا بیدل مرحوم

زرہ ہوس بتو کے رسم نفسے زخود نہ رسیدہ من ہمہ حیرتم بکجا روم برہت سرے نکشیدہ من

ہمہ ترک سازِ طرب کنم زچہ جام نشہ طلب کنم گل باغ شعلہ نہ چیدہ من من داغ دل نہ چشیدہ من

چو گل آنکہ نسخۂ صدچمن زنقاب جلوہ کشودہ تو چو مے آنکہ عشرت عالمے زگداز خود طلبیدہ من

چہ بلا ستمکشِ غیرتم چہ قدر نشانۂ حیرتم کہ شہید خنجر ناز تو شدہ عالمے تو طپیدہ من

تو بہ محفلے نہ نمود روکہ زتاب شعلہ غیرتش ہمہ اشک گشتہ برنگ شمع زچشم خود نہ چکیدہ من

مئے جام ناز و نیاز ہا بجمار ا اگر نہ کشد چرا زسرِ جفا نگذشتہ تو زدرِ وفا نہ رمیدہ من

چو نگاہ گرم بہر طرف کہ گذشتہ محمل ناز تو چو دل گداختہ از بیت بر کاب اشک دویدہ من

تو و صد چمن طربِ نمو من و شبنمے نگہ ابر و بہ بہار عالم رنگ و بو ہمہ جلوہ تو ہمہ دیدہ من

نہ جنون سینہ دریدنی نہ فنون مشق طپیدنی بسواد درد تو کہ رسم الفے زنالہ کشیدہ من

چو سحر نیامدہ در نظر رم فرصت نفس آنقدر کہ برم برآب شگفتگی بطراوتِ گل چیدہ من

بکدام نغمۂ دل گسل زنوا کشاں نہ شوم خجل چو جرس بغیر شکست دل سخنے زخود نہ شنیدہ من

من و بیدل و غم غفلتے کہ زچشم بند فسونِ دل ہمہ جا ز جلوۂ من پُر است و ہیچ جا نہ رسیدہ من

## اختر دہلوی

عقیق از یمن و لو ہر از عدن خیزد ہزار جوہر انسانی از دکن خیزد

سرم فدائے غبار رے کہ از دکن خیزد دلم نثار ہوائے کہ از چمن خیزد

اگر نگاہ مہارا جہ سوئے من خیزد زسبزہ ام ہمہ گلہائے یاسمن خیزد

صبا نہالِ محبت دگر ببار آور پس از ہزار قرن یکتن از قرن خیزد

قیام پرسش اعمال خلق بر افتد | بمحشریکہ شہید تو بے کفن خیزد
فغاں کز آتشِ دل آنقدر نماند بجائے | کہ تیر غمزۂ او سر فروز تن خیزد
بصید دل چو خم زلف یار بنشیند | ہزار طرّۂ آہم بہر شکن خیزد
ز شوخ چشمیٔ ما بندگانِ گرم نیاز | تبسم از لب و گفتار از دہن خیزد
اگر کنند بدر خون من کشن پرشاد | ز قطرہ قطرہ صدائے کشن کشن خیزد
سوادِ خامہ عنبر فشانِ شاد دکن | مثال نافۂ مشک است کز ختن خیزد
بذکر خیر و دعا و ثنائے او باشد | ہزار نالہ کہ ہر شب ز جانِ من خیزد
لبے کہ نیست دعاگوئے دولت و عمرش | قضا ز سوزن الماس دوختن خیزد
عجب گلے ز گلستانِ راجہ چندو لال | شگفتہ شد کہ شمیمش بہر چمن خیزد
ادب نداد اجازت کہ پیشِ لعل لبش | زبانِ اخترکم گو پئے سخن خیزد

---

تا چند بما بوسہ بہ پیغام بیا شام | اغماض مفرما و بیا شام بیا شام
یک شام بیارام دو سہ جام بیا شام | اے یار بیا شام بیا شام بیا شام
قربان لبِ لعل تو یکجام بیا شام | قربانِ قدوم تو شوم شام بیا شام
در کلبۂ احزان من اے ماہ دل افروز | از چشم سیاہ و لب لعل و سر کاکل
یکشام بیارام و دو سہ جام بیا شام | ایما ست کہ با بادہ و با جام بیا شام
در بزم شہاں گر مئے صافی است لبالب | با غمزدہ گاں دردِ تہ جام بیا شام

در کوئے مغاں بر گزرم شور بر آمد
تمشید علیخانِ مے آشام بیا شام

# تسلّی

جان دادۂ فریبِ تمنائے یار ہوں | اُمید کچھ نہیں مگر اُمیدوار ہوں
ہوں اور شرارِ سنگ سے ناپائدار ہوں | میں اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار ہوں

سب میں ذلیل ہوں تری نظروں میں خوار ہوں
یہ انتہا ہے اپنی طبیعت پہ بار ہوں

پہلی نظر کے ہوش و خرد نذر ہو گئے
میں کیا بتاؤں کس کے لئے بیقرار ہوں

اک وہ بھی ہیں کہ انکو جفاؤں پہ ناز ہے
اک میں بھی ہوں کہ کر کے وفا شرمسار ہوں

بربادیوں کا میری نکھرتا چلا ہے رنگ
باغِ جہاں میں اپنی خزاں کی بہار ہوں

ہونا بھی میرا یوں تو نہ ہونے سے کم نہیں
پھر بھی جہان میں رونق لیل و نہار ہوں

عالم میں تیری شان کریمی کی دھوم ہے
میں بھی جہاں میں اے مرے پروردگار ہوں

مِٹ کر گئیں نہ دل کی تسلی تعلیاں
کہتا ہے "ہوں تو آرزوؤں کا مزار ہوں"

## غریب سہارن پوری

ایسی بہار میں بھی تو بلبل خموش ہے
غافل یہی زمانہ جوش و خروش ہے

بیخود ہوئے ہیں پی کے مئے عشق بادہ نوش
دنیا کی کچھ خبر ہے نہ عقبےٰ کا ہوش ہے

کیا پوچھتے ہو بزمِ نشاط و طرب کا حال
اک شمع رہ گئی ہے کہ وہ بھی خموش ہے

پیر مغاں کا قول ہے ہر ایک دل نشیں
جو بات ہے وہ قابل تسلیم گوش ہے

جاری ہیں میرے دیدۂ تر سے سرشکِ خون
دامن کی ہر کلی سبد گلفروش ہے

رنگیں بنے ہیں سب کے گلستاں میں پیرہن
شمشاد سبزپوش ہے گل سُرخ پوش ہے

سب ڈھونڈتے ہیں تجھکو ہے سب کو تری تلاش
خرقہ بدوش کوئی کوئی دلق پوش ہے

رخصت ہُوئیں غریب جوانی کی گرمیاں
وہ ولولے رہے نہ وہ جوش و خروش ہے

## شاد عظیم آبادی

پوچھو نہ حال چشم دل آویز یار کا
کھولو نہ راز گردش لیل و نہار کا

اس چشم نیم خواب سے کس کو یہ تھی امید
جادو جگائے سرمۂ دنبالہ دار کا

قبلۂ اُمیدِ مشرق، کعبۂ جاپان و چین — آستان جس کا کبھی تھا مرجعِ ہر خاص و عام
مرکزِ تعلیم گوتم درس گاہِ رازِ حق — ہند نے پایا جہاں سے درس رحم و لطف کا
رہ چکی ہے مدتوں روشن جہاں وہ شمعِ حق — جس کے پرتو سے تھا ہر ذرّہ یہاں کا آفتاب
مجلسیں یاں گرم رہتی تھیں جو وعظ و پند کی — مجمعِ قدوسیاں سے وہ نہ تھیں رتبہ میں کم
جس کا ذرّہ ذرّہ ہے سازِ نوائے پاستاں — جسکا گوشہ گوشہ ہے اک داستاں تاریخ کی

انقلابِ دہر کی واضح یہ اک تفسیر ہے
ہند کی عظمت کی اک بگڑی ہوئی تصویر ہے

کل جہاں استادہ تھی اک خانقاہِ شاندار — یادگار اُس کی وہاں اک تودۂ خاکی ہے آج
ابرِ باراں، بادِ صرصر، گرمیٔ خور، خاکِ شور — سب کے سب ہیں درپئے تخریبِ آثارِ قدیم
پھول پتے جو بنے تھے اُسکے سنگ و خشت پر — آج اُگ آئے ہیں خودرو پودے اُنکے درمیان
رنگ سبزے نے جمایا ہے در و دیوار پر — سیم و زر[1] ملتے تھے جن پر پیروانِ بدھ کبھی
بلبلِ حق گو جہاں تھا زمزمہ پیرائے حق — اُس کی وہ سنت ادا کرتے ہیں اب واں زاغ و بوم
یاد اسی ویرانے سے دُنیا میں اُس گوتم کی ہے — جس نے نورِ حق کی خاطر تج دیا سب تاج و تخت
عیش و عشرت، دولت و ثروت سے نفرت تھی جسے — پادشاہی جو سمجھتا تھا حکومت نفس کی
جس کی چشمِ رازبیں خونبار رہتی تھی، جو وہ — دیکھ پاتا تھا کہیں آہوئے صحرا کو فگار
ہاتھ اُٹھانا جانداروں پر جسے تھا ناگوار — اپنے نالوں سے کیا تسخیر جس نے اک جہاں

آج تک اُسکے قدم کا فیض ہے اس خاک میں
ہے اثر اکسیر کا اس سرزمینِ پاک میں

سید حسن

---

[1] بدھ کے پیرو جب سارناتھ کی زیارت کو آتے تھے تو اسٹوپا کی دیواروں پر سیم و زر ملتے تھے۔

# جذباتِ عالیہ

## مرزا بیدل مرحوم

زرہ ہوس بتو کے رسم نفسے زخود نہ رمیدہ من　　ہمہ حیرتم بکجا روم برہت سرے نکشیدہ من
ہمہ ترک سازِ طرب کنم زچہ جام نشہ طلب کنم　　گلِ باغ شعلہ نہ چیدہ من من داغ دل نہ چشیدہ من
چو گل آنکہ نسخۂ صد چمن زنقاب جلوہ کشودہ تو　　چو مے آنکہ عشرت عالمے زگداز خود طلبیدہ من
چہ بلاستمکشِ غیرتم چہ قدر نشانۂ حیرتم　　کہ شہید خنجر نازِ تو شدہ عالمے تو طپیدہ من
تو بہ محفلے نہ نمود روکہ ز تاب شعلہ غیرتش　　ہمہ اشک گشتہ برنگ شمع زچشم خود نہ چکیدہ من
مے جام ناز و نیاز ہا نجمارِ اگر نہ کشد چرا　　زسرِ جفا نگذشتہ تو زدرِ وفا نہ رمیدہ من
چو نگاہ گرم بہر طرف کہ گذشتہ محمل ناز تو　　چو دل گداختہ از پیت بر کاب اشک دویدہ من
تو و صد چمن طربِ نمو من و شبنمے نگہ ابرو　　بہ بہار عالم رنگ و بو ہمہ جلوہ تو ہمہ دیدہ من
نہ جنون سینہ دریدنی نہ فنون مشق طپیدنی　　بسواد درد تو کہ رسم الفے ز نالہ کشیدہ من
چو سحر نیامدہ در نظر رم فرصت نفس آنقدر　　کہ برم بر آب شگفتگی بطراوتِ گل چیدہ من
بکدام نغمۂ دل گسل زلواکشاں نہ شوم خجل　　چو جرس بغیر شکست دل سخنے زخود نہ شنیدہ من
من و بیدل و غم غفلتے کہ زچشم بند فسونِ دل　　ہمہ جا ز جلوۂ من پُر است و بہیچ جا نہ رسیدہ من

## اختر دہلوی

عقیق از یمن و گوہر از عدن خیزد　　ہزار جوہر انسانی از دکن خیزد
سرم فدائے غبارے کہ از دکن خیزد　　دلم نثار ہوائے کہ از چمن خیزد
اگر نگاہ مہاراجہ سوئے من خیزد　　ز سبزہ ام ہمہ گلہائے یاسمن خیزد
صبا نہالِ محبت دگر بسبار آور　　پس از ہزار قرن یکتن از قرن خیزد

قیام پرسش اعمال خلق بر افتد　　بمحشر یکہ شہید تو بے کفن خیزد
فغاں کز آتش دل آنقدر نماند بجائے　　کہ تیر غمزۂ او سر فروز تن خیزد
بصید دل چو خم زلف یار بنشیند　　ہزار طرۂ آہم بہر شکن خیزد
زشوخ چشمیٔ ما بندگانِ گرم نیاز　　تبسم از لب و گفتار از دہن خیزد
اگر کنند بدر خون من کشن پرشاد　　ز قطرہ قطرہ صدائے کشن کشن خیزد
سوادِ خامہ عنبر فشانِ شاد دکن　　مثال نافۂ مشک است کز ختن خیزد
بذکر خیر و دعا و ثنائے او باشد　　ہزار نالہ کہ ہر شب ز جانِ من خیزد
لبے کہ نیست دعاگوئے دولت و عمرش　　قضا ز سوزن الماس و دوختن خیزد
عجب گلے ز گلستانِ راجہ چند و لال　　شگفتہ شد کہ شمیمش بہر چمن خیزد
ادب نداد اجازت کہ پیشِ لعل بگش　　زبانِ اخترکم گو پئے سخن خیزد

---

تا چند بما بوسہ بہ پیغام بیا شام　　اغماض مفرما و بیا شام بیا شام
یک شام بیارام دو سہ جام بیا شام　　اے یار بیا شام بیا شام بیا شام
قربان لب لعل تو یکجام بیا شام　　قربانِ قدوم تو شوم شام بیا شام
در کلبۂ احزان من اے ماہ دل افروز　　از چشم سیاہ و لب لعل و سر کاکل
یکشام بیارام دو سہ جام بیا شام　　ایماست کہ با دبادہ و باجام بیا شام
در بزم شہاں گر مئے صافی است بکامت　　با غمزدگاں دردِ تہ جام بیا شام
در کوئے مغاں ہر گز رم شور بر آمد
تمشید علیخانِ مے آشام بیا شام

## تسلی

جان دادۂ فریب تمنائے یار ہوں　　اُمید کچھ نہیں مگر اُمیدوار ہوں
ہوں اور شرار سنگ سے ناپائدار ہوں　　میں اعتبارِ ہستیٔ بے اعتبار ہوں

سب میں ذلیل ہوں تری نظروں میں خوار ہوں
یہ انتہا ہے اپنی طبیعت پہ بار ہوں
پہلی نظر کے ہوش وخرد نذر ہو گئے
میں کیا بتاؤں کس کے لئے بیقرار ہوں
اک وہ بھی ہیں کہ انکو جفاؤں پہ ناز ہے
اک میں بھی ہوں کہ کرکے وفا شرمسار ہوں
بربادیوں کا میری نکھرتا چلا ہے رنگ
باغِ جہاں میں اپنی خزاں کی بہار ہوں
ہونا بھی میرا یوں تو نہ ہونے سے کم نہیں
پھر بھی جہان میں رونق لیل و نہار ہوں
عالم میں تیری شانِ کریمی کی دھوم ہے
میں بھی جہاں میں اے مرے پروردگار ہوں
مٹ کر گئیں نہ دل کی تسلی تعلیاں
کہتا ہے "ہوں تو آرزوؤں کا مزار ہوں"

## غبر سہارن پوری

ایسی بہار میں بھی تو بلبل خموش ہے
غافل یہی زمانہ جوش و خروش ہے
بیخود ہوئے ہیں پی کے مئے عشق بادہ نوش
دنیا کی کچھ خبر ہے نہ عقبےٰ کا ہوش ہے
کیا پوچھتے ہو بزمِ نشاط و طرب کا حال
اک شمع رہ گئی ہے کہ وہ بھی خموش ہے
پیر مغاں کا قول ہے ہر ایک دل نشیں
جو بات ہے وہ قابلِ تسلیم گوش ہے
جاری ہیں میرے دیدۂ تر سے سرشکِ خون
دامن کی ہر کلی سبد گلفروش ہے
رنگیں بنے ہیں سب کے گلستاں میں پیرہن
شمشاد سبز پوش ہے گل سرخ پوش ہے
سب ڈھونڈتے ہیں تجھکو ہے سب کو تری تلاش
خرقہ بدوش کوئی کوئی دلق پوش ہے
رخصت ہوئیں غریب جوانی کی گرمیاں
وہ ولولے رہے نہ وہ جوش و خروش ہے

## شاد عظیم آبادی

پوچھو نہ حال چشم دل آویز یار کا
کھولو نہ راز گردش لیل و نہار کا
اس چشم نیم خواب سے کس کو یہ تھی امید
جادو جگائے سرمۂ دنبالہ دار کا

قدرت اسی کی ورنہ یہ مُنہ آئینہ کا تھا
جھگڑا اُچکائے شانہ وگیسوئے یار کا

ہم سوچتے کسے ہیں ہمیں کو نہیں خبر
مالک ہے کون زندگیٔ مستعار کا

ساقی کی چشم مست پہ مشکل نہیں نگاہ
مشکل سنبھالنا ہے دل بے قرار کا

نافہم دل نے اور بھی مٹی خراب کی
خوگر بنا کے لذت ناپائیدار کا

پردیس میں خیال تک اب دیس کا نہیں
جی لگ گیا ہر ایک غریب الدیار کا

کس دن طلب کیا مجھے اس پردہ پوش نے
جب نام تک نہیں کفن تار تار کا

کس ناز سے کرینگے حسینان باغ رقص
گائیگی عندلیب ترانہ بہار کا

مرجاؤ شوق سے نہ کرو شاد پیش و پس
دل توڑتے ہو کیوں کسی اُمیدوار کا

## محمد عبدالحی صدیقی

اللہ رے مرے دل کی کیفیت پنہانی!
لبریز ترنم ہے ہر جذبۂ روحانی

معمور ہے جلووں سے نیرنگ کدہ دل کا
ہے چشم حقیقت بیں آئینہ حیرانی

وہ شوق کے عالم میں ہے درجۂ محویت
سب ایک ہیں احساس روحانی و جسمانی

اک بیخودیٔ مضطر طاری ہے مرے اوپر
ادراک حقیقت ہے کیفیت وجدانی

سب کچھ یہ مگر کیوں ہے میں جانوں کہ دل جانے
اسرار نہانی کی اچھی نہیں عریانی

# تقریظات

**خیالات طالستائی**۔ طالستائی روس کا سب سے بڑا مدبر مانا گیا ہے، اسکے فلسفہ آزادی کی قبولیت عامہ اور اسکے عظیم شخصیت کے سیاسی رعب داب کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ہماری بے مایہ زبان میں بھی چار کے قریب اس کی سوانح عمریاں اس زمانہ میں لکھی گئیں جب کہ سیاست و آزادی کی طرف سے ہمارے دل و دماغ پر سکون مطلق طاری تھا مہاتما گاندھی کے "پرامن سوراجیہ" کی بنیاد طالستائی کے خیالات پر ہی رکھی گئی ہے، زیر تبصرہ کتاب اس کے مشہور رسالہ "ایولز آف دی گورنمنٹز" کا ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ہر حیثیت سے نہایت قابلیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور ہندوستان جدید کی سیاسی فضا میں اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ موجودہ ہند کے لئے اس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔

مترجم جناب صاحبزادہ احمد سعید خانصاحب شوق (علیگ) ٹونکی سابق ایڈیٹر تمدن، فتح، کانگریس، ہیں جن کا اسم گرامی ترجمہ کی خوبیوں کے لئے کافی ضمانت ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا، قیمت ۸/

**محشرستان آئرلینڈ**۔ یہ رسالہ رئیس الاحرار مسٹر ڈی، ولیرا، آئرلینڈ کے مشہور محب وطن کی ایک تازہ تصنیف کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ ہے، اس میں مصنف نے آئرلینڈ کی داستان الم نہایت دردناک لہجہ میں سنائی ہے اور باشندگان امریکہ کو متوجہ کیا ہے۔ اسکا ترجمہ بھی جناب صاحبزادہ احمد سعید خانصاحب (علیگ) چیف ایڈیٹر روزنامہ سیاست (لاہور) نے کیا ہے، قیمت ۸/

دونوں کتابیں عطا برادرس تاجر کتب بیرون دہلی گیٹ لاہور سے طلب کیجائیں۔

**الفوز العظیم**۔ مولانا زاہد القادری نے خواجہ حسن نظامی دہلوی کے رسالہ "مرشد کو سجدۂ تعظیم" کے جواب میں "الفوز العظیم" کے نام سے یہ پمفلٹ شائع کیا ہے۔ خواجہ صاحب کے اس عقیدے کو کہ "مرید کا پیر کو سجدۂ تعظیم کرنا جائز ہے" مولانا زاہد نے آیات قرانیہ احادیث و تفاسیر

براہین عقلیہ سے باطل کیا ہے اور چونکہ حرام کو مباح سمجھنا اصول مذہب کی رُو سے کفر ہے۔ اسلئے مشاہیر علمائے اسلام نے "مرشد کو سجدۂ تعظیم" لکھنے پر خواجہ صاحب کی جو تکفیر کی ہے وہ تمام تکفیریں اس پمفلٹ میں شائع کردی گئی ہیں۔ غیر اللہ کو سجدہ خواہ تعظیمی ہو یا تعبدی اسکی حرمت میں عقل ونقل دونوں مولٰنا زاہد کی مؤید ہیں۔ البتہ "مرشد کو سجدۂ تعظیم" کا مصنف اس عقیدے کے سبب کافر ہو گیا۔ ہمارے خیال میں یہ مذہبی تشدد ہے غیر مسلموں کو مسلمان بنانیکی بجائے ذراسی لغزش پر مسلمانوں کو اسلام سے خارج کرنا احتیاط و مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ہم خواجہ صاحب سے بھی اتنا ضرور عرض کرینگے کہ وہ مذہبی عقیدوں کی بنیاد صوفیاء کے اقوال و افعال پر رکھنے میں احتیاط برتا کریں منصور حلاج اور بایزید بسطامی ؒ کا صوفیانہ تفوق۔ "انا الحق" اور سبحانی ما اعظم شانی" کے ہر مسلمان کے لئے جواز کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اسلام قرآن و حدیث کا نام ہے صوفیوں کی مجذوبانہ حرکات کا نام نہیں۔

الفوز العظیم کی قیمت آٹھ آنہ ہے:۔ ملنے کا پتہ ہلالی پریس دہلی۔

**تمدن**۔ دارالسلطنت کا وہی پرانا پرچہ ہے، جو کبھی مولوی راشد الخیری اور قاری عباس حسین صاحب دہلوی (علیگ) کی زیر ادارت نکلتا تھا، ایک عرصہ تک بند رہنے کے بعد قاری صاحب کی سرگرم کوششوں سے اب پھر شائع ہو رہا ہے زیر نظر نمبر میں مولٰنا ابوالکلام، خواجہ حسن نظامی سید سجاد حیدر جناب قاری سرفراز حسین صاحب، مولوی راشد الخیری اور حضرت نیاز فتحپوری کے مضامین خوب ہیں۔

قیمت سالانہ ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر۔ دفتر تمدن ٹیامحل دہلی سے طلب کیجئے۔

**الہلال**۔ یہ ایک ۷۰ صفحات کا ماہوار رسالہ ہے جو حال میں بہت اچھی لکھائی چھپائی کے ساتھ دہلی سے نکلنے لگا ہے، اسکے اشاعت ادب میں مذہب اور قومیت بھی شامل ہے، ایک حصہ معلومات کے لئے وقف ہے، زیر نظر اشاعت میں بعض مضامین خوب ہیں، "سرشار محبت کی صدا" کے عنوان سے جو مضمون جناب بالم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے نام کے ساتھ شائع ہوا ہے، وہ آدھے سے زیادہ رسالہ پیام امید (آگرہ) کے ایک مقالہ ادارت (از بیگم صاحبہ آزاد) سے بجنسہ بغیر تبدیلی الفاظ منقول ہے۔ صرف عہ سالانہ قیمت ہے + منیجر رسالہ الہلال دہلی سے طلب فرمائیے +

# فہرستِ مضامین بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۳ء

| جلد ۴ | نثر | نظم | نمبر ۴ |
|---|---|---|---|

## نثر



## نظم



## جذباتِ عالیہ

# جہاں نُما

کہتے ہیں کہ ساری دُنیا کی آنکھیں اس وقت جاپان کی طرف لگی ہُوئی ہیں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ جاپان کی طرف نہیں آسمان کی طرف لگی ہُوئی ہیں؛ جب بندے اپنے پروردگار کو بُھول جاتے ہیں۔ جب وہ اُسے یاد نہیں کرتے تو کبھی کبھی اُس کے جی میں آتا ہے کہ ان بھولنے والوں کو میں تو نہ بھول جاؤں انہیں سمجھا دوں کہ میں تمہیں بھولے ہُوئے نہیں ہوں شائد کہ اس سے انہیں وہ پیمانِ ازل یاد آجائے جو میرے اور ان کے درمیان بندھا تھا شائد کہ یہ زمین پر بیفکری میں چلنے پھرنے والے گاہے گاہے آسمان کی طرف دیکھنا بھی گوارا کر لیا کریں!

جاپانِ عظمت نشان اپنی شان و شوکت کے نشے میں چُور تھا موجودہ تمدن کے سب منتر اُسے ازبریاد ہوگئے تھے۔ ہیبت ناک توپیں خوفناک جنگی جہاز سبک رفتار طیارے یہ سب مہیا تھے، صنعت و حرفت کے کارخانے تعلیم و تربیت کے مقامات عیش و عشرت کے ساز و سامان کیا تھا کہ جاپان نے مغرب سے نہ سیکھ لیا تھا علم و فیشن کی کونسی ادا تھی جو اس منچلی قوم نے اختیار نہ کر لی تھی! جُوع الارض تدبر تکبر ان سب میں اُس نے اُستادِ دیرینہ کی حیثیت حاصل کر کے انجمنِ اقوام میں آپ اپنی نشستگاہ بنالی تھی! زبردستوں کی بستی میں جہاں مشرق کا قدم رکھنا خلافِ تہذیب اور باعثِ تخریب سمجھا جاتا تھا۔ اس مشرقِ اقصےٰ میں رہنے والی قوم نے اپنے زورِ بازو سے اپنا حصہ طلب کیا اور پالیا۔ ہم مشرقی جی ہی جی میں خوش ہُوئے کہ بلا سے ہم ناکارے سہی لیکن ہمارے ہی اک ہموطن نے غنیم کے دل میں گھر پیدا کر لیا ہے اور اب وہ ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوگا، کیا خوش خیالی تھی! خام خیالی تھی! اول تو اگر تہذیب کے معنی مغربیت ہو چکے ہیں تو جاپان اس بنا پر زمرۂ مغرب میں شامل ہو کر مشرق سے قطع تعلق کر چکا ہے اور اگر یہ نہیں تو اے قوتِ جاپان پر ناز کرنے والے ہندیو! کیا عجب ہے کہ محفلِ مشرق کا اک رُکن ہونیکی وجہ سے ہی اس دلیر قوم پر یہ آفت نازل ہُوئی ہے، تم جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے کیوں دوسروں کو اپنا بنا کر اُنہیں بھی تباہ کرتے ہو؟

کیا جاپان کی عیش پرستی نے اُسے تباہ کیا ہے؟ بعض لوگ ایسا کہتے ہیں، بلاشبہ انسان کو

اُس کے افعال کی سزا ملتی ہے مل کے رہتی ہے اور سزا نہیں ملتی جبتک یہ ضروری نہ ہو جائے کہ سزا ملے۔
خدائے قدیر کے حضور کسے مجال ہے کہ کہہ سکے کہ جاپان قصوروار نہ تھا۔ لیکن آپس میں سوچنے کی بات ہے کہ کیا غریب جاپان ہی سب سے بڑا قصوروار ہے؟ کیا ٹوکیو کی رنگ رلیاں پیرس کی عشرت پسندیوں سے بھی بڑھ کر ہیں؟ کیا وانسا اور لندن روما اور کلکتہ نیویارک اور قسطنطنیہ میں یوکوہامہ کی سی نامناسب کارروائیوں کا ظہور نہیں ہوتا؟ کیوں نہیں! ہوگا، ضرور ہوگا! دیکھنے والے کہہ رہے ہیں ہے اور ضرور ہے!
پھر جاپان ہی کو سزا ملی تو کیوں؟ جاپان کو سزا ملی تو اَور کب بچے رہے اور جو بچ رہا ہے وہ کب تک بھاگا پھریگا، اُس کا دن بھی قریب ہے قریب ہے اگر یہ انحراف قائم رہے! بھائیو! جاپان کو سزا نہیں ملی۔ ہوائے غرور میں اُڑنے والے لُطفِ عشرت میں بسنے والے مبادیاتِ علوم پر ناز کرنے والے موجودہ تمدن کو سزا ملی ہے۔ ہر فرد کو جو تکبّر میں مست عشرت میں منہمک اور اپنے علم و ہنر پر نازاں ہے سزا ملی ہے ہر دل کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ہشیار ہو جا بیدار ہو جا!
جاپان کو سزا نہیں ملی! آوازِ ہاتف نے اُسے خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا ہے اب اگر جاپان ہمت کی کمر باندھ لے اور صداقت کی راہ ڈھونڈلے تو جاپان سے زیادہ خوش قسمت مُلک اور کونسا ہوگا؟ جاپان جو اپنی مصیبتوں کے ذریعے سے دُنیا بھر کے گناہوں کا کفارہ دینے کو تیار نظر آتا ہے کیا عجب کہ وہ اپنے رنج و محن کی بنیاد پر اک الہٰی تعمیر کھڑی کر دے کہ دُنیا جہان کے مغرور و بدمست لوگ اُس کی عظمت سے خوف کھانے لگیں!
جاپان سے جس نے تمدن و پورٹ آرتھر میں مغربی قوت کے بُت کو سرنگوں کر دیا تھا جس نے اس دُنیائے شور و شر میں بے زبان مشرق کے حقوق کی ترجمانی کی ہے ہمیں یہی اُمید ہے کہ اب وہ اپنی مادّیت کے بُت کو ہمت کے تبر سے توڑیگا اور محوِ شور و غوغا تمدن کے ایوان میں اپنی متین خاموشی سے اک ہُو کا عالم پیدا کر دیگا!
خدا کا شکر ہے کہ انسانی غیرت میں حرکت کے آثار نظر آتے ہیں اور دُنیا کے بعض گنہگار اپنے تکلیف اُٹھانے والے بھائی کے لئے اپنی بیقرار دولت کا اک لاکھواں کروڑواں حصّہ دینے کو آمادہ معلوم ہوتے ہیں اور بعض دے بھی رہے ہیں!

بشیر احمد

# نسوانی دُنیا

حال ہی میں ڈاکٹر سدھندرا بوس صاحب کا ایک نہایت دلچسپ مضمون اخبار "ویلفیر" میں شایع ہوا ہے جس میں اُنہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ دُنیا میں نسل انسانی کی بقا اور اُسکی صحت اور بہبودی کیلئے اُتنی کوشش نہیں کیجاتی جتنی کہ مویشی اور اناج اور دیگر اشیاء خوردنی کی حفاظت اور بہتری کیلئے کیجاتی ہے چنانچہ اس بات کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جہاں ہر مُلک میں جا بجا ایسے مقامات ملتے ہیں۔ جن میں مویشیوں کی پرورش اور اُنکی نسلوں کی حفاظت کا انتظام کیا جاتا ہے اور چاول اور گیہوں اور دوسری اشیاء کے متعلق تجربے کئے جاتے ہیں وہاں دنیابھر میں آئُووا ہی صرف ایسا مقام ہے جہاں ننھے بچوں کے رکھ رکھاؤ اور اُنکی صحت کے متعلق ضروری تجربے کرکے نسل انسانی کو بہتر بنانیکی کوشش کیجاتی ہے۔ بچّوں کی بہبودی کا یہ مقام آئُووا میں (جو امریکہ میں واقع ہے) ۱۹۱۷ء میں قائم ہُوا تھا اور یہ اپنی قسم کا پہلا دارالتجربہ تھا۔ اسکے قائم کرنے سے یہ مقصد تھا کہ ننھے بچّوں کی پرورش کے متعلق جو نامناسب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اُنکا انسداد کیا جائے اور اُنکی بجائے صحیح اصولِ صحت قائم کئے جائیں۔ چنانچہ تجربے سے معلوم ہُوا تھا کہ جس گھر میں پانچ بچے تھے اُن میں سے عموماً دو یا تین کسی نہ کسی مرض میں مبتلا نظر آتے تھے۔ اُن بچوں کی صحت کی حفاظت اور درستی کا انتظام آئُووا کے دارالتجربہ میں کیا جاتا تھا۔ اُنکا دعوٰے ہے کہ اس طریق کو جاری رکھنے سے وہ آئندہ نسلوں کی صحت کو خاطر خواہ طور پر ترقی دے سکینگے اور دُنیا کو بہت سی خرابیوں اور تکلیفوں سے بچا سکینگے +

---

حال میں ایک خاتون مسز سارا شومیکر فارے صاحبہ نے پنسلوینیا کے زراعتی کالج سے علم نباتات میں بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ خاتون موصوفہ کے کئی بچّے ہیں جن میں سے دو لڑکے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرچکے ہیں۔ ان بچّوں کے علاوہ اُنکے بارہ پوتے اور نواسے بھی ہیں۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمت کے سامنے کوئی شئے سدِ راہ نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح ایک اور خاتون مسز سوزان پوٹر فیلڈ صاحبہ نے بھی جنکے لڑکے گریجویٹ ہیں اسی کالج سے جدید زبانوں میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے +

محمد رفیع بیگم

# دُودھ بیچنے والی

دُودھ بیچنے والی لڑکی جو کسی دُور دراز دیہات سے ہمارے گنجان شہر میں قدرت کی اک سادہ نعمت پیش کرنے آتی ہے ہم میں سے بعض کیلئے خلاقِ دو جہاں کا ایک ایسا پیام لاتی ہے جو اس خاموش زبان والی کی آنکھیں ہی ادا کرسکتی ہیں!

دیہاتیوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ہمارے عالیشان محلوں کو دیکھکر مبہوت رہ جاتے ہیں اور ہمارے بازار کوچوں کی حُسن آرائیاں اُنکے لئے اخلاق سوز بھی ثابت ہوتی ہیں اور یہ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ اُن کی وہ بے تصنّع سادہ مزاجی جو قدرت کا تحفہ ہے باغوں اور کھیتوں کے رہنے والوں کے لئے اُس رنگین آگاہی کے غازی سے چھپ جاتی ہے جو شہری زندگی کا امتیاز ہے۔ لیکن ہماری دُودھ بیچنے والی لڑکی کا یہ حال نہیں اُس کی شیرینی و سادگی اُسکے چہرے کے بچپن میں شہر کی تاریک گلیوں میں بھی ایسے ہی کھیلتی ہے جیسے کہ کھلے میدانوں کی لہراتے بالوں سے کھیلنے والی ہوائیں + اور یہ اس لئے کہ وہ اَوروں کی طرح ہمارے عیش و عشرت سے محظوظ ہونے کو گلی گلی کوچہ کوچہ نہیں پھرتی۔ اشیاء کی تلاش میں شخصیت کو نہیں کھو دیتی۔ فانی آسائش کی جستجو میں غرض کی قربانگاہ پر دل کا اطمینان بھینٹ نہیں چڑھا دیتی، اُس کا نفس جس نے معصومیت کی گود میں پرورش پائی ہے تسلّی کا راگ الاپتا ہے اور نوعِ انسان کی خدمت میں تگ و دو کرنا اُس کا مقصود ہے۔ پھر کمالِ حیرت اس پر ہے کہ اُس کی نیکی کوشش یا دکھلاوے کی ممنونِ احسان نہیں اُس کے لئے نیکی ایسی ہی آسان ہے جیسے ہم کج روشوں کے لئے بُرائی۔ وہ نیک اس لئے نہیں کہ وہ نیک بنتی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ نیک ہے اس لئے کہ اُس کے واسطے راہ پر چلنا بھی نیکی ہی کے رستے پر چلنا ہے!

اے دُودھ بیچنے والی جو کسی دُور دراز دیہات سے ہمارے گنجان بے تاب شہر میں قُدرت کی اک شیرین و سادہ نعمت پیش کرنے آتی ہے! ہم میں سے اکثروں کے لئے تو حُسن کی دیوی ہو لیکن میرے بعض نو آموز خیالوں کے لئے تو خیر و برکت کی پیغام بر اور سادگی و راستی کا فرشتہ ہے!!

بشیر احمدؐ

# گلیلو

سولھویں اور سترھویں صدی یورپ کے لئے رحمت و برکت کی صدی تھی۔ ان صدیوں میں دنیا جہاں میں خون کی بارشیں ہوئیں، مگر یورپ میں ہر جگہ یاقوت برسے۔ اسی بارش میں سرزمین ایطالیہ پر گلیلو نام ایک یاقوت بھی برسا۔ جو سطور ہذا کا سرعنوان ہے۔

گلیلو فیثاغورثی نظام شمسی کا موسس ہے، اس نے فلکی دنیا کی رویکایک بدل دی، خیالات میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا، اور صدیوں کے مسلمات کو اس طرح غلط کر دیا کہ اب وہ تا ابد سچے نہیں ہو سکتے۔ "زمین آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے" پہلے یہ صرف زبانی دعوے تھا، مگر اس نے تجربات سے ثابت کر دیا، اب اس سے انکار آفتاب کی روشنی سے انکار ہے! اگرچہ کوپرنیکس اور ارسترافس اس بارے میں اس کے اُستاد تھے ان ہی کی رہنمائی میں وہ اس طرف آیا تھا، لیکن وہ اپنے دعوے پر کوئی عینی دلیل پیش نہ کر سکے تھے، ان کو مشاہدات پر دسترس نہ تھی، انکی باتیں قریب قریب بالکل ظنی و قیاسی ہوتی تھیں، لیکن یہ ان کی قیاسی باتیں یقین کی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اسکی نظر میں زمین و آسمان ایک ہو گئے تھے، اس نے جو بات زبان سے نکالی تجربہ و مشاہدہ کی ترازو میں تول کر نکالی، اسکے دعووں کے ساتھ عینی دلائل کا زور ہوتا تھا۔ وہ فیثاغورثی نظام کا زندہ ساز، اور موجودہ فلکیاتی دور کا آدم ہے۔

گلیلو ۱۵۶۴ء میں فلارنس میں پیدا ہوُا، اسکا باپ ایک معمولی درجہ کا آدمی تھا معمولی تعلیم و تربیت کے بعد اس نے اسکو طبی مدرسہ میں داخل کر دیا، لیکن اسکو طب سے کچھ لگاؤ نہ تھا۔ اسکو ریاضی سے خاص دلچسپی تھی، شب و روز اسی دُھن میں رہتا، اس کی مدرسہ کی زندگی بہت بدنام تھی، کئی کئی دن مدرسہ سے غیر حاضر رہتا تھا۔ ریاضی سے اسکی دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ استادوں کو سبق سُنانے کے بجائے، ریاضی کے مسائل سُنایا کرتا تھا، اور باتوں باتوں میں ایسے دقیق و غامض نکات کہہ جاتا کہ وہ سُن کر دنگ رہ جاتے باپ کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو اس نے اسکو مدرسہ سے اُٹھا لیا، اور ریاضی سیکھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا اب اسے کوئی فکر نہ تھی، جہاں چاہتا بے روک ٹوک جاتا، اور خوشی خوشی ریاضی سیکھتا تھا۔

آزادی سو نعمتوں کی ایک نعمت ہے، اس نے گلیلو کا دامن بھی ترقیوں اور کامیابیوں کے لعل و گوہر سے بھر دیا۔ چند ہی روز میں اسکا جوہر کمال چمک اُٹھا، لوگ اسکو ریاضیات کا امام کہتے تھے۔

وہ غور و فکر کا بہت عادی تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑی بڑی باتیں سوچتا، اور معلوم باتوں سے وہ نتائج نکالتا جو دوسروں کی عقل و فہم سے بہت بلند ہوتے۔

ایک روز وہ نماز کے لئے گرجا گیا، وہاں اس نے چھت میں لٹکا ہُوا ایک لیمپ دیکھا جو پیہم متحرک تھا۔ اس نے غور کیا تو معلوم ہُوا کہ اگرچہ حرکت یکساں نہیں رہتی، گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، لیکن اس سے وقت میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس نے سوچا کہ اگر اسی طرح کسی تار میں کوئی چیز باندھ دی جائے تو وہ بھی متحرک رہیگی، اور اسکی حرکت کی رفتار تار کی لمبائی کے متناسب ہوگی۔ گھنٹوں میں لنگر اسی اکتشاف کا نتیجہ ہے۔

اسی زمانہ میں اس نے اور بہت سی باتیں دریافت کیں، قدیم ایجادوں میں اچھی اچھی ترمیمیں کیں، اس کا باپ اس کی یہ باتیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔

اگست ۱۵۷۹ء میں جب وہ فارغ التحصیل ہُوا۔ تو اسکی عمر پچیس برس کی تھی، اور اسکی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ریاضی اور سائنس میں یکساں اس کی فرماں روائی تھی۔ ڈیوک آف ٹکنی اس کی بہت قدر کرتا تھا، اس نے اسکو پیسا یونیورسٹی میں ریاضیات کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ یہاں اس نے ایک معمل قائم کیا، اور فراغ خاطر سے تجربات و مشاہدات میں مشغول ہوگیا۔

یہ بات سب سے پہلے اسی نے دریافت کی کہ زمین سے جس قدر قریب ہوتے جائیں اسکی کشش بڑھتی جائیگی۔ اور ہوا نہ ہو تو بلندی سے گرنے والی ہلکی اور بھاری چیزیں ایک ہی ساتھ گرینگی۔ اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ اگر ہم کسی اونچی جگہ سے کوئی چیز پھینکیں تو وہ پہلے سکنڈ میں ۱۶ دوسرے میں ۴۸، اور تیسرے میں ۸۰ فٹ کی رفتار سے گریگی۔ یہ بھی اسی کی دریافت ہے کہ جو طاقت چار پونڈ وزن دو فٹ اونچا اُٹھا سکتی ہے، وہی دو پونڈ وزن کو چار فٹ بھی اونچا اُٹھا سکتی ہے۔ یہ بھی اسی کا نظریہ ہے کہ آواز ہوا کی وجہ سے گھٹتی اور بڑھتی ہے، ہوا کی موجیں جتنی زیادہ ہونگی آواز اتنی ہی بلند ہوگی، اور جتنی کم ہوگی اتنی ہی پست ہوگی۔

مگر مقدس مذہبی پیشواؤں کو یہ باتیں پسند نہ آئیں، وہ اسکی شہرت سے جلنے لگے اور سمجھ گئے

کہ اگر یہ باتیں عوام کے دلوں میں بیٹھ گئیں تو پھر وہ ہمارے ڈھکوسلوں میں نہ آئینگے۔ اس زمانہ کا یورپ موجودہ زمانہ کا یورپ نہ تھا، پھر وہ بھی ایطالیہ کا علاقہ، جہاں پوپ کی خدائی میں کلیسائی شہنشاہی تھی جگہ جگہ پادریوں کی حکومتیں قائم تھیں، اور ان لوگوں نے علمی و تمدنی دُنیا کو تاراج کر رکھا تھا۔ یہ لوگ جسکو ذرا بھی اپنے سے منحرف دیکھتے اُسکی زندگی دوبھر کر دیتے تھے۔ گلیلو کی تعلیم اُسکی معاشرت انکے مخالف تھی، وہ ان کی بیجا بیہودگیوں کو نہیں مانتا تھا، اس کی جان بھی مشکل میں آگئی، وہ طرح طرح کی مُصیبتوں اور تکلیفوں کا نشانہ بن گیا، اور مجبوراً پسہ کی سکونت ترک کرکے ۱۵۹۴ء میں پیڈوا چلا گیا

لیکن کمال جہاں جاتا ہے اپنے قدردان پیدا کرلیتا ہے۔ گلیلو تنگ ہوکر پسہ سے نکلا تھا، مگر اسکے قدردان یہاں بھی پیدا ہوگئے۔ چندروز میں پردیس دیس بن گیا، اور وہ بالکل بھول گیا کہ پسہ میں اسکے ساتھ کیا کیا گیا تھا۔ پیڈوا کے علمی حلقوں نے دل کھول کر اس کی قدر و منزلت کی اور یونیورسٹی کی طرف سے ریاضی کی پروفیسری پیش کی گئی جسے اس نے منظور کرلیا، اور خموشی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ یہاں اسکو فلکیات کے مطالعہ کا موقعہ ملا، اس زمانہ میں کوپرنیکس کی کتاب "حرکات اجرام فلکی" شائع ہوچکی تھی، اس کی رہنمائی میں اس نے بطلیموس فیثاغورث کے نظاموں کی صحت و غلطی کو جانچا، اور پوری غور و تحقیق کے بعد یہ رائے قائم کی کہ فیثاغورث کا نظام سچا ہے۔

واضح ہو کہ فیثاغورث کا نظام شمسی اور بطلیموس کا نظام ارضی ہے۔ وہ زمین کو متحرک مانتا ہے اور یہ ساکن۔ لیکن باوجودیکہ فیثاغورثی نظام بطلیموسی نظام سے بہتر اور حقیقت پر مبنی تھا، مگر پندرہ سو برس تک دنیا پر اس کی حکومت رہی، اور اگر ارسترافس اور کوپرنیکس پیدا نہ ہوئے ہوتے تو شاید فیثاغورثی نظام ناپید ہوگیا ہوتا۔ مسلمان علما میں بھی ایک جماعت فیثاغورثی نظام کو مانتی تھی، اس جماعت کا رہنما ارسلا ہے۔

ارسترافس نے ثابت کیا ہے کہ موسموں کا تغیر و تبدل، دن رات کا آنا جانا، سایہ کا ڈھلنا، یہ سب زمین کی حرکت کے نتائج ہیں۔ محوری گردش سے دن رات، اور سالانہ گردش سے موسم بدلتے ہیں کوپرنیکس نے دونوں نظاموں کا مطالعہ کرکے ان پر محاکمہ کیا ہے، اور دلیل و تحقیق سے بطلیموسی نظام کو غلط ثابت کیا ہے۔

مگر ارسترافس کو دیوانہ، اور کوپرنیکس کو ملحد و زندیق کہا گیا، اُنکی کتابیں جمع کرکے جلادی گئیں،

اور ان کی تعلیم مذہباً ممنوع قرار دی گئی۔ عجب بات ہے کہ بطلیموس تو فیثاغورث کے خلاف کہنے پر ملحد نہ ہو، مگر ارسترافس اور کوپرنیکس ملحد سمجھے جائیں! لیکن سچائی وہ بجلی ہے جو جھوٹ کی تاریکیوں میں بھی چمک جاتی ہے۔ جہالت اور کلیسائی مخالفتوں نے نظام شمسی کی سچائی کو بہت چھپایا۔ مگر وہ چمکی اور ساری دنیا اسی کے جمال جہاں آرا پر فریفتہ ہو گئی۔

اس فریفتگی کا مشاطہ گر گلیلو ہے، وہ کامل غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا تھا کہ فیثاغورث کا نظام سچا ہے۔ اس نتیجہ کے ثبوت میں اس نے عقلی اور تجربی دونوں نہایت مستحکم دلیلیں پیش کیں، اور ہر منکر کو اپنی دوربینوں سے عینی مشاہدہ کرا دیا۔ ۱۶۰۶ء میں اس نے ایک دوربین بنائی جس سے ستارے نسبتاً صاف اور بڑے نظر آتے تھے۔ اسی اصول پر اس نے ایک اور بڑی دوربین بنائی جس میں آٹھ گنی چیزیں نظر آتی تھیں۔ اب اس کی نظر میں آسمانی مخلوق بہت زیادہ ہو گئی تھی، اور اسکو اور بہت سی دنیاؤں کے نشانات بھی ملے تھے۔ انکے لئے اس نے اتنی قوی دوربین تیار کی جس سے ہر چیز اصل سے تیس گنا زیادہ بڑھ جاتی اور دور کی چیزیں اپنی اصل شکل و ہیئت میں نظر آتی تھیں۔

سب سے پہلے اس نے چاند کی سیر کی، اور بتلایا کہ زمین کی طرح وہ بھی ایک کرہ ہے جس میں بڑے بڑے پہاڑ اور وادیاں، میدان اور جنگل، سمندر اور گھاٹیاں، اور بڑے بڑے تاریک غار ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ کرہ بھی آباد تھا لیکن اب ویران ہو گیا ہے۔

چاند جب نیا نیا نکلتا ہے اور مطلع صاف ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہلال ایک تاریک جسم کا روشن حصہ ہے۔ لیکن یہ تاریک حصہ کیسے نظر آتا ہے؟ ہمیں یہ بات سب سے پہلے گلیلو نے بتائی ہے، وہ کہتا ہے چاند کی روشنی آفتاب کی شعاعوں کا نتیجہ ہے، اس کا جتنا حصہ آفتاب کے سامنے ہوتا ہے اتنا روشن ہوتا ہے اور جتنا سامنے نہیں ہوتا تاریک ہوتا ہے؛ اور یہ تاریکی ہمکو اس وجہ سے نظر آتی ہے کہ آفتاب کی باقی شعاعیں زمین سے چاند پر منتقل ہو جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ یہ شعاعیں بالواسطہ منتقل ہوتی ہیں، اس لئے مضمحل ہو جاتی ہیں اور چاند کا باقی حصہ پوری طرح روشن نہیں ہو سکتا۔ ہیئت کی اصطلاح میں یہ روشنی "منعکس نور" کہلاتی ہے۔

کہکشاں کے متعلق عام خیال تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے تاروں کا جھرمٹ ہے مگر گلیلو نے کہا کہ یہ تارے چھوٹے نہیں بلکہ بڑے بڑے ہیں، جو دور ہونے کی وجہ سے چھوٹے نظر آتے ہیں،

اور ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ آسمان میں اس قسم کے ستاروں کے اور بھی جھرمٹ ہیں، جو ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں، اور بلا دوربین کی مدد کے نظر نہیں آسکتے۔ ایسے ستارے "نمرذوج" کہلاتے ہیں۔

جنوری سنہ ۱۶۱۰ء میں جب اس نے چوتھی دوربین تیار کی تو آسمان زمین بن گیا تھا۔ وہ اپنی رصد گاہ میں بیٹھا اس کا چپہ چپہ اس طرح دیکھ لیتا تھا جیسے کوئی اپنے گھر کے کونے کھدروں کو دیکھے۔ ثریا سات ستاروں کا مجموعہ کہا جاتا تھا لیکن اس نے اس تعداد پر ۳۳ کا اور اضافہ کیا، اور انکا حجم اور رفتار وغیرہ بھی بتلائی۔

اس کے بعد اس نے مشتری کا معائنہ کیا، اس کے گرد اسکو چند ستارے گردش کرتے نظر آئے، وہ ان کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوا، اور مسلسل کئی راتوں کے مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ چار ستارے درحقیقت چار چاند ہیں جو مشتری کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ان چاروں کی رفتار، روشنی اور حجم متعین کرنے کے بعد اس نے مشتری کی تحقیقات کی۔ اسکو معلوم ہوا کہ دوسرے سیاروں کی طرح مشتری بھی ایک سیارہ ہے، جو اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے اور یہ چاروں چاند اسکو روشنی پہنچاتے ہیں، اور اس کا اصول قریب قریب وہی ہے جو ہماری دنیا کا ہے اس کے بعد بھی وہ برابر کئی مہینہ اسی تحقیق میں مشغول رہا کہ شاید کچھ اور بات معلوم ہو، لیکن جب اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو اسے کوئی ڈگمگاؤ نہ رہا، اور وہ اس عقیدہ پر پوری طرح جم گیا۔

ہیئت کی دنیا میں یہ وہ عظیم الشان انکشاف تھا جس نے حق اور سچائی کا ڈنکہ بجادیا، جھوٹ کی پندرہ سو برس کی حکومت کا طلسم ٹوٹ گیا، اور گلیلو آمادہ ہوا کہ اٹھے، اور اس سچائی کا اعلان کردے جو دو ہزار چونتیس برس پہلے اعلان کی گئی تھی اور منکروں کو دن کی آنکھوں سے دکھادے کہ سچ وہی ہے جو ساموس کے شہید راہ حق وحقیقت نے کہا تھا۔ وہ جتنا غور کرتا تھا حقیقت اتنی ہی واضح ہوتی جاتی تھی، اس کے سامنے نئی نئی دلیلیں آتی تھیں، اور یقین دلاتی تھیں کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں آفتاب ہے۔ وہ منطقیوں کی طرح جرح وتنقید کرتا تھا کہ شاید یہ نظام کہیں سے ٹوٹتا ہو، لیکن فیثاغورث کی بات الہام کی طرح سچی تھی۔ اس نے پوری طرح مان لیا کہ بطلیموسی نظام سرتاسر غلط اور فیثاغورث کی بات سرتاپا صحیح ہے۔

اس حیثیت سے یہ انکشاف ایک یادگار انکشاف تھا، اور وہ دن بہت مبارک تھا جب گلیلو نے مشتری کے چار چاندوں کو دیکھا تھا۔

گلیلو کی عادت تھی کہ وہ کوئی بات اس وقت تک مُنہ سے نہیں نکالتا تھا جب تک پوری طرح تحقیق نہ کر لیتا۔ اس نے کوپرنیکس، ارسٹرافس اور فیثاغورث تینوں کے مقالات بار بار اور بغور پڑھے، ان سب کے دلایل کو جانچا، ارمنیئین کی کتابیں دیکھیں، طلوع و غروب روشنی و حرکت کے توانین کا مطالعہ کیا، اور اپنی دوربینوں کی مدد سے تمام آسمانوں کو چھان مارا تب کہیں ان ساری کوہ کندنیوں کے بعد نظام شمسی کی تبلیغ کی ۔

کوپرنیکس نے کہا تھا کہ عطارد اور زہرہ زمین کی طرح آفتاب کے گرد چکر لگاتے ہیں، لیکن جب اس پر اعتراض کیا گیا کہ ان میں چاند کی طرح گھٹاؤ بڑھاؤ کیوں نہیں ہوتا تو وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ مگر گلیلو نے اس اعتراض کو بھی رد کر دیا، اس نے زہرہ کی رصد کی، ایک دفعہ وہ ہلال کی صورت میں دکھائی دیا اور دوسری دفعہ بدر کی۔ اس سے اسکو اصلیت کی ٹوہ لگی چنانچہ ہفتوں پر ہفتے گذر گئے اور وہ اسی ٹوہ میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ سات مہینہ پندرہ دن کی مسلسل کاوش کے بعد اس نے پالیا کہ زہرہ بھی چاند کی طرح ہلال و بدر بنتا ہے، اس کا مرکز بھی آفتاب ہے، اور ۲۲۵ دن میں اس کا دورہ پورا ہوتا ہے ۔

اس سلسلہ میں اس نے اور بھی بے شمار ستارے دیکھے، خصوصاً زہرہ و عطارد نے تو اسکی آنکھوں کے سامنے مدارج تنویر طے کئے تھے، اس لئے اس نے کوپرنیکس کی یہ بات بھی سچ کر دی کہ سیارے بذات خود روشن نہیں ہیں بلکہ وہ سب چاند کی طرح آفتاب سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

غرض وہ اسی طرح فیثاغورث، ارسٹرافس اور کوپرنیکس کے مسایل تحقیق و تجربہ سے دریافت کرتا رہا۔ وہ جس سیارہ کی ٹوہ میں نکلتا تا بہ حد ممکنہ اس کا پورا پتہ لاتا تھا۔ گلیلو میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کی باتیں اس قدر صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی تھیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی سمجھ لیتے تھے۔ ہیئت کے مسایل اس وقت تک بہت مشکل اور پیچیدہ زبان میں بیان کئے جاتے تھے، لیکن وہ ان ہی باتوں کو اس طرح کہہ جاتا جیسے کوئی معمولی بات ہے، اور کسی کو سمجھنے میں دقت نہ ہوتی۔ کوپرنیکس کی "اجرام فلکی" پچھلوں کے مقالات کے مقابلہ میں بہت سہل اور صاف

دلیلوں پر مبنی تھی، لیکن لوگ اسکے مطالب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے تھے، مگر اس کی زبان سے وہی باتیں دل نشین ہوجاتی تھیں۔ چنانچہ جب اس نے پیڈور میں نظام شمسی پر خطبہ دیا تو سب اسکی دلیلیں مان گئے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ نظام شمسی کے اصول سمجھاتا تو لوگ پکار اُٹھتے کہ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔ عوام سے لیکر علما تک سب اسکی جادو اثری سے مسحور تھے، اور اسی وجہ سے نظام شمسی کی صداقت پر اسی زمانہ میں تصدیق ثبت ہو گئی تھی۔

اب وہ پروفیسری سے مستعفی ہوکر بالکل فلکیاتی مشاہدات میں مشغول رہنے لگا۔ سیر و سفر کا بھی بہت شایق تھا، پروفیسری کی پابندی سے آزاد ہوتے ہی پیڈور کی سکونت ترک کر کے روم چلا آیا۔ معاش کی طرف سے بالکل بے فکر ہوگیا تھا، کیونکہ اس نے ملازمت کے زمانہ میں کچھ سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ لیکن یہاں بھی اس کی بہت قدر و منزلت ہوئی، کئی سو روپے مہینہ وظیفہ ملنے لگا اور وہ نہایت عیش اور فارغ البالی سے اپنے کاموں میں مشغول رہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ شہر کے باہر ایک وسیع میدان میں اس نے ایک رصدگاہ بنائی، اور آفتاب کے داغوں کی نسبت تحقیق کیا کہ یہ کس وجہ سے ہیں، ان کی اصل کیا ہے، اور یہ ہمیشہ قایم کیوں نہیں رہتے۔ مگر اس تحقیق میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہوا، اور ان کے مادہ اور وجہ کا سراغ نہ پا سکا، لیکن اسکی یہ غلطی ایک ایسی بات کے متعلق تھی جو دو سو اسی برس گذرنے کے بعد بھی اب تک معمہ ہے۔ اور باوجود تحقیقات و تجربات کے جو کچھ وہ دریافت کر چکا تھا اس پر ایک حرف کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ایک حرف اس لئے کہا کہ جس طرح اس کی تحقیق غیر تشفی بخش تھی، اسی طرح بعد کی تحقیقات بھی غیر تشفی بخش ہیں۔ پس نتیجہ کے لحاظ سے دونوں ایک ہوئے چند قدموں کا آگا پیچھا کوئی چیز نہیں ہے۔

گلیلو کی اس روز افزوں ترقی اور کامیابی سے مقدس مذہبی پیشوا آتش بدامن ہو گئے۔ اور دیوانہ وار چلانے لگے کہ یہ شیطان مکر و فریب اور کفر و بیدینی ہے جو تحقیق و انکشاف کے نام سے پھیلائی جا رہی ہے، لوگوں کو اس کے شر سے بچانا ہمارا مذہبی فرض ہے۔ کلیسا کا یہ حکم سنتے ہی تمام پادری کھڑے ہو گئے، اور ہر کوچہ و بازار میں مذہب کی حمایت میں اور نظام شمسی کے خلاف تقریریں ہونے لگیں۔ کلیسا نے کفر کا فتویٰ دیا، اور عوام کو اس پر اُبھارا کہ وہ اس

کافر و مرتد کو سزا دیں، کیونکہ یہ وہ باتیں کہتا ہے جن سے مذہبی مسلمات باطل ہوتے ہیں، زمین کی قوت زائل ہوتی ہے، آفتاب بڑا بن جاتا اور زمین چھوٹی سی رہ جاتی ہے، یہ باتیں ہمارے عقاید کے خلاف ہیں، جو ان اکاذیب کو مانیگا وہ یسوع کی خدائی میں داخل نہیں کیا جائیگا۔ عوام انکا اشارہ پاتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، اور جس طرح بھڑ بن یا چھال کی مکھیاں کسی کے چمٹ پڑیں اسی طرح یہ مذہبی دیوانے بھی گلیلو کے چمٹ پڑے، اور دو دن میں جینا اجیرن کر دیا۔ مذہب کا نام بُرا ہوتا ہے، اس پر عام ہیجان کا اثر، دونوں نے مل کر پڑھے لکھوں کی جماعت کو بھی برگشتہ کر دیا، اور وہ بھی اس سے بُری طرح پیش آنے لگے۔ مجبور ہو کر اس نے کلیسا کے نام پر امان چاہی، اور پادری کیتلے کو خط لکھا کہ میں بالکل بیگناہ ہوں، اور مجھ پر ناحق یہ مظالم کئے جا رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ تحقیق و مشاہدہ کے بعد کہا ہے، اور جنہیں میری معلومات سے انکار ہو انہیں میں ہر وقت مشاہدہ کرا دینے کے لئے تیار ہوں۔ مذہب کے نام سے یہ حشر انگیزی بہت شرمناک ہے، مذہب اور اسکی آسمانی کتابیں مسائل علمی کی تصدیق و تکذیب کے لئے نہیں ہیں، ان کو ان سے کچھ تعلق نہیں، وہ اس واسطے نہیں ہیں کہ ہم ان میں سکون و حرکت ارضی و سماوی کی ثلاش کریں یہ باتیں مذہب سے علیحدہ ہیں، ان کو مذہب سے اور مذہب کو ان سے ٹکرانا نہیں چاہیئے۔ مذہب اک اخلاقی قانون ہے، جو انسان کامل بناتا اور باہم مل جل کر رہنے کی ہدایت کرتا ہے، وہ جبر و تشدد اور فتنہ و فساد کا مخالف ہے، اسکی تعلیم یہ ہے کہ ہم دنیا دین میں اچھائی حاصل کریں، وہ خدائی اور بندگی کے نکات حل کرتا ہے۔ اسے ان باتوں سے ملوث نہ کرو، وہ آسمانی چیز ہے اسے اسے ان مادی باتوں سے پاک رکھو"۔ مگر یہ حق بات انکے دلوں میں گھر کرتی جو مذہب کے عاشق ہوتے یہ تو مذہب کے نام سے نفس و شیطان کے عاشق تھے۔ چنانچہ اس خط سے وہ سوختہ دل اور جل اُٹھے۔ پادری صاحب نے یہ خط پہلے کلیسا میں سُنایا۔ پھر محکمۂ احتساب میں پیش کیا، دونوں جگہ خوب دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور گلیلو پابزنجیر عدالت میں لایا گیا۔ کلیسا نے اسکو اسکے جرائم کی فہرست سنائی، لیکن اسکو اپنی بیگناہی کا یقین تھا، اس نے کہا ہاں، تم سب کچھ سچ کہتے ہو، میں مانتا ہوں کہ یہ باتیں میں نے کہی تھیں، اور جبتک زندہ ہوں کہتا رہونگا، ان کی اشاعت میرا پہلا انسانی فرض ہے۔ لیکن تم انکو جرم کہتے ہو؟ یہ نوعیت تم نے کہاں دیکھی؟ یہ جرم نہیں ہے، جرم اور ہوتے

ہیں، کوئی قانون اور مذہب ایسی باتوں کو جرم نہیں کہتا، اور جو مذہب ایسا کہے وہ ایک بُرائی ہے۔ جس کو مٹانا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ تم مجھے اپنے ذاتی اغراض کی وجہ سے سزا دینی چاہتے ہو، دو، تمہاری حکومت ہے، مگر مجرم نہ کہو، میرا جرم یہی ہے کہ میں مجرم نہیں ہوں، تم بلاکسی وجہ کے مجھے سزا دے سکتے ہو۔" عدالت نے سختی سے، حکم دیا کہ وہ اپنی زبان روکے، ان باتوں کا اظہار جرم ہے، ورنہ بہت سخت سزا دی جائیگی۔ پھر اس سے کہا گیا کہ تمہارے لئے مخلصی کی صرف ایک صورت ہے، یا اپنی معلومات و مشاہدات کو جھٹلاؤ یا اپنے ملحدانہ خیالات کا اظہار نہ کرو۔ ان دونوں سے انکار کی صورت میں موت کی پھانسی سامنے ہے۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کریگا کیونکہ اسکے سوا کوئی اور صورت نہ تھی کہ وہ دنیا میں ایک مکتوب صداقت چھوڑ سکتا۔ اسکے دوستوں نے پوچھا کہ وہ اتنا سخت ہونے کے بعد اتنا نرم کیوں پڑ گیا؟ تو اس نے کہا مصلحت اسی کی مقتضی تھی، سختی میں کوئی فایدہ نہ تھا۔ میں دل سے یقین رکھتا ہوں کہ جو کچھ کہہ چکا ہوں وہ بالکل سچ ہے تو اب خاموش رہنے سے وہ سچائی جھوٹ نہیں ہوسکتی۔ کوئی مضایقہ نہیں اگر میں کچھ دن کے لئے زبان روک کر قلم کو جنبش دوں تاکہ میرے مشاہدات کے غیر فانی نقوش ہمیشہ کے لئے دنیا میں رہ جائیں، اور آنیوالی نسلیں جان لیں کہ میں نے کن وجوہ سے نظام شمسی کو مانا ہے۔" چنانچہ اس نے مسلسل سولہ برس کی خاموشی اور محنت کے بعد ۱۶۳۲ء میں اپنی کتاب نظام کائنات شائع کی، جس میں نظام شمسی کی تائید، ارسٹرافس اور کوپرنیکس کی تصدیق اور اپنی معلومات و مشاہدات اور اصول براہین کا بیان تھا۔

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ تمام مذہبی حلقوں میں پھر اک غل شور مچ گیا۔ گلیلو کا خیال تھا کہ شاید اتنے عرصہ میں زمانہ کچھ اور ترقی کر جائیگا، اور دماغوں میں اس معلوم سچائی کو ماننے کی صلاحیت پیدا ہو جائیگی لیکن جزر ہونیکو تھا اس لئے مد بہت بڑھ گیا تھا۔ کلیسائی حکومت کا یہ آخری دور تھا، اتنے دن میں اندھی مذہبیت اور بڑھ گئی، اور جوش و مخالفت کا طوفان پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے اُٹھا۔ اب کے محکمۂ احتساب نے بہت سخت جرم عائد کئے اور گلیلو پھر ہتکڑیاں پہنے مجرموں کی طرح لایا گیا۔ اسے اپنے مجرم ہونے سے اب بھی انکار تھا، لیکن اس سے زبردستی تسلیم کرایا گیا کہ وہ مجرم اور گنہگار رہے۔ پھر اسکو توبہ کرنے والوں کا پہناوا پہنا کر گھٹنوں کے بل کھڑا کیا گیا، اور انجیل ہاتھ میں دیکر قسم لی گئی

کہ وہ آئندہ ایجاد و زندقہ کی اشاعت کا مرتکب نہیں ہوگا۔ اس نے اس سے بھی انکار کیا، لیکن مقدس مذہبی پیشواؤں نے قسم کھانے پر مجبور کیا تاکہ وہ آئندہ بے تامل موت کی سزا دے سکیں۔

لیکن جب وہ اس عہد و پیمان سے فارغ ہوچکا تو وہیں زور سے اپنی لکڑی زمین پر مار کر بولا! نظام شمسی سچا ہے مرکز آفتاب ہے، اور زمین اسکے گرد پھر رہی ہے۔ مگر موت کا ایک وقت معین ہے، وہ کسی کے بلائے نہیں آتی اور انسان دشمنوں کے نرغہ میں پھنس کر بھی زندہ رہ جاتا ہے۔ پادری اسکے اس اظہار پر بہت برافروختہ ہوئے، مگر کسی کو قتل کرنیکی ہمت نہ ہوئی، صرف یہ کیا گیا کہ اسے فلارنس میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کی یہ زندگی نہایت پُرکلفت و پُرصعوبت تھی۔ کلیسائی مخالفت کی وجہ سے عزیز و اقارب بھی دشمن ہو گئے تھے، اور پاس پڑوس میں بھی کوئی یار و غمخوار نہ تھا۔ تاہم وہ اس حال میں بھی علمی خدمات میں مشغول رہا، یہانتک کہ اس کی آنکھوں نے بالکل جواب دیدیا۔

اس نے تقریباً دس برس نابینائی کی زندگی کی کٹھن منزلیں جھیل کر ۱۶۴۲ء میں وفات پائی۔ پادریوں نے اس کا جنازہ مسیحی قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت نہ دی۔ ہاں! انہوں نے اچھا کیا کیونکہ وہ معمولی انسان نہ تھا کہ عام قبروں میں اس کی قبر بھی بنادی جاتی، وہ فیثا غورثی دعوت کا موسس اور اس مذہب کا آخری پیغمبر تھا، اس کی قبر عام انسانوں سے الگ ہونی چاہیئے تھی، تاکہ آنے والی نسلیں اسکی زیارت کرسکیں۔

ناظر

# ادبیاتِ اُردو

## زبان کی دُرستی

کسی زبان کے ادب کو ترقی دینے کے لئے اخباروں اور رسالوں کی بے انتہا ضرورت ہے لیکن ایسے اخبار اور رسالے مطلوب نہیں۔ جو آجکل ہمارے ملک میں حشرات الارض کی طرح پھیلے ہُوئے ہیں۔ شور بہت مچاتے ہیں۔ لیکن کام کچُھ نہیں کرتے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں تمام اخباروں اور رسالوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہا ہوں۔ اس محشرستان صحافت میں چند موقت ایشوع پرچے ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جن کی ادبی خدمات لائق تحسین ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بالکل انگلیوں پر گننے کے قابل ہے۔ جب تک تمام اردو رسائل و جرائد کی زبان درست نہ ہوگی۔ ادبیات اُردو کی ترقی کا خواب بالکل خواب ہی رہیگا۔ جس قوم کے مدیران جرائد اور مُصنفین تک کی زبان درست نہیں۔ وہ نہ صرف قوم کہلانے کے قابل نہیں۔ بلکہ اسے صفحۂ دُنیا پر زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، ایسی قوم نہ ڈراما اور ناول لکھنے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ نہ مختصر فسانوں کی تحریریں کوئی درجہ حاصل کرسکتی ہے۔ نہ اچھا شعر لکھ سکتی ہے۔ جسکی زبان غلط ہے۔ اسکا ڈراما غلط۔ ناول غلط۔ ع

خود غلط۔ مضمون غلط۔ انشاء غلط۔ املا غلط

اُن لوگوں کو جو اخباروں کے ایڈیٹر اور کتابوں کے مُصنف بننا چاہتے ہیں۔ لازم ہے۔ کہ صحیح زبان سیکھنے کی کوشش کریں۔ اور جن حضرات کو اپنے ملک اور اسکی زبان سے حقیقی ہمدردی ہے۔ انکا فرض ہے کہ لوگوں کو صحیح زبان سکھائیں اسکی عملی صورت یہ ہے۔ کہ دہلی اور لکھنؤ کے بہترین زباندانوں کی خدمات حاصل کیجائیں بہترین زباندانوں سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ اچھے پڑھے لکھے اور ثقہ آدمی حاصل کئے جائیں۔ جو زمانے کی ضروریات اور اُردو کی وسعت فرائض سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ آجکل اُردو زبان بہت تیزی اور سرعت سے ترقی کر رہی ہے۔ اور خصوصاً اہلِ پنجاب

نے تو اس زبان کے خزائن کو مالا مال کر دیا ہے (آجکل ہمیں ایسی زبان کی ضرورت ہے جو علم و ادب کے تمام شعبوں میں اظہار خیالات کے لئے کافی و وافی ہو۔ بیگماتی روزمرہ اور چولھے چکی کے محاورات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ اُردو کا دائرۂ ادب وسیع کرنے کے لئے ہر قسم کے محاورات کو رواج دیا جائے۔ (اور اُن انگریزی دانوں کی رہنمائی کیجائے۔ جو انگریزی کے مضامین و کتب کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اُردو کی تہیدستی کا رونا رویا کرتے ہیں *

## دائرۂ ادب کی تجویز

ایسے بہترین زباندانوں کے اہتمام میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک "دائرۂ ادب" قائم کیا جائے جس کے ماتحت وہ لوگ ادب کی تمام اصناف پر اچھی کتابیں لکھیں۔ اور اس دائرہ کے ماتحت زبان کی تنقید کے لئے ایک عُمدہ اور ضخیم رسالہ یا ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے۔ جو مہینے بھر کے یا ہفتے بھر کے تمام اخباروں اور رسالوں کی موٹی موٹی غلطیاں بتائے۔ اخباروں کو نئے الفاظ کے تراجم مہیا کرے۔ اور انداز بیان کے اُلجھے ہوئے طریقے سُلجھائے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ کام بہت بڑا اہتمام۔ بہت سا روپیہ اور بہت سا ایثار چاہتا ہے۔ لیکن کوشش کیجائے۔ تو سب کچھ ممکن ہے *

اسکے علاوہ اخباروں کے ایڈیٹروں کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے عملے میں ایسے شخص کو نہ رکھیں۔ جو زبان صحیح نہ لکھ سکتا ہو۔ ادبی انجمنوں کے ناظموں کو لازم ہے۔ کہ وہ کسی ایسے نثار یا شاعر کو اپنے جلسوں اور مشاعروں میں نثر و نظم نہ سنانے دیں۔ جس کی زبان صحیح نہ ہو۔ غرض اس قسم کی تدابیر اختیار کیجائیں جن سے نثر و نظم لکھنے کے شوقینوں کو مجبوراً زبان سیکھنی پڑے۔ اور جب تک وہ کسی مستند اُستاد سے اصلاح نہ لیں اور صحیح اردو نہ لکھیں انکو اُردو کے کسی رسالے یا اخبار یا جلسے یا مشاعرے میں بار نہ مل سکے *

اس تمام سمع خراشی سے میرا مدعا یہ ہے۔ کہ ادب میں زبان ہر چیز پر مقدم ہے۔ ایک ایسی غزل جو تغزل کے تمام دوسرے محاسن سے مالا مال ہو۔ لیکن اس کی زبان غلط ہو۔ یقیناً اُس غزل سے پست سمجھی جائیگی۔ جس میں گو جذبات اور تخیل کا علو تو نہیں پایا جاتا لیکن زبان

صحیح ہے۔ یہی حال ڈرامے اور ناول اور مختصر فسانے اور دیگر اصناف نظم کا ہے

## ڈراما

صحیح زبان کی اہمیت بیان کرنیکے بعد میں ادب کے مختلف اصناف کے متعلق کچھ عرض کرونگا ادب میں سب سے زیادہ اہم۔ سب سے زیادہ بلند۔ سب سے زیادہ مشکل صنف ڈرامے کی ہے اُردو زبان کی تہی مائگی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی۔ کہ ادب کی صنفِ اعلیٰ میں یہ زبان بالکل مفلس و نادار ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ڈراما لکھنے والے بہت ہیں۔ حشر اور احسن اور محشر وغیرہ مشہور بھی ہیں۔ اور ان سب میں آغا حشر کا غلغلہ زیادہ بلند سُنا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ آج تک ادب اُردو میں ایک بھی ڈراما ایسا نہیں۔ جو ممالکِ مغربی کے ڈراموں کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے میں حشر کے کمالِ ادبی کا بہت بڑا معترف ہوں۔ وہ نثر و نظم پر نہایت قادر اور ڈرامے کی خوبیوں کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ انہوں نے عوام کے مذاق کو صحیح راستے پر لانے کی بے انتہا کوشش کی ہے اور اس لحاظ سے ڈراما کے متعلق اُردو میں اولیت کا سہرا انہی کے سر پر ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہونگا۔ کہ ڈراما اور ناول خاص یورپ کی چیزیں ہیں۔ جب تک ہمارے ڈراما اور ناول لکھنے والے انگریزی ادب کو پوری طرح حاصل نہ کرینگے۔ اور اسکے تمام ڈراموں اور ناولوں کو اور انکی تنقیدوں کو حصول منفعت کی نظر سے نہ پڑھیں گے۔ اُردو میں ناول اور ڈراما کبھی فروغ نہیں پا سکتے جس طرح اُردو کے موجودہ علمی دَور کا احیا چند ایسے بزرگوں کا ممنون احسان ہے۔ جو انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مثلاً سر سید احمد خان۔ خواجہ حالی۔ مولانا شبلی۔ مولانا نذیر احمد۔ اسی طرح اُردو کے ادبی احیا کا کام بھی پہلے پہلے انہی لوگوں کو کرنا پڑا۔ جو انگریزی سے بے بہرہ تھے۔ اور جن میں آغا محمد شاہ حشر کاشمیری بھی شامل ہیں۔

اب اس علمی دَور کے نشو و ارتقا میں انگریزی جاننے والے حضرات مصروف ہیں۔ انجمن ترقی اردو دار المصنفین اعظم گڑھ اور حضور نظام عالیمقام کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ایسے عالم و فاضل اور روشن خیال حضرات کام کر رہے ہیں۔ جو مشرق و مغرب کی قابلیتوں کے جامع اور عربی و انگریزی دونوں زبانوں کے ماہر ہیں۔ اسی طرح اُردو کے ادبی نشو و ارتقا کے لئے بھی لازم ہے۔ کہ اب اس کام کو تعلیمیافتہ

حضرات اختیار کریں۔

جو انگریزی تعلیمیافتہ نوجوان اس صنف میں اُردو کی خدمت کا شوق اپنے سینوں میں رکھتے ہیں۔ انہیں چاہیئے۔ کہ پہلے صحیح زبان سیکھیں۔ اور اس کے بعد شکسپیئر کو کسی اچھے اور وسیع النظر عالم پروفیسر سے پڑھیں۔ پھر اپنے طور پر اُن کتابوں کا مطالعہ کریں۔ جو شکسپیئر کے نقادوں نے لکھی ہیں۔ پھر انگلستان کے بہترین ڈراما لکھنے والوں کی تصانیف کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد اچھے اچھے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کریں۔ اگر یہ عمل کچھ مدت جاری رہا۔ تو ممکن ہے کہ اچھے ڈرامے تصنیف کرنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔

## مختصر فسانے

ڈرامے کے بعد مختصر فسانوں کا درجہ ہے۔ ایک طول طویل ناول کی نسبت مختصر فسانہ لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ یہ چیز بھی خالص مغربی ہے۔ مشرق میں یوں تو مختصر فسانے اور طویل فسانے داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا سبھی کچھ موجود ہے۔ لیکن اہلِ مغرب نے ان اصناف ادب پر بہت عرقریزی کی ہے۔ اور ان کو فی الحقیقت کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ہمیں یہ فن اُن سے سیکھنا چاہیئے۔ مقام مسرت ہے کہ مختصر فسانے لکھنے کا شوق روز بروز عام ہو رہا ہے۔ اور بعض بہت اچھے فسانہ نویس ہماری زبان میں پیدا ہو رہے ہیں۔ سید سجاد حیدر۔ نیاز فتحپوری منشی پریم چند کے اسمائے گرامی اس قبیل میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ایک دفعہ مجھے "مختصر فسانے" کی تحریر کے متعلق علامہ اقبال سے گفتگو کرنیکا اتفاق ہوا علامہ موصوف نے دوران گفتگو میں فرمایا۔ کہ میں فسانہ نویس کو علم الکیمیا کے تجربات کرنیوالے سے تشبیہ دیتا ہوں۔ جس طرح کیمسٹری کا ماہر مختلف چیزوں کو مختلف خیالات میں رکھ کر ایک خاص چیز پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح فسانہ نویس مختلف سیرت کے انسانوں کو مختلف حالات وکیفیات کے ماتحت رکھ کر ایسے نتائج پیدا کر دیتا ہے۔ جو ان افراد اور ان حالات کی یکجائی کی حالت میں ناگزیر ہوتے ہیں۔ علامہ ممدوح کی اس تشبیہ و تنظیر سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جس طرح کیمسٹری کے کسی تجربہ میں اگر خواص یا عملِ تجربہ میں ذرہ برابر غلطی رہ جائے۔ تو

سارا تجربہ ناقص اور عمل بے سود رہ جاتا ہے۔ اور بعض اوقات سارا سامان تجربہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فسانے کا حال ہے۔ اگر کسی رُکن فسانہ کی سیرت لکھنے میں فسانہ نویس سے ذرہ بھی غلطی رہ جائے۔ یا حالات و کیفیات میں سے کوئی حالت یا کیفیت فطرت انسانی اور اصلیت واقعات سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جائے۔ تو اس فسانے کو اہل نظر فسانہ نہیں کہینگے خواہ اس میں دوسری ہزار خوبیاں بھی موجود ہوں ؛

اس قسم کے ماہر فسانہ نگار بہت کم ہیں۔ اور فسانہ نگاری کے شوقین حضرات کو چاہیئے کہ مغربی فسانے زیر مطالعہ رکھیں۔ اور انکی تنقید و انتقاد کے مضامین بھی ہمیشہ پڑھتے رہیں تاکہ انکی طبیعت کو ایسے فسانوں سے مناسبت پیدا ہو جائے۔ اور جب وہ اپنے ملک اور اپنے تمدن کے حالات کے ماتحت کوئی فسانہ لکھنے بیٹھیں۔ تو جذبات نگاری یا واقعہ نویسی میں کہیں اُنکا قلم لغزش نہ کرے ؛

## طویل فسانے

مختصر فسانے کے بعد طویل فسانے یعنی ناول کا نمبر آتا ہے۔ اس کا حال بھی مختصر فسانے ہی کا سا ہے۔ لیکن اس میں فسانہ نگار کو طولِ مضمون کی وجہ سے ہر قسم کی گنجائش ہوتی ہے۔ اُردو میں یوں تو ناولوں کی کمی نہیں۔ لاہور کے بعض کتب فروش ایک روپیہ میں ہزار صفحے کے حساب سے ناول بیچ رہے ہیں۔ لیکن حضرات۔ وہ ناول اردو کی زندگی نہیں۔ بلکہ موت اور ہلاکت کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ عوام کو چاہیئے۔ کہ اُن سے سخت پرہیز کریں۔ اچھے ناول لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ جن کی تصانیف میں بہت امید افزا ہونہاری پائی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر تاریخی فسانے لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ گو فسانہ نگاری کے فن کے اعتبار سے انکے فسانوں میں بعض فرو گذاشتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بہر حال اُن کا دم غنیمت ہے۔ رتن ناتھ سرشار، مرزا محمد ہادی رسوا۔ منشی سجاد حسین اودھ پنچ والے سب کی یہی حالت ہے۔ اور ان سب میں میری رائے یہ ہے۔ کہ منشی سجاد حسین کے ناول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دنیا۔ حاجی بغلول اور احمق الذین فسانہ نگاری کے فن کے لحاظ سے بہت کامیاب فسانے ہیں۔ منشی صاحب نے جذبات بھی نہایت صحیح

لکھے ہیں۔ اعلیٰ و ادنےٰ طبقے کی زبان لکھنے میں پورا پورا کمال دکھا گئے ہیں۔ معاشرت کی صحیح تصور پیش کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب ہُوئے ہیں۔ غرض آپکی تصانیف ہر طرح اُردو کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

دہلی میں مولانا نذیر احمد صاحب مراۃ العروس نہایت عالی پایہ فسانہ نویس گزرے ہیں انکے ناول بھی اُردو کے لئے ایک بہترین سرمایہ ہیں۔ مولانا راشد الخیری نے پہلے پہلے جو کتابیں لکھیں وہ بہت عُمدہ تھیں اور آیندہ ترقی کا پتہ دیتی تھیں لیکن آپ کی بعض تازہ تصانیف تو اس قدر حوصلہ شکن ہیں۔ کہ مولانا کی شان کے لایق نہیں۔

بعض نئے مُصنّفین کی کتابیں بھی قابل ذکر ہیں جن میں ابن مسلم از سلطان حیدر جوش نیلی چھتری مسٹر ظفر عمر۔ بازار حسن (منشی پریم چند) اچھی کتابیں ہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا۔ کہ ناول بھی مغربی شئے ہے۔ اس لئے لکھنے والوں کو چاہیئے کہ انگریزی فرانسیسی اور ترکی فسانوں کا مطالعہ کریں۔ اور اُن سے سیکھ کر اپنی زبان میں لکھیں۔

## مستثنیات

ہماری زبان میں بعض نہایت عالی پایہ انشاء پرداز موجود ہیں۔ جو ڈراما۔ ناول۔ مختصر فسانہ وغیرہ کسی قبیل میں نہیں۔ مثلاً پنجاب میں مولانا ظفر علیخاں اور ہندوستان میں مولانا ابو الکلام ایسے بے پناہ انشاء پرداز ہیں۔ کہ انکی مثال دنیائے اردو شاید مدت تک پیدا نہ کر سکے۔ دہلی کے خواجہ حسن نظامی صاحب نے بھی اردو میں ایک خاص انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ اور سادگی۔ صفائی اور سلاست سے ادائے مطلب کرنے میں بے نظیر ہیں۔ زبان سیکھنے والوں کو خواجہ صاحب کی کتابیں خاص طور پر پڑھنی چاہئیں۔

## ادب کی نئی بیماری

آجکل ادبی رسالوں میں ایک نئی بیماری شروع ہُوئی ہے۔ جسے نثر شاعری یا تخیل کی نثر کہتے ہیں۔ میں نثر شاعری کی اصل پر معترض نہیں۔ لیکن اس کی پامالی کا نوحہ خواں ضرور ہوں۔

یہ بیماری حقیقت میں ٹیگور کی غلط تقلید سے شروع ہوئی ہے۔ جس رسالے کو دیکھئے۔ دو چار مضامین نثر شاعری کے ضرور نظر آجائینگے۔ لیکن سب کی روش ایک ہی چلی جاتی ہے۔ "تو دوپٹہ اوڑھ رہی تھی اور میں تجھے کوٹھے پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ تیرے رخسار تابشِ حسن سے تمتما رہے تھے۔ اور میں دیکھ دیکھ کر مرٹ رہا تھا۔ وقِس علیٰ ہٰذا" اسی قسم کی بیہودہ اور لاحاصل تحریروں سے رسالوں کے صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں۔ اور کوئی جدت پیدا نہیں کی جاتی۔ ٹیگور کے تراجم میں خیالاتِ عالی بعض لکھنے والوں کو نظر آجاتے ہیں۔ اور اس کی اندھا دھند تقلید کی جاتی ہے۔ حالانکہ اصل یہ ہے۔ کہ ٹیگور نے پہلے پہل وہ تمام چیزیں نظم میں لکھی تھیں۔ اسکا انگریزی ترجمہ نثر میں ہوا۔ لہذا اُردو والے بھی ان کا ترجمہ نثر ہی میں کرتے ہیں۔ اگر اس قسم کی نثر شاعری لکھنے والے حضرات ذراسی دقت گوارا فرما کر ایسے خیالات کو نظم کر دیا کریں۔ تو اردو نظم کے ذخیرے کا افلاس بہت جلد دُور ہو جائے +

## نظم

نثر کی بحث ختم ہوئی۔ اب نظم کی طرف آئیے۔ علامۂ اقبال نے اپنی حیات افروز شاعری سے شعر کی دنیا میں جو انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن ان کی غلط تقلید نے بہت سے نوجوان شاعروں کی کاوشیں برباد اور عمریں تباہ کی ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کی تقلید صرف اسی میں ہے۔ کہ چند فارسی کی ترکیبیں جمع کرکے ایک نظم تیار کر دی جائے۔ اس میں معنی نہ ہوں۔ اس میں شاعرانہ بلند خیالی یا فطرت کی صحیح مصوری نہ ہو۔ اسکی پروا نہیں۔ لیکن "شعر گفتن ضرور است"۔ ہر شاعر کو اپنا ایک خاص مذاقِ سخن قائم کرنا چاہیئے۔ اور "یک گیر و محکم گیر" کے سنہری اصول پر کاربند ہو کر آخر تک اسی کو نباہنا اور اسی میں ترقی پیدا کرنا چاہیئے + خدا کے فضل سے مُلک میں اچھے اچھے شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔ مولانا اکبر مرحوم۔ اور علامہ اقبال کا کلام شعرا کا خضرِ راہ ہونا چاہیئے۔ اور فن شعر کے طالبوں کو اُردو کے پُرانے شعرا کا کلام زیادہ تر زیرِ مطالعہ رکھنا چاہیئے۔ جذبات کے بیان۔ زبان کی درستی۔ حالات وکیفیات کی مُصوّری اور مناظرِ فطرت کی عکاسی میں لکھنؤ کے میر انیس مرحوم کے مرثیے اُردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اور میرا عقیدہ ہے۔ کہ

آج اگر دنیا کی بہترین شاعری میں اُردو شاعری کی طرف سے کوئی تحفہ پیش کرنا پڑے۔ تو ہم غالب و انیس اور اکبر و اقبال کو نہایت فخر و ناز سے پیش کر سکتے ہیں ؛

چونکہ غزل کی فرسودہ روش آجکل متروک ہوتی جاتی ہے۔ اور وسیع و بلند خیالات کی نظمیں لکھنے اور پڑھنے کا شوق روز افزوں ہو رہا ہے۔ اس لئے شعرا کو چاہیئے۔ کہ اپنے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے شعرائے ایران و ہند کے کلام کو پیش نظر رکھیں۔ قومی نظموں سے جمہور کے دلوں کو گرمائیں۔ مناظرِ فطرت پر کوشش و کاوش سے اچھی نظمیں لکھیں۔ فلسفیانہ خیالات کو نظم کریں غرض اردو شاعری کو ہر اعتبار سے تونگر کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں ؛

## عاشقانہ شاعری

بعض لوگ شاید اظہارِ اتقا کے طور پر یا اپنے علم و فضل اور جدت پسندی کے اعلان کی خاطر اکثر یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ عاشقانہ شاعری کو ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن میں اُن سے نہیں ہوں۔ عاشقانہ شاعری کو ترک کرنیکی کوشش میں خود شاعری متروک ہوئی جاتی ہے۔ کیونکہ عشق تمام جذبات پر حاوی ہونیکی طاقت رکھتا ہے۔ اور شاعری صرف تصویر جذبات کا نام ہے۔ دُنیا کی کوئی زبان عشقیہ شاعری کو ترک نہیں کر سکی۔ تو پھر اس خیال محال میں اردو والے کیوں اپنا سر کھپائیں۔ عشق قوموں کی زندگی ہے۔ کسی زبان میں عاشقانہ شاعری کا موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ قوم کی رگوں میں زندہ اور تازہ خون دوڑ رہا ہے۔ کیونکہ جس قوم میں صحت اور خون گرم نہیں وہ عشق کیا خاک کریگی۔ البتہ میں اس امر کا مخالف ہوں۔ کہ عاشقانہ شاعری میں بزدلی۔ نامردی۔ کمزوری اور ضعف کے خیالات نظم کئے جائیں۔ اگر عاشقانہ شاعری میں شجاعت۔ بلند حوصلگی اور جوشِ حیات ظاہر کرنے والے جذباتِ عشق نظم کئے جائیں تو ان پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ غزل کی پرانی فرسودہ روش فی الحقیقت ترک کر دینے کے قابل ہے۔ لیکن جو چیز ہڈیوں میں سرائیت کر گئی ہو۔ اور کئی نسلوں سے قوم کے افراد کا شغل محبوب ہو۔ اُس کو چھوڑنیکے لئے بھی مدت چاہیئے۔ آجکل پرانے رنگ میں جلیل۔ ریاض۔ مضطر وغیرہ بہت اچھا کہنے والے ہیں۔ اور جدید طرز میں حسرت موہانی کی مثال نہیں۔ لیکن غزل کا معیار اس سے بھی بلند ہونا چاہیئے مرزا غالب

اسکے لئے بہترین استاد ہیں۔ انکے کلام کو زیادہ تر پڑھنا اور ان سے کسب فیض کرنا چاہیئے ؎

## نظم معرّا

آخر میں مجھے نظم غیر مقفیٰ کے متعلق کچھ کہنا ہے جسے انگریزی والے "بلینک ورس" کے مناسب و موزوں نام سے یاد کیا کرتے ہیں اور اردو کا اسکا مناسب ترجمہ نظم معرا ہونا چاہیئے میں "بلینک ورس" کا قائل نہیں ہوں شعر اپنے ترنم اور اپنے قافیہ و ردیف کیوجہ سے اتنی دلفریبی اپنے اندر رکھتا ہے۔ کہ نثر سے بدرجہا زیادہ ممتاز سمجھا جاتا ہے اور اسکے مؤثر ہونیکا راز بھی مصرعوں کی اسی ہم آہنگی میں مضمر ہے۔ یورپ والے بھی "بلینک ورس" کے چنداں شوقین نہیں ہیں شیکسپیئر نے اپنے بعض ڈرامے نظم معرا میں لکھے ہیں لیکن بعد میں اس روش کو نامقبول سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اردو میں مولانا شرر نے میوۂ تلخ اور شاید شہید وفا نظم معرا میں لکھے لیکن چلے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نظم مقفیٰ میں کوشش کرنیکے بجائے نظم معرا میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں معرا نظمیں اردو شاعری کیلئے کچھ مایۂ ناز ثابت نہیں ہونگی۔ مجھے یہ امر ناپسند ہے کہ ہم اپنی شاعری کے قیود کو اسقدر ناقابل برداشت سمجھیں کہ انکا جوا اپنے کندھے سے اُتار پھینکیں یہ حرکت آجتک کسی قوم نے نہیں کی۔ انگریزی شاعری کو شروع سے لیکر آخر تک دیکھ جایئے۔ نظم معرا نہایت خال خال نظر آئیگی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ طبائع انسانی جو ردیف و قافیہ کی دلفریبی کی خوگر ہو چکی ہیں۔ اسکو قبول نہیں کرتیں۔ اگر کسی کو اسکا ایسا ہی شوق لاحق ہو۔ تو میں یہ مشورہ دونگا۔ کہ قافیہ کو اُڑا دینے سے جو آزادی شاعر کو ملجاتی ہے اس سے اگر پورا پورا فائدہ نظم معرا میں نہ اُٹھایا گیا۔ اور اسکے اس نقص کو محاسن سے بالکل پوشیدہ نہ کر دیا گیا۔ تو نظم یقیناً ناکام رہیگی۔ اسلئے چاہیئے کہ پورے زور سے نظم لکھی جائے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات موزوں سے موزوں الفاظ اور صحیح سے صحیح جذبات اس میں بھر دیئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قادر الکلامی ہر شاعر سے ممکن نہیں اگر یہ روش عام ہو گئی تو اکثر شعرا کی نظمیں ارباب مذاق کی محفلوں میں مضحکہ کا سرمایہ بن جائینگی۔ اور حاصل کچھ نہ ہوگا[1] ؎

سالک بٹالوی

---

[1] قافیہ و ردیف کے مروج قوانین سے نظم کا یہ حال ہو گیا ہے کہ گویا ایک جادوگر الفاظ سے کھیلتا ہو۔ بے قافیہ نظم کی آزادی کا اردو میں تجربہ نہیں ہُوا۔ حالانکہ دنیا میں بلند سے بلند نظمیں خواہ یونانی، خواہ لاطینی، خواہ انگریزی، خواہ سنسکرت زبان کی ہوں بغیر قافیہ کے لکھی گئی ہیں۔ ہمارے شعرا یا تو نئے طریقوں سے بھڑکتے ہیں، یا مروجہ راستے کے شیدا ہو گئے ہیں" مسٹر عبدالرحیم اے ایل ایم آئی سی ایس۔ سی بی ای

# تاش کا ایک کھیل

چند روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے کلب کی لائبریری میں آرام کرسی پر ایک موٹی سی بھاری بھرکم کتاب لیکر بیٹھ گیا۔ اُس میں ایک نہایت عمدہ مضمون تھا۔ اور مجھے اُس کا لطف آنے لگا ہی تھا کہ ــــــــــ

میں تاش کھیلنے کے کمرہ میں تھا اور ایک میز کے پاس اعظم، وحید، اور سلیم کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہم "برج" کا کھیل شروع کرنے کو تھے۔ میں جانتا تھا کہ مجھے صرف اس لئے شامل کرلیا گیا ہے کہ انہیں چوتھے آدمی کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں اصحاب میرے کھیل کو اپنے پایہ کا نہیں سمجھتے۔ گو اس معاملہ میں میری رائے اُنکے خلاف ہے لیکن وہ تینوں کم ازکم یہی خیال کرتے ہیں۔ مجھے خواہش تھی کہ میرا شریک سلیم بنے۔ وہ بھی اگرچہ میرے ساتھ بالکل باقاعدہ طور پر پیش نہیں آتا پھر بھی دوسرے دونوں کی نسبت زیادہ اخلاق سے برتاؤ کرتا ہے۔ وحید کی زبان کافی سے زیادہ درشت ہے لیکن ان سب میں بُرا شریک بلاشبہ اعظم ہے اور اس لئے اس کا شریک بننے سے میں ہمیشہ گھبراتا ہوں ؎

اس سے یہ خیال نہ ہو جانا چاہیئے کہ میں اُس سے ڈرتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میں کبھی کسی چیز سے خوف نہیں کھاتا۔ لیکن گھبرانے اور ڈرنے میں بہت فرق ہے۔ اور اعظم سے میں فقط گھبراتا ہوں۔ وہ عام طور پر ایک اچھا کھیلنے والا سمجھا جاتا ہے لیکن دنیا میں کوئی کھلاڑی بھی اتنا اچھا نہ ہوگا جتنا وہ اپنے آپکو خیال کرتا ہے۔ اس کا قد چھ فٹ ہے۔ اس کی گردن میری گردن سے شاید پانچ گنا لمبی ہے۔ اور اسکی آواز عام طور پر اونچی آواز والے انسانوں سے چارگنا زیادہ بلند ہے۔ وہ اپنے شریک کو ہمیشہ نصیحت کرتا اور بُرا بھلا کہتا رہتا ہے۔ اور میرے ساتھ تو خاص طور پر بُری طرح پیش آتا ہے۔ کئی دفعہ اسکے ساتھ برج کھیلنے کے بعد مجھے خیال آیا ہے کہ اُن تمام باتوں کو جو اُس نے اُس کھیل میں مجھ سے کہیں مجھے برداشت نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور چونکہ اُسکا شریک بننے سے مجھے اس قدر نفرت ہے قسمت کی خوبی دیکھئے کہ وہی میرا شریک بنا کرتا ہے

اتنا غنیمت ہے کہ جتنی نفرت میرے دل میں ہوتی ہے اسکا اظہار میں چہرے سے نہیں ہونے دیتا۔ اعظم کو یہ تمیز نہیں ہے۔

ہم سب نے تاش میں سے ایک ایک پتا نکال کے میز پر سیدھا کر دیا۔ اعظم نے نفرت سے سر ہلایا اور بول اُٹھا "مجھے زمان ملا؟ کیسی عجیب بات ہے کہ جب بھی کوئی گدھا کمرے میں موجود ہو وہ میرا شریک بن جاتا ہے۔"

سلیم ہنس کر کہنے لگا "یہی گلہ زمان کو ہے"۔ بعض اوقات سلیم ایسی بات کہہ دیا کرتا ہے۔ جو مجھے خواہش ہوا کرتی ہے کہ میں نے کہی ہوتی۔

اعظم نے مجھ سے کہا کہ "آج خدا کے لئے کل کی نسبت ذرا زیادہ عقل سے کام لینا" اور اسکے اپنی عینک کو اپنی ضرورت سے زیادہ لمبی ناک پر درست کر لینے کے بعد کھیل شروع ہو گیا۔

وحید نے تاش تقسیم کیا اور حسب عادت بہت جلدی اینٹ میں ایک سر بول دیا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اپنا ہاتھ کھول کر دیکھا۔ اس میں سوائے دو بے یار و مددگار غلاموں کے اور کچھ نہ تھا اس لئے میں نے "پاس" کر دیا۔ دوسرے دونوں نے بھی پاس کر دیا اور اب مجھے پہلا پتا پھینکنا تھا۔

میں نے پتا پھینکنے سے پہلے اپنے ہاتھ کو ایک دفعہ پھر غور سے دیکھا اور ہکا بکا رہ گیا کیونکہ وہ بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ اس میں حکم کے آٹھ پتے تھے اور تمام کے تمام "آنر" موجود تھے۔ اینٹ کا ایک پتا بھی نہ تھا۔ کھیل شروع رہا۔ میرا شریک میرے ہر ایک پتے کو دیکھ کر تلملاتا تھا اور مخالف پارٹی والے ایک دوسرے کا منہ حیرانی سے تکتے تھے۔ میرا ایک "سر" بھی نہ بنا کیونکہ اُن کے پاس "حکم" بالکل نہ تھا اور کھیل کے اختتام پر اُنکے پینتیس ۳۵ نمبر لائن کے نیچے اور اٹھائیس ۲۸ اوپر بنے۔

میں نے کہنا شروع کیا "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے . . . . . . . . "

لیکن اعظم نے میری بات کو مکمل نہ ہونے دیا۔ جو مجھے پہلے ہی سے امید تھی۔ اور کہنے لگا "یہ تو میں جانتا تھا کہ آپکو برج کھیلنا نہیں آتا۔ اور آپ گنتی سے بے بہرہ ہیں لیکن میں سمجھتا تھا کہ ابتک آپکو رنگوں میں فرق کرنا تو آ گیا ہوگا۔ اگر آئندہ آپ تاش کھیلنے کے کمرہ میں تشریف نہ لایا کریں تو عین عنایت ہوگی۔ ایک پانچ سال کا بچہ بھی آپ سے اچھا کھیل سکتا ہے گیا

آپکو علم ہے کہ اگر آپ "حکم" میں سر بولتے تو "گیم" کر لینے کے علاوہ ہم لائن کے اوپر تو ے نمبر بنا لیتے ؟ کیا آپکو کچھ آتا بھی ہے ؟ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپکا نام کیا ہے ؟"

میں نے کہا "اس قدر سخت کلامی کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے غلطی ضرور ہوئی لیکن ایسی جو نہ اس سے پہلے کبھی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ شاید نظر کا قصور تھا یا کمرہ میں زیادہ روشنی نہ ہونے کی وجہ تھی۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ پہلی دفعہ جب میں نے اپنا ہاتھ دیکھا تو اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ میں خود بہت حیران ہوں کہ وہ حکم پتے کہاں سے آگئے"۔

اس پر اعظم کہنے لگا "میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے زیادہ غلطیاں کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ بیہودہ عذرات بھی پیش کیا کرتے ہیں"

سلیم نے بات کو ٹالنے کی غرض سے کہا "چلو جی تقسیم کرو۔ ایکی دفعہ سہی"۔ اس دفعہ تاش کو مجھے تقسیم کرنا تھا اور میں نے کیا۔ لیکن اپنا ہاتھ اُٹھانے پر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پتے بعینہ وہی تھے جو اس سے پہلی بار میرے ہاتھ میں تھے۔ اتفاق کی بات ہے کبھی کبھی ایسا ہو بھی جایا کرتا ہے میں نے ارادہ کر لیا کہ اس دفعہ غلطی نہیں کرونگا اور بلا تامل حکم میں دو سر بول دیئے۔ دوسروں نے پاس کر دیا۔ میرے بائیں ہاتھ پر سے سلیم نے اینٹ کا بادشاہ چل کر کھیل کو شروع کیا اوروں نے چھوٹے چھوٹے پتے دیئے اور میں نے ایک چھوٹا سا ٹرپ لگا کر سر لے لیا۔

اعظم جھلا کر کہنے لگا "آپکے پاس اینٹ تو نہیں ہے ؟ یاد رہے کہ اینٹ کی شکل چوکور اور رنگ سرخ ہوتا ہے۔ برائے مہربانی ایک دفعہ پھر اپنا ہاتھ دیکھ لیجئے"۔

میں نے بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھ کو دیکھا اور قدرے خشکی سے جواب دیا "نہیں اینٹ نہیں ہے"۔

اب میں نے چڑیا کا اکا کھیلا۔ کھیلنے سے پہلے دو بار اسے غور سے دیکھ لیا اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ چڑیا کا اکا ہی تھا لیکن میرے دیکھتے دیکھتے جب وہ میز پر گرا تو اینٹ کا تھا۔ بیحد بے قراری سے میں نے اپنا ہاتھ مکرر دیکھا تو حکم کے سب پتے غائب تھے اور اینٹ کے پانچ چھوٹے چھوٹے پتے اور موجود تھے۔ میرا کیا قصور تھا ؟ آدمی کھیل ہی کیسے سکتا ہے جب پتے خود بخود رنگ بدلنا شروع کر دیں ؟ میں نے اپنے تمام پتے

میز پر سید ھے ڈالدیئے۔

اعظم چُپ تھا۔ اس کی گردن اور چہرے کی رگیں نیلی ہوکر پھُول گئی تھیں اور آنکھیں باہر کو نکلی پڑتی تھیں۔ سلیم اور وحید میز پر سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سلیم نے کہا "ایسے کھیل سے نہ کھیلنا بہتر ہے۔ اعظم مجھے معاف کرنا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ زمان آج پئے ہُوئے ہے تو میں اسے ہرگز برج کھیلنے کے لئے ساتھ نہ لاتا" یہ کہہ کر وہ اور وحید کمرے سے باہر چلے گئے اور عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے دروازے کو بند کرکے قفل لگادیا۔ میں حیران تھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔

میں نے اعظم کی طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ اب اسکے چہرے پر غصہ نہ تھا اسکی بجائے اُسکا چہرہ ایک ایسے شخص کی مانند تھا جسے جبراً کسی جنازے کے ساتھ جانیکے لئے شامل کرلیا گیا ہو۔ میں نے کہنا شروع کیا "اعظم مجھے نہایت افسوس ہے ایسی بات میری زندگی میں پہلی بار واقع ہُوئی ہے۔ اور کیا کہوں ناممکن سی معلوم ہوتی ہے۔ پتّے میری آنکھوں کے سامنے رنگ بدلتے نظر آتے تھے۔ لیکن سلیم نے جو یہ کہا ہے کہ میں پئے ہُوئے ہوں۔ اسکے متعلق میں کلب کی کمیٹی کو ضرور شکایت لکھونگا کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے شراب سے نفرت ہے۔ گو اس میں شبہ نہیں ہے کہ میری نظر میں فتور واقع ہُوا جو ممکن ہے آئندہ نقصان دہ ثابت ہو۔

"ضرور ہو گا"

"تو مجھے فوراً کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے"

اعظم نے ایک قسم کی خوفناک ملائمت کے ساتھ جواب دیا "لیکن یہ بات آپکے لئے ناممکن ہو گی کیونکہ دروازے میں قفل پڑا ہُوا ہے"

"یہ تو وحید نے مذاق کیا ہے۔ میں دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ کوئی ملازم کھولدیگا"

"لیکن آپ باہر جائینگے کیونکر؟" یہ کہہ کر اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالا اور اسکا منہ میری طرف کرکے کہنے لگا "خبردار۔ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا"

میں نے کہا "دیکھو اعظم! یہ مذاق اچھا نہیں ہے۔ اسکو ایک طرف کردو۔ آئے دن حادثات ہوجایا کرتے ہیں" مجھے ماننا پڑیگا کہ مجھ پر سخت گھبراہٹ طاری تھی۔

اعظم نے جواب دیا "نہیں کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ جو کچھ بھی ہوگا میں ارادتاً کرونگا اور

اب میرے خیال میں ہمیں کھیل شروع کرنا چاہیئے۔"

"لیکن وہ دونوں تو چلے گئے ہیں۔ اور ہم نے کھیل چھوڑ دیا تھا۔"

"نہیں یہ کھیل اور ہے۔ اس کا نام دُو بُدُو ہے۔"

"لیکن وہ تو مجھے کھیلنا نہیں آتا۔"

"نہیں آپ بہت جلدی سیکھ لینگے۔ اب برائے مہربانی تاش میں سے کسی ایک پتے کا نام لے دیجئے۔ جو بھی آپکی طبیعت چاہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ جتنا زیادہ عرصہ بھی ممکن ہو زندہ رہنا چاہتے ہیں اس لئے ذرا جلدی جواب دینگے۔"

وہ غالباً دیوانہ ہو گیا تھا اور اسکے ریوالور کا منہ ابھی تک میری طرف تھا۔ اس لئے میں نے اس خیال سے کہ جو کچھ وہ کہے وہ مجھے کرنا چاہیئے کہا "اینٹ کا نہلا۔"

"اینٹ کا نہلا؟ واہ! پتا بھی کیسا منحوس انتخاب کیا ہے۔ اچھا اب آپ تاش کو اُلٹا اُٹھالیں اور ایک ایک کرکے پتے میز پر سیدھے پھینکتے جائیں۔ جس وقت اینٹ کا "نہلا" میز پر آیا میں ریوالور کی لبلبی دبا دونگا اور آپکا خاتمہ ہو جائیگا۔ اس سے زیادہ آسان اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تو اس صورت میں میرا تاش کو بانٹنا ہی غالباً بہتر ہوگا۔"

اعظم نے جواب دیا "ہاں۔ بیشک آپکی مرضی ہو تو یوں ہی سہی۔ لیکن اگر آپ بانٹنا شروع نہ کرینگے تو میں ریوالور کو ابھی چلا دونگا۔ آپکا انتقال کر جانا ضروری ہے کیونکہ آپکے برج کے کھیل نے اب امن عامہ کے لئے خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔ اس لئے زندگی کے جتنے لمحے بھی آپکو مل سکیں انکو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔"

میں نے تاش کو اُٹھا لیا۔ بقول اُس کے جتنے لمحے بھی ملیں غنیمت تھے۔ اور اس عرصہ میں شاید کوئی بچاؤ کی راہ پیدا ہو جائے۔ شاید کوئی شخص کمرے میں آجائے۔ اس وقت تو ہمیشہ یہ کمرہ بھرا رہا کرتا تھا۔ اعظم نے ریوالور کا منہ نیچے کر لیا اور میں نے آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے پتوں کو میز پر سیدھا کرنا شروع کیا۔ ہر ایک پتے کے گرنے پر مجھے خیال ہوتا تھا کہ یہ وہی ہوگا

مجھے گھبراہٹ سے پسینہ آرہا تھا اور کمرے میں اس قدر خاموشی تھی کہ پتّوں کے گرنے کی آواز صاف سُنائی دیتی تھی۔ میں تاش آدھے سے زیادہ بانٹ چکا تھا اور اس میں جو منٹ صرف ہُوا وہ ایک سال بھر کے برابر تھا لیکن ابھی اینٹ کا "نہلا" نہیں نکلا تھا کہ اعظم کہنے لگا "اب ذرا جلدی پھینکئے۔ تھوڑا تیز ہو جائیے"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اسکا چہرہ اور زیادہ پھُول گیا تھا اور رنگ سُرخی کی شدت سے نیلا ہو گیا تھا۔ شاید اسی میں میری زندگی ہو اور اینٹ کا "نہلا" نکلنے سے پہلے وہ خون کی زیادتی سے بیہوش ہو جائے۔

میں قدرے تیز ہو گیا۔ لیکن ہر ایک پتے کو رُک رُک کے پھینکتا تھا۔ بانٹتے بانٹتے آخری پتا آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ہی آخری پتا اینٹ کا نہلا ہو گا۔ اعظم نے ریوالور کا مُنہ اٹھایا میں نے زمین پر گر جانے کا ارادہ کیا لیکن اُس نے لبلبی کو دبا دیا۔ بڑے زور کی آواز ہُوئی اور ہاں۔ میں بیدار ہو گیا۔ میں لائبریری میں کرسی پر سو گیا تھا۔ اور وہ بھاری بھرکم کتاب میرے ہاتھ سے گر کر زمین پر پڑی ہُوئی تھی۔ وہ آواز بھی شاید اسی کے گرنے کی ہو۔ میرے پاس کلب کا ایک ملازم کھڑا کہہ رہا تھا "اعظم میاں نے "سلام دیا ہے" اور کہا ہے کہ ہمیں چوتھے آدمی کی ضرورت ہے۔ آئیے برج کھیلیں"

میں نے جواب دیا "اُن سے کہہ دو کہ آج میری طبیعت خراب ہے"

عطاء الرحمٰن

# علم الجرائم

## ۴

چند سال کا ذکر ہے کہ بمبئی کے ایک معزز و متمول ڈاکٹر کے مطب میں ایک ہندو النسل آدمی جس کی وضع قطع اور بیش قیمت زریں لباس اُسے کسی ہندوستانی والئے ریاست کا معتمد کارگزار ظاہر کر رہی تھی نہایت اضطرار و اضطراب کی حالت میں داخل ہو کر ڈاکٹر صاحب سے عرض کرنے لگا کہ وہ ہز ہائینس مہاراجہ صاحب کے ایک ملازم کو دیکھنے کے لئے فوراً تشریف لے چلیں جو چند یوم سے کسی مہلک مرض میں گرفتار تھا۔ ڈاکٹر صاحب صبح ہی صبح ایک والئے ریاست کی جائے قیام پر چلنے کا پیغام سُن کر پھولے نہ سمائے کیونکہ عشرہ گذشتہ میں وہ شاید انہیں مہاراجہ صاحب کے ایک قریبی رشتہ دار کا جو بغرضِ سیر و سیاحت اُنکے ہمراہ بمبئی قیام گزین تھا علاج معالجہ کرنے اور اپنی طبی خدمات کے صلے میں پانچسو روپے کی رقم وصول کر چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جملہ آلاتِ جراحی وغیرہ کا بیگ لئے اپنے مکان سے باہر نکلے جہاں ایک نہایت شاندار گاڑی اُنکو مریض کے گھر تک لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی چنانچہ پندرہ منٹ کی تیز دوڑ اور بیسیوں سڑکوں اور گذرگاہوں کو طے کرنے کے بعد وہ فٹن ایک نہایت مہتمم بالشان بنگلہ کے سامنے آ ٹھیری جس کے شاندار برآمدوں میں سپیدہ سحر چمک رہا تھا اور جس کے وسیع صحن میں ساحلِ بحر سے آنے والی مغربی ہوائیں پیپل کے بلند تناور درختوں کے پتوں کی انتہائی کشمکش کے باوجود نہایت سہولت و آسانی سے نکل نکل کر مستِ خواب خوشبودار و معطر پھولوں کو اپنے خوشگوار جھونکوں کی گدگدیوں سے بیدار کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب معہ اُس جمعدار کے مسرت کا گہرا سانس لیکر گاڑی سے باہر نکلے اور بنگلہ میں داخل ہو گئے جہاں کے فرش فروش اور قیمتی سامانِ آرائش کو دیکھ کر اُنہیں مینا بازار کا دھوکا ہونے لگا۔ شاندار الماریوں کے شیشوں سے عروس نوخیز کی طرح جھانکنے والی ہزارہا کتب اور بیش قیمت چوکٹھوں میں جڑی ہوئی مشاہیر عالم اور مہ جبینانِ فرنگ کی رنگین و عکسی تصاویر سے ڈاکٹر صاحب کی

آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ نہایت نرم اور قیمتی غالیچوں میں پاؤں دھسے جاتے تھے جنکے اوپر سبز مخمل سے منڈھے ہوئے صوفے اور اُسی تناسب سے نازک وخوبصورت کرسیاں نہایت قرینے سے اِدھر اُدھر موزوں مقامات پر رکھی ہوئی تھیں۔ اور ہر چہار طرف زرق برق لباس میں ملبوس خدام اپنے اپنے کام کاج میں لگ رہے تھے۔ چند منٹ کے وقفہ کے بعد ڈاکٹر صاحب متعدد کمروں سے گذر کر مریض کے کمرہ میں پہنچے جو جانکنی کی حالت میں مکلّف بستر پر لیٹا ہوا نہایت تکلیف و اضطرار سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ فہیم و تجربہ کار طبیب نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ راجہ صاحب کا ملازم استسقا کی بیماری میں مبتلا ہے اور اُس حالت تک پہنچ چکا ہے جہاں نہ دعا سے نہ دوا سے کام نکلا کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ہمراہ لانے والا جمعدار نا اُمیدی کا پیغام سُن کر جھٹ پردہ اُٹھا نہایت انتشار و پریشانی کی حالت میں ساتھ کے ایک کمرہ میں گھس گیا۔ اور چند منٹ کے بعد آکر بولا "ہز ہائینس یاد فرماتے ہیں"۔

دوسرے لمحہ میں ڈاکٹر صاحب ایک نہایت مکلّف کمرہ میں پہنچائے گئے جہاں ایک مطلّیٰ وخوبصورت صوفے پر نہایت عمدہ لباس اور گرانمایہ جواہر زیب بدن کئے وجیہہ راجہ صاحب تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہز ہائینس کو فراشی سلام کیا جنھوں نے خندہ پیشانی سے جواب دے کر ڈاکٹر صاحب کو اپنے پاس بٹھا کر کہا "میرے سیکرٹری نے مجھے اطلاع دی ہے کہ میرا ایک ملازم سخت علیل ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اُس کی بیماری یقیناً اتنی مُہلک نہیں ہوگی۔ کیا اُسکے بچ جانے کی کوئی امید ہوسکتی ہے؟"

ڈاکٹر صاحب کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا کیونکہ چند منٹ پیشتر وہ مریض کو اُس حالت میں دیکھ چکے تھے جہاں تمام انسانی سعی و تجاویز بے سود اور جملہ اطبا کی تشخیص و تدبیر لازوال آئینِ فطرت کے سامنے نہایت حقیر، بے بضاعت اور تمسخر انگیز معلوم ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی حوصلہ شکن واقعات و حالات کے باوجود جبکہ مریض ایسے ورطۂ ممات میں پھنس رہا تھا جہاں سے اُسکی کشتی حیات کو صحیح وسالم نکال لے جانے کے تمام منصوبے خارج از فہم معلوم ہوتے تھے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مخصوص تفقدانہ انداز میں جواب دیا "اگرچہ آپکے ملازم کے جانبر ہونے کی کوئی توقع نہیں مگر پھر بھی میں حتی المقدور کوشش کرونگا اور یہی

ایک معالج کا فرض ہے ورنہ موت وحیات تو اُسی شافی مُطلق کے دستِ قدرت میں ہے"۔
اپنے وفادار خدمتگذار کی صحت کے متعلق حوصلہ افزا الفاظ سُن کر راجہ صاحب نے تسلی و تشفی کا ایک سانس لیا پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولے "مجھے آپکی مساعی جمیلہ پر پورا بھروسہ ہے مریض میرا دیرینہ اور نہایت ہی جاں نثار ملازم ہے جس کی بحالی صحت کے لئے میں کسی قسم کے اخراجات کی پروا نہیں کرونگا" یہ کہکر اُنہوں نے اپنی اُنگلی سے ایک بیش قیمت جڑاؤ انگشتری اُتار کر ڈاکٹر سے کہا "اپنی اس تکلیف فرمائی کے صلہ میں اسے قبول کیجئے"۔ ڈاکٹر صاحب نے ہز ہائینس کے اس شاہانہ عطیہ کا نہایت پرجوش اور پُرتملق الفاظ میں شکریہ ادا کیا پھر اجازت طلب کر کے اور مریض کے لئے حسب حال ایک نسخہ تجویز کرنے کے بعد بنگلہ سے باہر نکلے جہاں اُنہیں گھر تک پہنچانے کے لئے راجہ صاحب کی فٹن تیار کھڑی تھی۔

پانچ چھ روز تک ڈاکٹر صاحب متواتر صبح وشام مریض کو راجہ صاحب کے بنگلہ پر دیکھنے کے لئے جاتے رہے اور یہ دیکھ کر اُنہیں واقعی ایک گونہ مسرت ہوئی کہ مریض اُس خطرناک حالت سے نکل کر روبصحت ہو رہا تھا اور خصوصاً راجہ صاحب اپنے وفادار ملازم کی اس غیر متوقع شفایابی سے نہایت مسرور وشاداں نظر آتے تھے چنانچہ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی اس خدمتِ جلیل کے صلہ میں ایک معقول رقم عنایت فرمائی اور اُس سے دوچند جو خود ڈاکٹر صاحب اپنے زعم میں سمجھے بیٹھے تھے کہ اس فیاض رئیس سے اُنہیں موصول ہوسکیگی۔ چند دنوں کے بعد مریض کی خبر گیری کے لئے ڈاکٹر صاحب پھر ایک دفعہ راجہ صاحب کے بنگلہ پر حاضر ہُوئے، اُسوقت جناب راجہ صاحب کسی رئیس سے قمار بازی میں مشغول تھے اور ڈاکٹر صاحب کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہُوئی کہ لمحہ بہ لمحہ راجہ صاحب ہزاروں روپے کی رقوم ہار رہے تھے اور نوٹوں کے پلندے کے پلندے ایک خوبصورت صندوقچہ سے نکال نکال کر خوش نصیب حریف کے حوالے کئے جاتے تھے حتیٰ کہ اُنہوں نے قریباً ایک لاکھ سے زائد ایک ہی بازی میں ضائع کر دیا۔ اس نقصان عظیم نے اُنکا چہرہ سُرخ کر دیا چنانچہ خون کا سا گھونٹ پی کر راجہ صاحب نے قدرے بلند آواز میں کہا "بس ختم" یہ کہہ کر اُنہوں نے نہایت غصہ سے تاش کے ورق بے پروائی سے فرش پر بکھیر دیئے اور فتحمند قمار باز متبسم چہرہ سے سینکڑوں کرنسی نوٹ جیب میں ڈال کر اپنی

قسمت پر ناز کرتا ہوا کمرہ سے باہر نکل گیا اُدھر ہزیمت خوردہ راجہ صاحب غیض و غضب کی حالتیں طلائی وزر کار پردہ اُٹھا کر ملحقہ کمرہ میں گھس گئے ۔

مشاغل جہانداری کے دوش بدوش والیانِ ریاست اور متمول روسائے ہند کے سامانِ تفرّج اور قمار بازی کی بدعادت نے ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے اُمرائے وطن کی پُرلطف اندرونی زندگیوں کا ایک بیرنگ نقشہ کھینچ دیا اور اُسکو اس بات کا احساس ہُوا کہ ایسے شوریدہ سر اور اوباش مزاج راجکمار جو دن رات عیش و عشرت اور دنیا پرستی میں مبتلا رہتے ہیں اپنی غریب رعایا اور متوسلین کی کیا نگہداشت کرتے ہونگے ۔ اسکے ساتھ ہی اُس کے بلند پرواز تخیل نے اُنکی ظاہری طرز رہائش کا دلفریب منظر پیش نظر کر دیا مگر دوسرے لمحہ میں اُسکے مقابل دوسرے نظارہ نے اس خیال کی تکذیب کر دی کہ اگرچہ حسن صورت میں اُنکی ہر ادا کیسی ہی دلکش کیوں نہ ہو مگر پھر بھی ایسے عیاش طبیعت نواب زادے عیش پرستی کی ہوس میں اپنی بداعمالیوں کی بدولت جفا شعار دُنیا کے مضطرب اور سیماب صفت بگولوں میں پھنس کر دین و دنیا سے بھٹک جاتے ہیں اور اپنی ہی سیاہ کاریوں اور ابلیسانہ افعال کی وجہ سے اُنکے دل مگس کے چھتوں کی مانند کھوکھلے اور خستہ ہو جاتے ہیں جن سے مبداء فیاض کا ودیعت کیا ہُوا نورِ ایمان، صفتِ انصاف، تلطف، احساسِ جہانبانی اور وہ تمام چیزیں جو خلاقِ عالم نے اُنہیں مافوق الانسان اور تاجدار بنا کر عنایت کی تھیں شہد کی طرح ٹپک ٹپک کر فنا ہو جاتی ہیں اور ارمغانِ قدرت کا یہ مسلسل تقاطر اُنکے دل نورِ ایمان سے مبرا اور دیگر صفاتِ حسنہ سے ہمیشہ کے لئے معرّا کر دیتا ہے اور اُنہیں اُس حالت میں پھینک دیتا ہے جہاں ایک انسان کسی حیوان پر اپنا تفوق ثابت نہیں کر سکتا ۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصہ میں یہ تمام و کمال خیالات ڈاکٹر صاحب کے دماغ میں برق وش تیزی کے ساتھ زیر و زبر ہو کر نکل گئے اور اس اثناء میں راجہ صاحب کے پیش خدمتوں نے مکلّف غالیچوں پر بکھرے ہُوئے تاش کے ورق اکٹھے کر کے تمام میز کرسیاں ترتیب و قرینے سے رکھدیں پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنے دوست جمعدار سے مخاطب ہو کر پوچھا "یہ آدمی کون تھا جو اتنی گرانبہا رقوم جیت لے گیا ہے"؟

معزز جمعدار کے چہرے پر سُرخی جھلکنے لگی اُس نے نہایت متین آواز میں جواب دیا

"کوئی مالدار رئیس تھے"

ڈاکٹر صاحب کا دل بار دگر قمار بازوں کے ترہات و معصیات سے کانپ اُٹھا پھر وہ اپنے سر کو ہلا کر کہنے لگے "کوئی نہایت ہی خوش نصیب آدمی معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو ہزار ہزار روپے کے سینکڑوں نوٹ کس بیدردی سے پلیٹ کرلے گیا گویا اُسکے نزدیک سب ردی کاغذ کے پرُزے تھے۔ توبہ۔ ٹھیک ہے جمعدار صاحب یہ سب پیٹ بھر کر کھا لینے کے چونچلے ہیں!!"

زریں لباس میں ملبوس جمعدار نے اُچھل کر کہا "ڈاکٹر صاحب یہ تو کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ ہز ہائینس تو پرُانے اور عادی قمار باز ہیں اور ہر ہفتہ اس سے دو چند بلکہ سہ چند رقوم ہر بازی میں ہار جاتے ہیں" پھر ہر چہار طرف دیکھ کر کہ آیا دیگر خدام ریاست تو اُس کی گفتگو نہیں سُن رہے اُسنے سرگوشی کی آواز میں کہا "اگر آپ میرا کہنا مانیں تو کیوں نہیں آپ بھی راجہ صاحب کے ساتھ ایک بازی لگا کر اُن کی دولت کا ایک معتدبہ حصّہ حاصل کر لیتے"؟

اسی لمحہ میں ڈاکٹر صاحب کے مکروہ خیالات اُن سنگین چٹانوں سے ٹکرانے لگے جہاں چند منٹ پیشتر کھڑے ہو کر اُنہوں نے عمائد ہند کی اندرونی زندگیوں کے خفیہ طلسم کا مشاہدہ کیا تھا جو ایک دریائے ذخار کی طرح اُسی چٹان کے نیچے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ لیکن جہاں اُس وقت اسمیں مہیب و ہیبتناک نہنگ مُنہ کھولے دکھائی دیتے تھے اب اُسی جگہ ہلکے، نازک اور طلائی بجرے حریر و اطلس کے خوشنما بادبانوں کی مدد سے تیر رہے تھے جن میں نہایت حسین، نازک اندام اور پری تمثال عورتیں، نیم عریاں، رقص کناں، دین و دنیا سے مدہوش، اپنے جانفزا اور شیریں نغموں سے خاموش فضا میں ایک ایسی ترنم ریز صدا پیدا کر رہی تھیں جو صرف جنت الماویٰ کے دُودھ کی آبشاروں سے پیدا ہو سکتی تھی۔ جس طرح یہ شوخ حسینوں کا مجمع ڈاکٹر صاحب کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور آنکھیں بند کر کے قعر خود فراموشی میں کود جانے کا حوصلہ دے رہا تھا بعینہٖ اُسی طرح قمار بازی میں ایک معقول رقم راجہ صاحب سے اینٹھ لینے کا لالچ اُنہیں غمگسار جمعدار کی نصیحت پر عامل ہو جانے کے لئے اُکسا رہا تھا۔ خیالات کی ایک جنگ تھی جو دماغ کے میدان کارزار میں ضمیر اور روپے کے مابین چھڑ رہی تھی مگر نتیجہ جو ہونا تھا

وہی ہوا ضمیر کو شکست فاش نصیب ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کے منہ سے نکلا "لیکن میرے پاس اس قدر روپیہ کہاں"

چابکدست جمعدار فتحمندی کے ولولہ سے اچھل پڑا اور نہایت جوش بھری آواز میں کہنے لگا "نہیں جناب آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ چونکہ آدابِ شاہانہ کو مدِ نظر رکھ کر میں خود اپنے آقا سے نہیں کھیل سکتا مگر آپکو کھیلنے کے لئے جس قدر روپیہ آپ چاہیں دے سکتا ہوں۔ اور میرے روپے سے جتنا آپ جیتیں اُسکا دس فیصدی بطور نذرانہ آپکی خدمت میں پیش کرونگا اگر آپ اپنے روپے سے کھیلنا چاہیں تو مجھے عذر نہیں اور اس حالت میں بھی میں آپکی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ جس قدر رقم آپ گھر سے لائینگے اُس سے دُگنی میں آپکو دونگا۔ آپ کل دس ہزار روپیہ لائیے میں آپکو بیس ہزار دونگا۔ اگر آپ اس موقعہ کو ہاتھ سے کھو دینگے تو یقیناً یہی شخص جو متواتر کئی روز سے راجہ صاحب کے مال و دولت پر ہاتھ پھیر رہا ہے کل پھر اسی طریق پر بے حساب روپیہ لے جائیگا"

انسانی طبائع کے فوری تغیرات بھی بالکل تبدیلی موسم سے مماثلت رکھتے ہیں۔ جس طرح موسم گرما میں آسمان پر ابر آجانے اور ٹھنڈی ہواؤں کے اجتماع سے چاروں طرف بجائے حبس و گرمی کے خنکی کا تسلط ہو جاتا ہے بعینہ اُسی طور ڈاکٹر کی حالت تھی۔ صرف ایک ثانیہ پیشتر قمار بازی کے بد نتائج اس شخص کی روح کو لرزا رہے تھے کہ اب ذرا سا لالچ ملنے پر وہ ایک غیر مآل اندیش انسان کی طرح جملہ نتائج سے بے خبر ہو کر قعرِ مذلت میں بدحواس ہو کر کود جانے کو تیار بیٹھا تھا۔ ان لوگوں کے حالات زندگی درحقیقت اُن اشخاص کے طرز معاشرت سے مطابقت رکھتے ہیں جو بڑے عظیم الشان مجمعوں میں جمہور کو تو فسق و فجور سے بچنے کی تلقین کریں لیکن مفت کی شراب مل جانے پر فوراً ہی مے پرستی، بادہ گساری اور رنگ رلیوں میں منہمک ہو جائیں۔ چنانچہ مکمل غور و خوض کے بعد اُس نے جمعدار سے وعدہ کر لیا کہ وہ اگلے روز ایک معقول رقم لیکر آئیگا۔

دوسرے روز علی الصبح ڈاکٹر صاحب حسب وعدہ ایک ہزار روپیہ لئے قمار بازی کی نیت سے راجہ صاحب کے بنگلہ پر پہنچے جہاں وسیع چوگوشہ صحنِ چمن میں جمعدار صاحب

نے اُنکا استقبال کیا اور متبسم چہرہ سے دریافت کرنے لگا" کہئیے ڈاکٹر صاحب آج کتنی رقم لائے"؟
ڈاکٹر صاحب کا دل دھڑک اُٹھا اور چہرے پر خفت کی سُرخی جھلک مارنے لگی انہوں نے اپنی چھڑی سے زمین پر چند متوازی لکیریں کھینچ کر اپنے متکلم کی طرف حیا آب نگاہوں سے دیکھ کر جوابدیا" ایک ہزار روپیہ لایا ہوں"
"کچھ پروا نہیں" دوسرے لمحہ میں چالاک جمعدار کے مُنہ سے نکلا" دو ہزار روپیہ میں اپنے پاس سے آپکو دونگا" یہ کہکر اُس نے اپنی جیب سے سو سو روپے کے بیس نوٹ نکال کر ڈاکٹر صاحب کے حوالے کرکے کہا" خدا آپکو کامیاب کرے"
ڈاکٹر صاحب کا چہرہ جوش سے سُرخ ہوگیا اُنہوں نے باحتیاط تمام نوٹ گن کر جیب میں رکھ لئے اور جمعدار کے ہمراہ شاندار بنگلے کے خوبصورت جگمگاتے ہوئے کمروں سے گزر کر وسیع ہال میں پہنچے جہاں ایک نہایت مکلف آرام کرسی پر راجہ صاحب لیٹے کسی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی ہز ہائینس کے چہرہ پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا پھر سلام کا جواب دیتے ہوئے اُسے پاس کی کُرسی پر بیٹھ جانیکا اشارہ کیا بعدہٗ مریض کی نسبت چند باتیں دریافت کرکے نہایت بے تکلفانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ کُرسی کی پُشت پر ڈال کر کہا" جمعدار صاحب نے مجھے ابھی ابھی بتایا ہے کہ آپ میرے کل کے کھیل سے نہایت محظوظ ہوئے اور یہ کہ آپ بھی ...... ہیں ....... یا یوں کہئیے قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں"*
ڈاکٹر صاحب کے دماغ میں کامیابی و فتحمندی کی موجیں اُٹھنے لگیں مگر وہ اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سینے میں تھام کر بولے" اگر ہز ہائینس یہ افتخار بخشیں"*
"بہت خوب" یہ کہکر ہز ہائینس نے مستعد خدام کی طرف دیکھ کر کہا" تاش لاؤ" پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوکر بولے" آپ کتنا داؤ لگانا چاہتے ہیں"؟
ڈاکٹر صاحب نے خفت و ندامت کے مارے آنکھیں نیچی کرلیں اور اُس عرصہ میں اُنہیں معلوم ہوگیا کہ راجہ صاحب کے سامنے اُنکی ایسی ہی حقیقت تھی جیسی خورشید جہانتاب کے سامنے ذرہ بیمقدار کی۔ چونکہ ہز ہائینس کے محرم راز جمعدار نے اس بات کا انکشاف

کردیا تھا کہ راجہ صاحب قسمت کے ہیٹے اور سخت بدنصیب باپ کے بیٹے ہیں اس لئے وہ شاذو نادر ہی جیتا کرتے ہیں ورنہ قمار بازی میں قسمت ہمیشہ ہی اُنکے خلاف رہتی ہے۔اس تسلی وتشفی نے اُنکا حوصلہ بندھا دیا پھر وہ مودبانہ انداز میں کہنے لگے" میں بھاری رقوم نہیں لگا سکتا کیونکہ اسکا متحمل نہیں ہوسکتا"

ہز ہائینس کی آنکھوں میں خونخوار درندے جیسی چمک پیدا ہوئی پھر وہ تاش کو ہاتھ میں لیکر بولے" اور میں ہلکی رقوم پر نہیں کھیل سکتا کیونکہ میرے دل میں پھر کسی قسم کا جوش یا ترغیب پیدا نہیں ہوسکتی۔ بہرحال ہمیں سو سو روپے کی رقوم سے کھیل شروع کرنا چاہیئے"

کھیل شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تاش کے پتے بانٹے اور جیت گئے۔ راجہ صاحب حسب معمول ہار رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب جیت رہے تھے بالاخر روز گذشتہ کی طرح ہز ہائینس گھبرا گئے اور نہایت تلملاہٹ کے انداز میں کہنے لگے" بس اب میں نہیں کھیلنا چاہتا" یہ کہہ کر نہایت غضبناک حالت میں کمرہ سے باہر نکل گئے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کو دفور مسرت سے کمرہ کی ہر اک چیز معمول سے زیادہ خوبصورت اور دلفریب معلوم ہورہی تھی لیکن جس مہتم بالشان منزل کا وہ تہیہ کرچکا تھا وہ اُس کمرہ سے نرالی اور بیحد نظر فریب تھی اور جس کی انتہائی بلندی پر اُسے اپنی آرزوں کی مہ جبین ملکہ اُس سے ہم آغوش ہونے کے لئے منتظر نظر آرہی تھی، البتہ کامیابی کے اس سربفلک قصر پر چڑھنے کے لئے اُسے ایک سیڑھی کی ضرورت تھی جو صرف راجہ صاحب کی وساطت سے دستیاب ہوسکتی تھی اور جس کا بہترین ذریعہ یہی قمار بازی تھا۔ آخر کار راجہ صاحب کے چلے جانے کے بعد جمعدار اور ڈاکٹر نے ہز ہائینس سے جیتی ہوئی رقم گنی تو وہ چار ہزار آٹھ سو روپے کے قریب نکلی پھر جمعدار صاحب نے حسب وعدہ دس فیصدی ڈاکٹر صاحب کی نظر کیا جو اگلے دن دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہو گئے +

دوسرے روز ڈاکٹر صاحب پھر نصیب آزمائی کے لئے ہز ہائینس کے بنگلہ پر رونق افروز ہوئے اور قسمت کی خوش نصیبی سے پانسا اُنہیں کے ہاتھ رہا اور اُنکو یقین کامل ہوگیا کہ راجہ صاحب اگر ایسے ہی فاتر العقل اور درحقیقت قسمت کے ایسے ہی دھنی ہیں تو اُنہیں

اس قدر مال و دولت رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ دراصل روزمرہ کے واقعات ہمارے لئے عجائباتِ عالم سے کم تحیر خیز اور سبق آموز نہیں ہوتے۔ یہی شخص جو اگلے روز اپنی شخصیت کو راجہ صاحب کے ادنےٰ ملازمین سے کم خیال کرتا تھا اور اُس ذی ثروت و جلیل المنزلت والئے ریاست کے سامنے اپنی ہستی کو پرکاہ سے بھی کم خیال کرتا تھا آج اسی کا تھوڑا سا روپیہ ناجائز طریق سے حاصل کر لینے کے بعد اُسے ہر دُنیاوی وجاہت۔ آسائش و آرام سے متمتع ہونے اور مال و دولت رکھنے کا مستحق نہ سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر کے اِن لایعنی خیالات کا ہوائی قلعہ نہایت متزلزل بنیادوں پر استوار ہو رہا تھا اور اُس نے نہایت وثوق سے اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دے رکھی تھی کہ جمعدار کا روپیہ لگا کر بازی جیتنا نہایت دون ہمتی اور خسارہ کا سودا ہے پھر کیوں نہ اپنی تمام جائداد لگا کر راجہ کو ہمیشہ کے لئے اُس کی ریاست سے محروم کر دیا جائے جب قسمت بن مانگے مال و دولت۔ عزت و حرمت جاہ و جلال۔ سلطنت و حکومت اور دُنیا کی ہر وہ چیز جس کے حاصل کرنے کے لئے انسان ضعیف البنیان اپنی قوت و مقدرت سے بھی زیادہ جد و جہد کرتا ہے، اُسکے قدموں میں لاڈالنے کو تیار کھڑی ہے تو کیوں اس زریں موقع کو ہاتھ سے دیدیا جائے۔ چنانچہ انہیں پادر ہوا تخیلات کے زیر اثر ڈاکٹر صاحب تیسرے روز اپنی کل جمع جتھا اور وہ روپیہ جو اپنے دوستوں سے بطور قرض حاصل کر سکتے تھے سب اکٹھا کر کے لے آئے۔ اور راجہ صاحب سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ہز ہائینس نے اس دفعہ کھیلنے سے پیشتر اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ چھوٹی چھوٹی دس پانچ ہزار کی ذلیل رقوم کے لئے وہ اپنا قیمتی وقت ہرگز ضائع نہیں کرینگے اور یہ کہ وہ ایک لاکھ سے کم رقم پر کسی حالت میں بھی بازی لگانے کو تیار نہیں۔ ڈاکٹر کا بڑھا ہوا حوصلہ اُن جملہ توہمات پر، جو عموماً ہر قمار باز کو لاحق ہُوا کرتے ہیں، فوراً غلبہ حاصل کر گیا چنانچہ اُس نے سینے کو وسعت دیکر کہا۔ "بہت بہتر۔ آئیے، آج ایک لاکھ ہی سہی"+

تاش کے ورق تقسیم ہو گئے اور آنِ واحد میں قسمت نے پھر ڈاکٹر صاحب کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا اور دیکھنے والوں کو ایسا دکھائی دینے لگا کہ کسی نے ربڑ کی نالی راجہ صاحب

کے بدن سے لگا کر اُن کا تمام خون ڈاکٹر کے جسم میں داخل کر دیا ہے۔ وفورِ کامیابی سے اُسکے چہرہ کی سُرخی سیبِ کشمیر کو شرما رہی تھی۔ چنانچہ مقابل کی دیوار پر آویزاں ایک رنگین تصویر اُسکی توجہ اس طور جذب کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ وہ خود کو اشخاص تصویر سے ہی تصور کرنے لگے۔ اور اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی ایسی سرزمین میں پہنچ گیا ہے جس کے فسانے وہ بچپن میں سُنا کرتا تھا اور اُسے یقین نہ آتا تھا کہ ایسی حسین و معصوم دنیا بھی کہیں تمام آسمانوں اور زمینوں پر ہو سکتی ہے۔ اُس پُربہار چمنستان میں حور شمائل دوشیزہ لڑکیاں رنگا رنگ کے خوشبودار اور معطر پھولوں سے کھیل رہی تھیں اور نازک و خوبصورت لالہ کے پیالوں میں زمردین حوضوں سے شراب ارغوانی کے جام بھر بھر کر ایک دوسرے پر نہایت ہی مستی و لاابالی کی حالت میں پھینک رہی تھیں۔ ان نشۂ حسن میں مدہوش نازنینوں کے گرد بہت سی معصوم و حیا مآب زہرہ وش و جادو نظر لڑکیاں ہلکے ہلکے مختلف رنگوں کی نیم آستین ریشمی کرتیاں پہنے، کمر میں پھولوں کی پیٹیاں لگائے، ایکدوسرے کا ہاتھ تھامے، وسیع حلقہ بنا کر عجب شان دلربائی میں "پتری کا ناچ" ناچ رہی تھیں اور ہر چہار طرف سے اُن پر سفید پھولوں کی بارش ہو رہی تھی جن کی نازک پنکھڑیاں اُنکی پریشان سنہری لانبی چوٹیوں میں پھنس کر عجب روح نواز نظارہ پیدا کر رہی تھیں اور ایسا نظارہ جسکے دیکھنے کو جنبشِ مژگاں بھی بارِ عظیم تھی۔ اہل چمن اسی طور ناچ گانے اور رنگ رلیوں میں مصروف تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قسامِ ازل نے اُنہیں صرف عیش و عشرت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ وہ اسی نشہ آور اور نظر فریب نظارہ میں مصروف تھا کہ راجہ صاحب کی آواز اُسکے کان میں پہنچی جو مجروح شیر کی طرح گرج کر کہہ رہے تھے "یہ سب روپیہ جو غالباً چھ سات لاکھ ہوگا آپکے تمام روپیہ کے مقابل لگاتا ہوں" ڈاکٹر صاحب کو دُنیا کی کوئی زبردست سے زبردست قوت بھی اس کام سے منع نہیں کر سکتی تھی اور فی الحقیقت اس وقت تک اُنہیں کسی قسم کا خطرہ بھی نہ تھا چنانچہ اس خطیر رقم کے سامنے اُنہوں نے اپنی تمام پونجی معہ اُس روپے کے جو وہ گذشتہ چند دنوں میں راجہ صاحب سے جیت چُکے تھے نکال کر وسیع میز کے ایک کونہ میں رکھدی اور تاش کے ورق دونوں اشخاص نے اس دفعہ دھڑکتے ہوئے

دلوں کو سینہ میں سنبھال کر پکڑے، کھیل کا یہ انتہائی عروج تھا، جب ورق دیکھنے کیلئے اُلٹ دیئے گئے تو یک لخت ایک فتحمند آواز نے کہا "میں جیت گیا" یہ راجہ صاحب کی آواز تھی۔

اسی آواز نے ڈاکٹر کے سر پر بجلی گرادی۔ اُسکا خرمنِ امید اس آواز کی چنگاری سے بارود کی طرح بھک سے اُڑ گیا اور اپنی آرزوؤں کا قلعہ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتا نظر آیا۔ اب ہر چہار طرف اُسے خوفناک سیاہ آندھیوں کے بادل اُٹھتے دکھائی دے رہے تھے جن کی مہیب تاریکی میں کوہ آتش فشاں جیسے شعلے شش جہت زندہ بھوتوں کی طرح اُڑتے نظر آتے تھے، ایک ہنگامہ دار و گیر بپا تھا، گلشن جناں کے عوض اب ایک ایسے ویران باغ کا نقشہ اُسکے پیش نظر تھا جس میں اُس کی جملہ اُمیدوں اور تمناؤں کے نخلِ بے ثمر میں خزاں کے قبل از وقت جھونکوں نے وہ بربادی و تباہی بپا کی تھی کہ اب اُن درختوں کی بیخ و بُن بھی نظر نہ آتی تھی۔ اُسکا سر چکرا گیا اُدھر راجہ صاحب نے رعد کی طرح کڑک کر کہا "آؤ۔ اب ایک اور بازی لگانے کو تیار ہوں۔ صرف ایک لاکھ کی"

حواس باختہ ڈاکٹر کو وہ تمام روپے اور نوٹوں کے انبار اپنی تمام آرزوؤں کا کفنایا ہوا جنازہ معلوم ہو رہے تھے، اُسکے بدن میں رعشہ پڑگیا اور اپنی تمام دولت کے ایک منٹ میں اس طور تباہ و برباد ہو جانے کے باعث اُسکے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، آنکھوں میں تاریکی چھاگئی کیونکہ وہ تقریباً بیس ہزار اپنا اور چالیس ہزار جمعدار کا معہ سب اُس روپے کے جو اُس نے وقتاً فوقتاً راجہ صاحب سے جیتا تھا، ایک منٹ کے اندر اندر ہار چکا تھا اب جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھتا تھا اُدھر ہی مذلت و بربادی ناچتی نظر آرہی تھی اور چند منٹ پیشتر ایک لاکھ کی بازی جیت کر جن پیش خدمتوں کے سامنے اُس نے فراخ سینہ کا اُبھار دکھا کر حسرت کا سانس لیا اُن سے وہ اس طور شرمندہ ہو رہا تھا جیسے کوئی دوشیزہ کسی نامحرم انسان سے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا کشتِ اُمید پر بجلی گر چکی تھی اُدھر راجہ نے پھر بھاری لیکن تحکمانہ انداز میں پوچھا، "کیا تم نہیں کھیلنا چاہتے؟"

تیرہ بخت ڈاکٹر نے بڑی مشکل سے سر اُٹھا کر ہز ہائینس کی نورِ مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا پھر سر نیچا ڈال کر کہنے لگا "میرے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا"

"بیوقوف آدمی"، راجہ صاحب کے منہ سے نکلا۔ "کیا میں نے تمہیں پہلے نہیں کہا تھا کہ میں ہر بازی میں بھاری رقوم لگانے کا عادی ہوں"۔ یہ کہکر اُنھوں نے تمام روپے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اُسی صندوقچہ میں ڈالدیئے اور ایک فرمایشی قہقہہ لگاکر دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ بدنصیب ڈاکٹر نے اپنی جیب سے رومال نکال کر عرقِ انفعال سے اپنی فراخ پیشانی کو پونچھا اور ایک حسرت بھری نظر سے اُس نے جمعدار کی طرف دیکھا جو نیم تبسم کے ساتھ اس خانماں برباد کی دلی کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا پھر وہ چند قدم آگے بڑھ آیا اور نہایت ہمدردانہ الفاظ میں کہنے لگا "افسوس ہے کہ آپنے میرا روپیہ بھی ضایع کردیا۔ یہ سب روپیہ میں نے ایک مہاجن سے بطور قرض اس اُمید پر لیا تھا کہ ہم دونوں شاید اس طریق سے کچھ کما سکیں۔" مجھے اُمید ہے کہ آپ پھر بہت زیادہ روپیہ لاکر اس کھوئی ہُوئی رقم کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرینگے" پھر اِدھر اُدھر دیکھکر کہا "میں آپکی امداد کی خاطر اور قرض لے لونگا"۔

ڈاکٹر نے جمعدار کی باتوں پر زیادہ دھیان نہ دیا کیونکہ اُسکے خیالات اب ایک نرالی دُنیا میں سرگردان پھر رہے تھے چنانچہ وہ بھاری دل کے ساتھ وہاں سے اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا لیکن سخت پریشانی و تحیر کی حالت میں اپنی اس کج فہمی پر ماتم کرتا ہُوا، اُسی شب اُسے خیال پیدا ہُوا کہ راجہ صاحب کی عطاکردہ انگشتری کو بیچ کر دوستوں کا قرض تو ادا کرنا چاہیئے۔ مگر دوسرے لمحہ میں اُسکے دل میں ایک نیا شُبہ پیدا ہوگیا کیونکہ اُس کی اُنگلی پر اُس انگشتری نے ایک سبز داغ دے رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے وہ انگشتری فوراً ایک واقفکار جوہری کو دکھلائی جس نے بعد از امتحان کہا کہ وہ پیتل کی بنی ہُوئی تھی اور ہیرے کا نگ معمولی تراشا اور آب دیا ہُوا بلور تھا۔ چنانچہ اسوقت اور صرف اُسوقت حریص اور ناعاقبت اندیش ڈاکٹر کو معلوم ہُوا کہ وہ محض فریب سے لُوٹا گیا تھا۔ طیش کی حالت میں وہ فوراً راجہ صاحب کے بنگلہ پر پہنچا جو اب بالکل خالی پڑا ہُوا تھا۔ وہ زروجواہر سے لدے ہُوئے راجہ صاحب۔ وہ شاہانہ سامان آرائش۔ وہ استسقاء کا مریض۔ جمعدار اور زرق برق لباس والے پیش خدمت و خدام سب غائب تھے۔ یہ تمام جال صرف اس ڈاکٹر کے پھانسنے کے لئے بچھایا گیا تھا۔ بنگلہ چند یوم کے لئے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ اور استسقائی مریض اُن بدمعاشوں نے شہر سے تلاش کرکے اندر ڈال رکھا تھا، باقی تمام مہذب

لٹیرے اُس بدقماش راجہ کے ساتھی تھے جو اُس گروہ کا سردار تھا[1]۔

نہ صرف ایسے تربیت یافتہ لٹیرے بڑے بڑے شہروں میں متموّل و سمجھدار آدمیوں کو دامِ تزویر میں پھانسنے کیلئے پھرتے رہتے ہیں بلکہ اسی طریقے سے وہ سادہ لوح دیہاتیوں پر بھی ڈورے ڈالنے سے نہیں چوکتے۔ بقول سر ایڈمنڈ سی۔ کاکس ایک نہایت ہی چالاک ہوشیار آدمی گاؤں گاؤں پھر کر شریف منش دیہاتیوں کو یہ کہتا رہا کہ اُسے سرکار نے گاؤں کے ہر خوردسال بچے کو چیچک کا ٹیکہ لگانے پر مامور کیا ہے۔ ہر تعلیمیافتہ شخص اس بات سے بخوبی واقف ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے قصبات میں بسنے والے جاہل گنوار تو کجا بڑے بڑے شہروں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی اولاد کو ٹیکہ کے ضرر سے بچانیکے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں کیوں؟ جہالت اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے عدم واقفیت!! اسی لئے ایسے آدمیوں کو اُنہیں دھوکا دینے کی جراُت ہوجاتی ہے چنانچہ یہ مخصوص ٹیکا لگانیوالا ہر دیہاتی کو یہ کہتا تھا کہ اگر وہ کچھ نذرانہ پیش کریں تو وہ اپنے افسرانِ بالا سے کہدیگا کہ اُس نے اپنے تفویض شدہ فرائض جسکے لئے وہ تعینات کیا گیا تھا، بہ احسن وجوہ ادا کردیئے ہیں۔ اور اس بات کے بیان کرنیکی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اپنی گرفتاری سے پیشتر اُس نے اس طریق سے کتنا روپیہ کمایا ہوگا۔ بعینہٖ اسی طریق پر ضلع احمد نگر میں چند بدمعاش لوگوں کا ایک جتھا جنھوں نے ایک ادنےٰ قماش کے یوروپین کو بطور "سرپنچ" اپنے ساتھ گانٹھ رکھا تھا۔ کپڑے کی ایک بھاری مقدار ساتھ لیکر مختلف دیہات میں پھرتا رہا اور اپنی اس ٹھگباز جماعت کو اُنہوں نے "سٹار آف انڈیا گورنمنٹ کلاتھ ایجنسی" کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ ہر جگہ بیان کرتے تھے کہ سرکار دولتمدار نے اہلِ قصبہ کو حکم دیا ہے کہ وہ کپڑے کی ایک مقررہ مقدار خرید کریں۔ اس نرالے حکم سے وہ حیران تو ضرور ہوئے مگر ایک "سفید آدمی" کی موجودگی نے اُنکے تمام شکوک رفع کردیئے۔ چونکہ کپڑا نہایت ہی گراں قیمت پر فروخت کیا جاتا تھا اسلئے اُن ٹھگوں نے اس تجارت میں خوب ہی ہاتھ رنگے اور اُسوقت تک لوگوں کو لوٹنے میں مصروف رہے جبتک کہ سرِ موصوف نے اُنہیں اپنے پنجہ آہنی میں نہ دبا لیا۔ پیتل کو سونا بنا دینے کے متعلق ایک واقع سطور مندرجہ بالا میں کسی جگہ ضمناً بیان کیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں بہت سے ایسے شوریدہ سر مجرم بھی پائے جاتے ہیں جو ایک واحد کرنسی نوٹ کو کسی خاص کیمیاوی اصول کے ماتحت دو بنا دینے میں یدطولےٰ رکھتے ہیں۔ چند سال کا ذکر ہے کہ کلکتہ کی پولیس نے ایک شخص مسمی بشیشر پنڈت کو اس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا تھا چنانچہ سر ایڈمنڈ اُس چالاک پنڈت کی عیاریوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اُسکے متعلق ایک دلچسپ واقع بیان کرتے ہیں جو اس طرح ہے:۔

محمد ضیاء الدین شمسی

[1] چیٹنگ بائی گیمبلنگ صفحہ ۲۵۵ (دی انڈین کرمنل)۔ [2] پولیس اینڈ کرائم اِن انڈیا صفحہ ۳۱۹۔

# یونان کا ایک گمنام حکیم

اکلیوبول جزیرہ اڈو اس کے مشہور شہر لندہ میں پیدا ہُوا، بچپن ہی سے طبیعت حکمت کی طرف مائل تھی، جس نے تھوڑی ہی سی عمر میں اسکا شمار بڑے بڑے حکماء میں کرا دیا، یہ یونان کی عام رسم کے مطابق فلسفہ کی تعلیم کے لئے مصر گیا اور جب وہاں سے فارغ ہوکر واپس آیا تو ایک متمول خاندان کی مشہور عورت سے شادی کر لی، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام اقلوبین تھا، حکیم نے اسے خود مستعدی کے ساتھ تعلیم دی جو جوان ہوکر اپنے ہمعصر حکماء سے سبقت لی گئی اور اُس زمانے کے بڑے بڑے جادو نگار انشاء پردازان اور نکتہ رس لوگوں میں اسکا شمار ہونے لگا، اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اپنے باپ کی طرح یہ بھی اہم سے اہم مسائل فلسفہ کو نہایت سادہ و آسان الفاظ میں بطور ضرب المثل کے حل کر دیا کرتی تھی، لیکن باوجود ان کمالات کے انکسار و عجز کا یہ عالم تھا کہ جو شخص اسکے باپ سے ملنے آتا اُسکے پاؤں رسم کے مطابق[1] دھو دیا کرتی۔

یہ حکیم خاندان لہرقول سے منسوب تھا اسکے باپ کا نام اوجراس ہے جس وقت یہ پیدا ہُوا اُس وقت اکرسیوس شہر لایا پر حکمران تھا، لیکن جوان ہوکر یہ خود ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمران ہو گیا اور اپنے فرض کو اس عمدگی و دیانتداری سے انجام دیا کہ تمام رعایا کے دل اس کے اوصاف کے گرویدہ ہو گئے +

اس نے اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں اتحاد و اخوت کا وہ حیات افزا صور پھونکا کہ سب ایک دوسرے کے بھائی بہن ہو گئے اور اس طرح کہ یہ ریاست ایک ہی خاندان معلوم ہونے لگی،

عادات و اطوار۔ یہ حکیم پستہ قد، قوی الجثہ اور بارعب تھا، شجاعت و بہادری کے ساتھ نیکدل، باوضع، راستباز اور خاموش بھی تھا صلح جوئی اسکا خاص جوہر تھا، وہ دوسرے بوالہوس بادشاہوں

[1] یونان قدیم میں یہ رسم تھی کہ چھوٹے اپنے بڑوں کے پاؤں تعظیماً دھوتے تھے۔ ثاقب

کی طرح لڑ بھڑ کر اپنی رعایا کا خون ہلاکت کی دیوی پر چڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا، یہی وجہ تھی کہ تمام ریاستیں اسکے ساتھ متحد تھیں،

شہر میں مسافروں کے لئے بہت سی سرائیں تھیں جنہیں راحت پہنچانا وہ اپنا سب سے پہلا فرض سمجھتا تھا، یتیم بچوں اور بیکس بیواؤں، لاچار و مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت و دستگیری اسکا نصب العین تھا، خود بھی دنیا و غم دنیا سے آزاد رہ کر ایک معمولی آدمی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، وہ جس طرح اپنی بیوی بچوں سے شفقت و محبت کرتا، اسی طرح اہلِ وطن پر بھی جان دیتا تھا۔

حکیم موتوں جو اپنے زمانے کا ایک مشہور و معروف حکیم گذرا ہے، اس کا ہمعصر تھا جس کے ہزاروں شاگرد و معتقد تھے، جب اس کے متعلق اکلیویکول نے سُنا کہ اس نے وطن ترک کر دیا ہے تو اُسکے آئندہ مصائب و تکالیف کے خیال سے بہت متاثر ہُوا، اور اپنی ریاست میں بُلانے کے لئے اس مضمون کا ایک محبت بھرا خط لکھا جس سے اس کی شرافت و نیکدلی کا اندازہ ہو سکتا ہے

> محترم دوست! میں جانتا ہوں کہ تمہیں ترک وطن کے بعد اپنے شہر سے زیادہ آرام ملیگا۔ اور تمہارے لاکھوں شاگرد و معتقد اپنے گھروں کو تمہارا گھر سمجھیں گے، لیکن میں نہایت خلوص کے ساتھ یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم میری ریاست شہر لندہ میں چلے آؤ جسکی آغوش محبت تمہیں لینے کے لئے ہر وقت تیار رہے، جہاں آنے کے بعد تمہیں دوسری ریاستوں سے کسی قسم کا خوف نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ خود بھی ایک آزاد و خودمختار ریاست ہے، اگر خدانخواستہ کسی قسم کی مخالفت ہُوئی بھی تو باور کرو کہ تمہاری عزیز زندگی کو میں اپنی زندگی سمجھوں گا،

**شہرت کا سبب۔** اُس کی شہرت کا خاص سبب یہ تھا کہ اُس نے حکمائے مصر کے طریقۂ نصیحت اور فلسفیانہ اندازِ بیان کا نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا، عموماً حکمائے مصر نصیحتوں کو چیستاں کی شکل میں پیش کرتے تھے جو موثر ہونے کے علاوہ بہت جلد زبان زد ہو کر غیر فانی ہو جاتے تھے، اس لئے اُس نے بھی مصر سے وطن واپس آ کر اسی طریقۂ بیان کو اختیار کیا جو وہاں کے لوگوں میں بہت جلد رائج ہو گیا اور اُس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

اس اعتبار سے یہ پہلا شخص ہے جس نے یونان میں "چیستاں" گوئی رائج کی، یہاں تک کہ وہ اپنے تمام خطوط میں بھی (جو وہ دوسرے ممالک کے دوستوں کو لکھتا) اسی طریقۂ بیان سے کام لیا کرتا تھا، مثال کے طور پر اُس کی ایک "چیستاں" ذیل میں درج کیجاتی ہے:-

میں بارہ لڑکوں کا باپ ہوں، اُن میں سے ہر ایک لڑکے کی تیس تیس لڑکیاں ہیں اُن لڑکیوں میں سے بعض تو نہایت خوبصورت ہیں اور بعض نہایت بدنما۔

یہ سب غیر فانی ہیں مگر پھر بھی ہر ایک کی عمر ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتی ..... اسکا حل:- "سال"۔ "مہینے" اور "دن" ہے۔

شاہ تید اس کی تعریف میں جو کتبے اُس کی قبر پر لکھے ہوئے ہیں وہ اسی نکتہ رس حکیم اور جادو نگار ادیب کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں۔

اگرچہ اس حکیم کو مرے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے لیکن اُسکے وہ زرّیں مقالات ابتک زندہ ہیں جو اُس نے وقتاً فوقتاً اہل وطن کیلئے لکھے اُن میں سے بعض ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

حقیقی بزرگی یہ ہے کہ انسان ظلم و تعدی سے دور رہے، ہر شخص کو اپنی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے دُنیا میں احمقوں کی تعداد ہر چیز سے زیادہ ہے، دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ نیکی کرو، جو ارادہ کرو اُس پر گھر ہی میں کافی غور کرلو، کسی سے بے ادبی اور گستاخی سے پیش نہ آؤ، کم بولو اور زیادہ سوچو، اپنے کام میں پہلے اُن لوگوں سے مشورہ کرلو جنہیں تم اپنے سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہو۔ دشمن سے حتی الامکان صلح کرنیکی کوشش کرو، جبر و تشدد سے کسی کی چیز نہ لو، اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرو، غریبوں پر ہنستے وقت اپنے مستقبل کو یاد رکھو، اگر زمانے کی ہوا تمہارے موافق بھی ہو تو کاہل و سست نہ بن جاؤ اور اگر خلاف ہو تو بیقرار نہ ہو، ہمیشہ اپنے ہی خاندان میں شادی کرو۔

باپ کو چاہیئے کہ ایک خاص حد تک اپنے بیٹوں کی عزت کرے، اپنی بیویوں کی تعریف غیر محرم لوگوں سے نہ کرو اور نہ اُن سے کسی قسم کا لڑائی جھگڑا کرو، ورنہ پہلی صورت میں تمہاری فطری کمزوریوں کا اظہار ہوگا اور دوسری میں کم عقلی کا۔

آخر کار قدرت کے غیر اختیاری "قانونِ موت" نے ستّر برس کی عمر میں اسکے لبوں پر بھی ہمیشہ کیلئے مہرِ سکوت لگادی جس سے عرصے تک شہر لندہ ماتمکدہ بنا رہا

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

# طلوعِ سحر

رات کی منجمد خاموشی اور طولانی گھنٹوں کے بعد اے صبح جب تیرا "حسین چہرہ" نمودار ہوتا ہے تو گھاس فرطِ مسرت سے کانپنے لگتی ہے ...... شبنم کے لطیف و نازک قطرے تجھے دیکھ کر موتی کی طرح چمکنے لگتے ہیں اور تاریکی پسند ابابیلیں روشنی سے تنگ آ کر ادھر ادھر اُڑنے لگتی ہیں۔ صاف و روشن فضاء اپنے گرد محیط دیکھ کر سبز و شاداب درخت رات کے گہرے سکوت اور اس کی خوفناک تاریکی کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، اور اپنے پتوں سے لدے ہوئے بازوؤں کو فرطِ محبت سے سورج کی گرم اور چمکدار کرنوں کو اپنی آغوشِ تمنا میں لینے کے لئے پھیلا دیتے ہیں۔ تمام رات مقید رہنے والی "ہوا" ایک بار پھر آزاد ہو جاتی ہے اور "تنویرِ سحر" کے ساتھ ساتھ رقص کرنے لگتی ہے، ساکن دریا جو ساری رات کسی کے انتظار میں "رہینِ بے خبری" رہا ہو اب پھر سرگرمِ رفتار ہو جاتا ہے۔

مغربی سمندر کی طرف بہت دُور زرد زرد ماہتاب اپنی سلطنت میں حکمرانی کرنے کے لئے چلا جاتا ہے اور مشرقی ممالک کا خوبصورت شہزادہ جس کے چہرۂ حسن سے محبت کی گرمی مترشح ہوتی ہے۔ اپنی نقاب اُلٹ دیتا ہے، اور "صبح" ہو جاتی ہے۔

شیام کشور کانپوری

# احباب فردوس

وہ تمام ایک نورانی دنیا میں چلے گئے اور میں ابھی تک یہیں سسک رہا ہوں، اُنکی یاد کس قدر دلکش اور پُرنور ہے! میرے مغموم خیالات میں روشنی کی ایک جھلک پیدا کر دیتی ہے، اُن ستاروں کی طرح جو درختوں کے تاریک جھنڈ پر ضیا پاشی کرتے ہیں، یا اُن نرم اور ہلکی کرنوں کی طرح جن میں یہ ٹیلا غروبِ آفتاب کے بعد ملبوس ہو جاتا ہے اُنکی یاد میرے ظلمت خانۂ دل میں درخشاں ہے۔

میری زندگی منتہائے عروج پر بھی، نہایت بے کیف اور فنا آموز ہے لیکن جب میں انکی شان و شکوہ کا عالم دیکھتا ہوں تو میری زندگی پر انکے جلال کی ایک منوّر لہر پھیل جاتی ہے۔

اے مقدس اُمید! اور اے فروتنی جو رفعت میں آسمانوں کی ہمسر ہے تمہاری بدولت مجھے انکا دیدار میسّر ہُوا ہے جس سے میری ویران اور برباد شدہ محبت پھر جگمگا اُٹھی ہے،

اے دلکش اور پیاری موت! اے عدل و انصاف کے گوہر آبدار! تو صرف گھٹا ٹوپ اندھیرے میں درخشاں ہے! اس پردۂ خاکستر کے پیچھے کیا کیا اسرار پنہاں ہیں؟ کاش انسان کی نگاہ حقیقت کو پا سکتی!

گھونسلے کو دیکھ کر ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ پرندہ پرواز کر چکا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ وہ کونسے چشموں یا کونسی جھاڑیوں میں نغمہ سرا ہے!

عالمِ خواب میں جس طرح انسان کی رُوح کو کبھی کبھی خوشنما اور خوبصورت فرشتے دکھائی دیتے ہیں، عین اسی طرح بعض نادر اور لطیف تخیلات کی بدولت جن کی لَے ہمارے معمولی نغموں سے نرالی اور بلند تر ہوتی ہے کبھی کبھی ہم عالمِ بالا کے پُرجلال اسرار میں جھانک لیتے ہیں +

(ایچ۔ واگن) عبدالسمیع آثر (صہبائی)

# محفلِ ادب

## (تیسرا خطبہ - بتاریخ ۵ر دسمبر ۱۸۵۲ء)

(مترجمہ جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (آکسن) آئی ای ایس - ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن)

حضرات! لفظ "ہندوستانی" اُس زبان کے حق میں جس کے لئے یہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ناموزوں ہے۔ اور اُسے اس نام سے یاد کرنا ہماری بدمذاقی ہے البتہ اس کو ہندوستانی Hindustanien کہا جا سکتا ہے۔ مگر انگریزوں کی تقلید میں ہم نے بھی اسکی ابتدائی شکل قائم رکھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندوستانی اہل ہندوستان کی زبان ہے مگر یہ زبان اپنی حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی ہے خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نما ہندوستان نیز ایران تبت اور آسام میں بھی بولتے ہیں۔ پس اس زبان کے لئے لفظ "ہندی" یا "اُنڈین" جو ابتدا میں اس کو دیا گیا تھا۔ اور جس نام سے کہ اکثر باشندے اس ملک کے ابتک اس کو موسوم کرتے ہیں اس نام سے زیادہ موزوں ہے جو اہل یورپ نے اختیار کیا ہے اہل یورپ لفظ ہندی سے ہندوؤں کی بولی مراد لیتے ہیں جس کے لئے "ہندوی" بہتر ہے اور مسلمانوں کی بولی کے واسطے "ہندوستانی" کا نام قرار دے لیا ہے۔ خیر یہ جو کچھ بھی ہوا، ہندوستان کی اس جدید زبان کی دو بڑی اور خاص شاخیں برٹش انڈیا کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہیں اور شمال کے مسلمانوں کی زبان یعنی ہندوستانی اُردو ممالک مغربی و شمالی کی سرکاری زبان قرار دی گئی ہے۔ اگرچہ ہندی بھی اُردو کے ساتھ ساتھ اسی طرح قائم ہے جیسے کہ وہ فارسی کے ساتھ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مُسلمان بادشاہ ہمیشہ ایک ہندی سیکرٹری جو ہندی نویس کہلاتا تھا اور ایک فارسی سیکرٹری جس کو وہ فارسی نویس کہتے تھے رکھا کرتے تھے تاکہ اُنکے احکام ان دونوں زبانوں میں لکھے جائیں اسی طرح برٹش گورنمنٹ ممالک

مغربی وشمالی میں ہندو آبادی کے مفاد کے لئے اکثر اوقات سرکاری قوانین کا اردو کتابوں کے ساتھ ہندی ترجمہ بھی دیوناگری حروف میں دیتی ہے۔

حضرات! میں نے اس سے قبل آپ کے سامنے کئی مرتبہ ہندوستانی علم ادب اور اسکی مختلف شاخوں کی نسبت تقریر کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس زبان کی تاریخ کی پہلی جلد میں میں نے ۷۵۰ مصنفوں اور آٹھ سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تیسری جلد میں جس کے طبع ہونے میں بعض وجوہ سے تاخیر ہوگئی ہے، میں اس سے دو چند جدید مصنفوں کا اور اسی قدر کتابوں کا احوال لکھوں گا۔ دیسی سوانح نویس عموماً صرف ان لوگوں کے چند اشعار لکھدینے پر اکتفا کرتے ہیں جن کی سوانح عمری وہ لکھ رہے ہیں اور اُن کی خاص خاص تصانیف اور تالیفات کا ذکر نہیں کرتے۔

اس وقت میں ان بیشمار مصنفین میں سے صرف تین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جن کے متعلق میں نے اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ یہ تینوں صاحب دہلی کالج کے پروفیسر ہیں جہاں کا صدر یعنی پرنسپل بارہ سال سے ایک مشہور فرانسیسی فیلیکس بوترو (M. Felix boutrour) ہے صدر مذکور "ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی" (یعنی انجمن ترجمہ) کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور اسی انجمن نے سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی زبانوں سے ترجمے کرکے ہندوستانی زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔

مذکورہ بالا اصحاب میں سے پہلے شخص رامچند ہیں جن کے عیسائی مذہب قبول کرلینے پر (اور کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنھوں نے یہ مذہب اختیار کیا) اس سال کے ماہِ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ اس پنڈت کی عمر اس وقت ۲۵ سال کی ہے۔ یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا۔ اور اس کالج میں اس نے انگریزی، ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا۔ لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا وہ متعدد مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے جن میں سے ایک الجبرا ہے جو (Brdgeand Eulbe) کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں (Inolysical Irignometrgurth comiodations) اور ایک کتاب علم ہندسہ

پر ہے جو Fullan & Boarchorlat کے طریقہ پر مرتب کی گئی ہے۔ ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے اور ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں۔ یہ پروفیسر دو رسالوں کے اڈیٹر بھی ہیں اُن میں سے ایک خاص طور قابل ذکر ہے جس کا نام "محبوب ہند" ہے یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معاملاتِ وقت پر دیسیوں کی تعلیمی حالت پر اور مشترکہ ادب یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں۔

دوسرے صاحب جن کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں رام کرشن ہیں۔ یہ زبردست صوفی عالم اور انگریزی ادب میں ایسے ہی قابل ہیں جیسے رام چند۔ یہ کشمیری النسل اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کی عمر قریب چالیس سال ہے۔ انہوں نے بہت سے مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ کئے ہیں جن کی عبارت نہایت فصیح اور شستہ ہے چند اُن میں سے یہ ہیں۔ دی پرنسپلس آف ہندو لا (اصول ہندو شاستر) مصنفہ سر ولیم میکناٹن کا ترجمہ۔ یہی وہ صاحب ہیں جو عربی (الف لیلہ) کے اڈیٹر ہیں اور افغانوں اور انگریزوں کی گذشتہ لڑائی میں بمقابل کابل مقتول ہوئے۔ ترجمہ اصول حکومت (دی پرنسپلس آف گورنمنٹ) کے علاوہ بھی قانون پر اُن کی کئی تالیف ہیں۔ نیز دوسرے فنون میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں مثلاً فن زراعت پر طب پر اور ایک انگریزی گرامر ہندوستانی زبان میں جس کے لکھنے میں انہیں ڈاکٹر اسپرنگر (Springer) نے بھی مدد دی ہے ڈاکٹر اسپرنگر اُس وقت دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ آج کل فورٹ ولیم کالج میں ممتحن اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سیکرٹری ہیں۔ اُن میں سے تیسرے صاحب کریم الدین ہیں۔ یہ پانی پت کے رہنے والے اور جیساکہ اُن کے نام سے ظاہر ہے مُسلمان ہیں۔ تقریباً ۱۸۱۲ء میں دہلی کالج میں شریک ہوئے اس وقت اُن کی عمر ۵۹ سال کی ہے اُن کی تمام تالیفات نثر میں ہیں اُن کو اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی نظم نہیں لکھی۔ انہوں نے بہت بُرا بھلا کہا ہے کہ لوگوں نے ہندوستان میں شاعری کو پیشہ بنا لیا ہے۔ اُن کی کتابوں میں بعض جدید تصانیف ہیں بعض ترجمے اور بعض تالیفات۔ پہلی صنف میں حسب ذیل کتابیں ہیں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم پر جس کے متعلق ہندوستان میں بہت غفلت کی جاتی ہے

ایک سوانح عمری ایشیا اور افریقہ کی مشہور عورتوں کی۔ اور ایک کتاب عروض پر جو بہت مشہور ہوئی۔ دوسری صنف میں یہ کتابیں ہیں ابوالفدا کی تاریخ کا ترجمہ۔ ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ اور عرب کے شاعروں کی تاریخ۔ تیسری صنف میں یہ کتابیں، ہندوستانی (اردو کے) اساتذہ کے کلام کا انتخاب۔ ایک کتاب وراثت پر جو اسلامی شریعت میں نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے علوم عملی (Exact Sciences) پر ایک مختصر رسالہ اور دلچسپ مقولوں۔ اور لطیفوں کی ایک کتاب جس کا نام "باغ ہند" ہے۔

۱۸۵۰ء کی طرح ۱۸۵۱ء میں بھی ہندوستانی مطابع ممالک مغربی و شمالی میں برابر کام کرتے رہے۔ اس زمانہ میں ہندی اور اردو رسالے اور بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ اِس سال پھر میرے پاس بعض دوستوں کی عنایت سے نئے مطبوعات کی فہرست پہنچ گئی ہے۔

حضرات! میں آپ کے سامنے ابتدائی رسالوں یا جو قدیم اساتذہ کی تصانیف۔ یا مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا جو دوبارہ یا بار بار چھپتی رہتی ہیں، ذکر نہ کرونگا۔ اگرچہ اسلامی مذہبی کتب میں سے قرآن شریف معہ اردو ترجمہ کے ایک دہلی کا اور دوسرا آگرہ کا قابل لحاظ ہے۔ لیکن مذکورہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابل بیان ہیں "تاریخ آگرہ" جو محمد سدیدالدین نے اردو میں لکھی ہے "بہار عشق" مولفہ نور علی یہ کتاب نل کا قصہ معلوم ہوتی ہے "قصہ گرد چیلا" یہ قصہ کلیلہ دمنہ کے قصہ کے طرز پر لکھا گیا ہے "قصہ سپاہی زادہ" "دیوان نوید" ایک مشہور ہمعصر شاعر کا دیوان "دیوان نظیر" جو اب تک کامل نہیں چھپا تھا۔ گلستاں کا ہندوستانی ترجمہ جو پہلی مرتبہ فارسی متن کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ ایک تاریخی نظم فاتحانِ ہندوستان پر معہ انگریزی ترجمہ کے یہ کتاب شہنشاہِ دہلی کے حکم سے شاہی شاعر مہاراجہ پرداکرشن بہادر نے لکھی تھی۔ یہ شاعر اگرچہ ہندو تھا۔ مگر بجائے ہندی میں لکھنے کے جو عام طور پر ہندوؤں کی زبان ہے۔ اُس نے اردو میں لکھی۔ آخر میں ایک قصہ قابل بیان ہے جو علم الاقوام کے نقطۂ نظر سے موجب دلچسپی ہے اور ٹھیٹ ہندوستانی میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کے بغیر لکھا گیا ہے۔ اسکے لکھنے والے انشاءاللہ خاں تھے جو اسی صدی کے ابتدا میں ایک مشہور شاعر گذرے ہیں یہ قصہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال

کے ایک رسالہ میں طبع ہوا ہے۔

ہندی کی صرف ان کتابوں کے بیان کرنے پر اکتفا کرونگا۔ اخلاقی مقولے موسوم بہ "نیتی نبود" ہندو مہاجنوں کے لئے ایک کتاب جس کا نام "مہاجنی سرو پکا" ہے ہندی مطبوعات میں جن کی اشاعت کی اس سال اطلاع دی گئی ہے، وید کے کامل ترجمے خاص طور پر قابل بیان ہیں جس کے ساتھ اصل سنسکرت بھی ہوگی۔

حضرات! مجھے اُمید ہے کہ میرے لکچر ہندوستان کی جدید زبان کے علمی اور ادبی مطبوعات کے پڑھنے میں کافی طور پر رہنمائی کرینگے۔ میری تعلیم کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا ہے وہ جیساکہ آپ کو معلوم ہے تفصیلی ہے۔ میں ہر لفظ کی تشریح کرتا ہوں اور متن کے معنیٰ و مطالب کے ساتھ ساتھ نحوی قواعد پر بھی نظر ڈالتا جاتا ہوں اور ہر محاورے کا تجزیہ کرتا ہوں۔ میری دانست میں یہی ایک طریقہ اصلی اور صحیح ترقی کرنے کا ہے۔

ہم اس سال شیر شاہ کی تاریخ کے اُس حصّہ کو ختم کرینگے جو گذشتہ سال ختم کیا گیا تھا شیر شاہ افغانوں کا کینخسرو ( Xerxes. ) تھا جو اگرچہ ابتداء میں ایک گورنر تھا۔ مگر اپنی قابلیت، اپنے کیرکٹر اور اپنے انصاف وعدل کی وجہ سے تخت دہلی پر قابض ہوگیا۔ ابھی وہ بہت کم عمر تھا کہ اُس کے والد نے اُسے اپنے علاقہ کے ایک حِصّہ کا انتظام سپرد کیا۔ والد سے رخصت ہوتے وقت اُس نے یہ الفاظ کہے "ابّا جان! مجھے اجازت دیجئے کہ میں جناب سے اپنے دلی خیالات کا صاف صاف اظہار کردوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس ملک کی زراعت کی ترقی میں کوشش کروں جس کو آپ نے میرے سپرد کیا ہے اور اس کی فلاح و بہبودی میں کوشاں رہوں۔ مگر میں اپنے مقصد میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ہر معاملہ میں عدل و انصاف سے کام نہ لوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ عدل اعلیٰ ترین نیکی ہے اس سے سلطنتوں کی وسعت اور استحکام ہے۔ اور اسی سے خزانہ مالامال اور شہر اور قصبے آباد و خوش حال ہوتے ہیں۔ ظلم اس کے برعکس ہے اور بدترین عیوب میں سے ہے یہ تباہی و بربادی کا موجب ہوتا ہے اور جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ دنیا و عاقبت میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔ پس ہر بادشاہ کا فرض ہے کہ اپنی رعایا سے مہربانی

سے پیش آئے اور اُن کی خبر گیری کرے کیونکہ خدا نے رعایا کو بادشاہوں کی پناہ میں دیا ہے جن کا فرض ہے کہ اُن کو ظلم و استبداد سے بچائیں اور اُن کو خوش رکھیں۔ اس کے حصول کے لئے کامل عدل و اعلیٰ انتظام ضروری ہے۔ عمدہ حکومت کے نہ ہونے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور رعایا کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ اچھی حکومت کی مثال اُس بارش کی سی ہے جو زندگی بخشتی ہے اور بغاوت کے گرد و غبار کو دبا دیتی ہے اور وہ اس تلوار کی مانند ہے جسکے جوہر کا عکس سلطنت کے رخسار پر پڑتا ہے اور اُس کو مثل آفتاب کے منور کر دیتا ہے۔

میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بعض عہدہ دار جو میرے ماتحت کام کے لئے تجویز کئے گئے ہیں ظلم اور سختی کو جائز رکھتے ہیں۔ میں سب سے اول اُن کو نرمی سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے کہنے پر عمل کرینگے تو مجھے سختی نہیں کرنی پڑیگی لیکن اگر کچھ ایسے ہونگے جن میں یہ خرابی اس درجے سرایت کئے ہوئے ہے کہ وہ اُن سے نہیں چھوٹ سکتی تو میں سختی میں کوتاہی نہ کروں گا اور اُنکو ایسی سزا دونگا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو گی۔ جب بدنظمی پھیلانے والے بدطینت لوگ سلطنت کی آگ کو شعلہ زن دیکھتے ہیں تو چھپے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب اُنہیں ذراسی بھی بدنظمی انتظام مملکت میں نظر آتی ہے تو ہر جگہ فساد پیدا کرتے ہیں اور حکومت کی عمارت بہت جلد شکستہ ہو جاتی ہے۔ حکیموں نے کہا ہے کہ مملکت مانند ایک درخت کے ہے جس کی جڑوں کی آبیاری ہمیشہ اچھے نظم و نسق سے کرنی چاہیئے تاکہ وہ امن و امان اور اطمینان کے ثمر سے بار آور ہو۔ ........"

حضرات! میں اس سال پریم ساگر کی بھی تشریح کروں گا۔ پریم ساگر ایک کہانی ہے جو مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھی گئی ہے اور جگہ جگہ اس میں نظم بھی آتی ہے۔ یہ کہانی کرشن جی کے حالات سے متعلق ہے اور بھاگوت کے دسویں باب سے ماخوذ ہے۔ اسی "پران" کے ترجمہ کے طبع کا کام ایک مشہور ہندی کے عالم نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ وہ اسی دسویں باب تک پہنچا تھا کہ موت نے علم و ادب کے اس سرمایۂ ناز کو ہم سے چھین لیا۔ لیکن ایک اور کتاب جو ہندی نظم میں ہے اور اسی دسویں باب کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ اور پریم ساگر سے بھی قدیم ہے۔ فرانسیسی زبان سے حال میں (M. H. Pavie) مونسیو تھامس

بیدی نے طبع کرائی ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ موسیو موصوف میرے شاگردوں میں ہیں اس کا نام کرشن جی اور انکی تعلیم ہے۔ اسے یوجین بورنوف کی کتاب کا تتمہ سمجھنا چاہیئے۔

پریم ساگر ایک نہایت دلچسپ افسانہ ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ کی مقدس تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اسکے ہر صفحہ میں عیسائی مذہب کے واقعات کا مبہم سا اعادہ نظر آتا ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ وہ سچ ہے اور یہ غلط۔ اور اسی لئے یہ کتاب متشابہات اور اضداد سے بھری ہوئی ہے۔ کرشن جی کی تاریخ اگرچہ مشرقی تخیل کے عجائبات سے پُر ہے اور غیر مسیحی اخلاقی خرابیوں نے اُسے خراب کر دیا ہے۔ تاہم عیسیٰ مسیح کی تاریخ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے میں نے اپنی ایک تصنیف میں نمایاں کرنیکی کوشش کی ہے اور اگرچہ میرا یہ خیال عیسائی ہونیکی بنا پر تھا مگر میں نے دیکھا کہ یہ مقابلہ مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچانیکے بجائے کتاب کی وقعت کو اور بڑھا دیگا۔ مجھے یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ کرشن جی کی زندگی کے حالات عیسیٰ مسیح کے حالات کی صدائے بازگشت ہیں اور اسکی تعلیم عیسائی مذہب کے اصول کا ایک عکس ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عیسائی مذہب ہندوستان میں بہت پہلے پھیل چکا تھا جیسا کہ ہماری مذہبی روایتوں سے بھی ظاہر ہے۔ سینٹ فرانسیس زیویر جو پیرس یونیورسٹی کا مشہور طالب علم تھا اور "انڈیز کے مبشر" کے لقب سے مشہور ہے، جب کوچین اور ٹراونکور کے ساحلی قصبوں میں مذہب عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پہنچا تو اُس نے وہاں کے اصلی باشندوں کو عیسائی مذہب کا پیرو پایا۔ جنکو اس زمانہ کے وقائع نویسوں نے "پُروا" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اُسی نے مقام میلاپور میں سینٹ تھامس کی قبر بھی دیکھی۔ یہاں میں اس بات کا اشارہ بھی کرنا چاہتا ہوں کہ صوبہ بیجاپور میں جس کے بڑے شہروں میں گو آبھی ہے سینٹ مذکور کو ہندوستان کی دکنی بولی میں وعظ کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بولی بیجاپور میں اسی طرح مروج ہے جس طرح مرہٹی۔

(اردو)

---

ایک مُسکراہٹ کی قیمت کون بتا سکتا ہے؟ دینے والے کا اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا لیکن پژمردہ خاطر، گنہگار، افسردہ دل اور بیکس کے حق میں یہ انمول ثابت ہوتی ہے۔ اُس سے کینہ کی آگ

بجھ جاتی ہے، بدمزاج رام ہوجاتے ہیں۔ نفرت محبت سے۔ انتقام مہربانی سے بدل جاتا ہے۔ اور تنگ و تاریک راستے جواہرات کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ خندہ پیشانی نیک دل انسان۔ جانی دوست محبت کرنیوالے بھائی، تابعدار بیٹے اور مہربان شوہر کی نشانی ہے۔ اس سے حُسن دوبالا ہوجاتا ہے بدصورتی پر پردہ پڑجاتا ہے۔ اور حسین عورت بہشتی فرشتوں سے مشابہ ہوجاتی ہے ؛

---

مذہب کے بعد انسان کی اصلاح کے واسطے کوئی شئے علم سے بڑھ کر نہیں۔ اگر فلسفہ کی خاردار جھاڑیوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے ہو تو مطالعۂ تواریخ میں تو کوئی اندیشہ نہیں اس سے بڑھ کر آسان کام کیا ہوگا جس میں تفریح اور فائدہ دونوں موجود ہیں۔ ایسے شخص کو دیکھ کر ہمیں کیسا افسوس ہوتا ہے جسکی گردن اکڑ گئی ہو۔ اور پیچھے مُڑ کر نہ دیکھ سکے لیکن وہ شخص جو گزشتہ کارہائے نمایاں سے بے خبر ہے اس سے بھی بڑھ کر قابل رحم ہے تواریخ نوجوان کو بغیر جھریوں اور سفید بالوں کے بوڑھا بنا دیتی ہے اس سے بڑھاپے کا تجربہ بغیر بڑھاپے کی تکلیفوں کے حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ صرف ماضی کو حال ہی نہیں بنادیتی بلکہ آئندہ کی بھی خبر دیتی ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی بالکل نیا واقعہ نہیں پیش آتا۔ ہر ایک چیز ایسی ہی نئی ہوتی ہے جیسے کہ نیا چاند جو اصل میں محض پرانا چاند بدلی ہوئی صورت میں ہوتا ہے اسی طرح پرانے واقعات بھی بار بار نئی اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں ؛ (دین و دنیا)

---

## علامہ چانکیا کے اقوال

ایک شہنشاہ اولوالعزم اس قدر عزت کبھی حاصل نہیں کرسکتا جسقدر کہ ایک عالم متبحر کو حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ شہنشاہ اولوالعزم کی عزت اسکی سلطنت میں ہوتی ہے اور عالم متبحر کی ہر جگہ — !!

**شریف لڑکا۔** جھاڑی ایک خوشبودار درخت سے معطر ہوجاتی ہے اسی طریقہ ایک شریف الطبع متدین لڑکے کے وجود سے اُسکے خاندان کی عزت میں چار چاند لگ جاتے ہیں — !

**شریر لڑکا۔** جس طرح ایک گھنا جنگل ایک چھوٹی سی چنگاری سے جل کر خاکستر ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک بداطوار لڑکے کے وجود سے اُس کا خاندان تباہ ہوجاتا ہے — !!!

**بدمعاش آدمی۔** شریر آدمی سے ہمیشہ احتراز کر وخواہ وہ کیسا ہی عالم ہو اُسکی مثال بعینہٖ اس سانپ کی ہوگی جسکے سر میں ایک چمکتا ہوا من ہو — !!!
لیکن کیا وہ اس حالت میں خطرناک نہیں ہے ؟ (الناظر)

# حصۂ نظم

## آبشار

(بے قافیہ)

سچ بتا اے پھرنے والے وادی و کہسار میں
بڑھ رہا ہے دشت میں اس طرح سے مستانہ وار
کیوں پریشاں اس قدر ہے کس کی ہے تجھکو تلاش
ہاں کہاں جاتا ہے کیوں تجھکو نہیں صبر و قرار
جس طرح کوئی مسافر بے خبر منزل سے ہو
صبح سے تا شام رہتا ہے جو محو جستجو

۲

جانے والے ڈالتا جا وادیوں پر اک نظر
کر دیا شاداب سبزہ تیرے سیلِ اشک نے
ہر طرف رنگینیاں پھیلی ہوئی ہیں دشت میں
دیکھتا جا حسنِ فطرت اور گل کی یہ بہار
پتہ پتہ ہو گیا مخمورِ صہبائے نشاط
پھول ہیں محو تبسم، ہر کلی خاموش ہے

۳

تیری سطحِ آب پر اُڑتے ہیں مرغانِ چمن
جن کے نغموں سے فضا ساری ترنم ریز ہے
اونچی اونچی چوٹیوں پر جب پگھل جاتی ہے برف
اور جب پڑتی ہیں اُس پر آ کے کرنیں متصل
اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بجلیاں
کوندتی ہیں پردہ ہائے شب میں مل کر ایکبار
جس قدر چیزیں ہیں ساحل پر ترے اے آبشار
گویا وہ فطرت کی صنّاعی کا اک آئینہ ہیں

۴

آہ یہ دلکش مناظر اور تیری خامشی
آہ یہ پھولوں کی بارش اور تیرا یہ سکوت
ہاں اگر اس خواب سے بیدار ہو جاتا ہے تو
پھر تو بڑھ جاتا ہے تیرا جذبۂ جوش و خروش
تیری بیتابی کی کوئی حد نہیں رہتی ہے پھر
یعنی ہر ہر موج بن جاتی ہے یکسر اضطراب
وادیوں کے کنج تیرے شور سے معمور ہیں
اور نالوں سے ترے ساری فضا ہے سوگوار
ہاں بتا کچھ تو بتا، تو کس لئے مغموم ہے
کر رہا ہے اس طرح ہستی جو بربادِ فنا
ہائے کتنی رحم کے قابل ہے یہ حالت تری
پھر رہا ہے پتھروں سے سر کو ٹکراتا ہوا

کھو چکا ہے اپنے دل سے کس لئے صبر و قرار کس لئے رُکتا نہیں تجھ سے یہ سیلابِ رواں
ہاں اگر تو واقفِ آئینِ بربادی نہیں
دیکھ ثاقب کی طرح برباد ہو بیتاب ہو

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

# زیست

زیست وہ حالت ہے جس میں خود فراموشی نہ ہو نالۂ مُرغِ چمن ہو گل کی خاموشی نہ ہو
جستجو پیہم ہو راحت سے ہم آغوشی نہ ہو سود اندیشیٔ محفل ہوز یاں کوشی نہ ہو
یعنی شمعِ زندگی اک سوز کی تصویر ہو
جس کے پروانوں کی خاکستر میں بھی اکسیر ہو

۲

دردِ دل بے ساختہ ہو ولولہ انگیز ہو چشمِ سر بینا ہو اور چشمِ بصیرت تیز ہو
گلشنِ ادراک کا ہر پھول عنبر بیز ہو نطق طوطی کی طرح شیریں ہو شکر ریز ہو
سینہ حکمت کے زرِ خالص کا اک گنجینہ ہو
اور پیشانی آئینِ اخلاص کا آئینہ ہو

امینِ حزیں

# نغمۂ آسمانی

(مترجمہ جناب لالہ تلوک چند محروم بی۔اے)

کیا شان ہے فرشِ آسمان کی چنیاں ہیں جڑی ہُوئی سُنہری
ہے خُرد تریں کرہ بھی اِس کا مانندِ فرشتہ نغمہ پیرا
گردش میں ہیں صاف گائے جاتے اور سُر ہیں فرشتوں سے ملاتے
ہے ایسا ہی نغمۂ نہانی جُزدِ ارداحِ غیر فانی
جب تک ہے یہ خاکِ تن میں روپوش
محروم ہے اس سے پردۂ گوش

شکسپیئر

# جذباتِ عالیہ

## یاس

ازل سے سخت جاں آمادۂ صد امتحاں آئے
عذابِ چند روزہ یا عذابِ جاوداں آئے

کنول روشن تو ہو دل کا پیام ناگہاں آئے
بلا سے شامتِ پروانۂ آتش بجاں آئے

دعائیں ہوں تو ایسی ہوں سفارش ہو تو ایسی ہو
فلک آمین کہے۔ دل سے صدائے الاماں آئے

سکونِ بیدلی میں کیا کہوں کیوں لہر پیدا ہے
مبادا غیب سے کوئی نویدِ ناگہاں آئے

قفس پر بادل آئے آشیانے پر گری بجلی !
چمن میں آگ برسے خانۂ دل تک دھواں آئے!

بہارستانِ عبرت میں یہ گل کیا خار کیا خس کیا
سراپا سب کے سب آلودۂ رنگ خزاں آئے

زہے احسانِ بیحاصل کہ دن کے دن اسیروں کو
اجل کے ساتھ حکمِ بازگشتِ آشیاں آئے

قفس بردوش پھرتے ہیں خزاں آبادِ عالم میں
اسیرانِ ازل گھر چھوڑ جنگل میں کہاں آئے

خیال خام ہے یا معنی بے لفظ۔ کیا جانیں
سمجھ میں رازِ فردا کیوں نصیبِ دشمناں آئے

سواری بولنے والا نہ کوئی نوحہ خواں اپنا
اجل کیا آئی جیسے بے بلایا میہماں آئے

وہی آغوشِ ساحل اور وہی منجدھار کے ڈوبے
پلٹ کر خاک میں ملنے کہاں سے پھر کہاں آئے

حق اپنی دھن کا پکا باطل اپنے زعم میں پورا
الٰہی گفتگوئے صلح کیونکر درمیاں آئے

حریم ناز کیا ہے جلوہ گاہِ بے تماشا ہے
نگاہِ یاس کہتی ہے کدھر آئے کہاں آئے

## برق

نقل میں اصل کی ہوتی کبھی تاثیر نہیں
دلکشا گل کی طرح غنچۂ تصویر نہیں

نقشِ صناعِ حقیقی میں یہ نیرنگی ہے
کسی تصویر سے ملتی کوئی تصویر نہیں

صفحۂ دہر سے مٹ جاتا ہے نقشِ ہستی
لوحِ پیشانی سے مٹتا خطِ تقدیر نہیں

زینتِ عالمِ اسباب ہے نیرنگی سے
رونقِ ہستیٔ فانی ہے یہ تفسیر نہیں

رشتہ بر پا ہے علائق سے زمانے میں بشر
کون ایسا ہے جو پابستۂ زنجیر نہیں

جانستانی پہ کمر بستہ اجل رہتی ہے
ایک ساعت اسے ہوتی کبھی تاخیر نہیں

دل میں قائم رہے پرتو ترے رُخ کا کیونکر
عکس سایہ ہے کچھ آئینہ کی جاگیر نہیں

کیوں نہ دیں عرض تمنا پہ وہ دو ٹوک جواب
اُن سے سُنواتی ہے ناکامیٔ تقدیر نہیں

کھُلی آنکھوں نظر آتا ہے جو نیرنگِ حیات
جُز فنا اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں

تن بہ تقدیر رہو دارِ مکافات میں برق
اور راضی برضا رہنے کی تدبیر نہیں

## امین

میں تو جیتا ہوں فقط جی سے گذرنے کے لئے
حُسنِ مُطلق کو دل و جان نذر کرنے کے لئے

اس مرے وجدان کی تردید ہو سکتی نہیں
زندگی مجھکو ملی ہے اپنے مرنے کے لئے

دیدۂ نرگس نگاہ یار کا اعلان ہے
تیر اس ترکش کے ہیں دل میں اترنے کیلئے

بوئے گل بادِ صبا سے کہہ رہی ہے کان میں
مجھکو لے چل یہ ورق تو ہیں بکھرنے کے لئے

ہے دیا ایمان دنیا کو کمالِ حُسن نے
آئینہ خانہ بنایا ہے سنورنے کے لئے

اس چمن کے کونے کونے میں نظر آئیں امین
قینچیاں دلبستگی کی پر کترنے کے لئے

## خورشید

آج کچھ دشت نوردی کے ہیں سامان غالب
پھر مرے ضبط پہ ہے شورشِ پنہاں غالب

اثر غمزہ سے بڑھ کر ہے مرادِ سنتِ جنوں
چاک دل پر ہے مرا چاک گریباں غالب

ابروئے یار کے سائے میں ہے چشمِ جادو
ہو گیا دیکھ لو کافر پہ مسلماں غالب

داد دیجے مری شورِیدہ سری کی للّٰلہ
موسمِ گُل میں بھی ہے شوقِ بیاباں غالب

لہر جو جو دلِ پُرخوں سے اُٹھی دب نہ سکی
چارہ گر کا نہ ہُوا ایک بھی درماں غالب

گو بظاہر تھا زلیخا کے لئے قصرِ عزیز
دل پہ رہتی تھی مگر الفت زنداں غالب

وسعتِ جوشِ جنوں مجھ سے نہ پوچھ اے خورشید
صبح کے چاک پہ ہے چاکِ گریباں غالب

## شاد عظیم آبادی

الفتِ لالہ و گل نے جو نہ گھیرا ہوتا
کیوں پھر اس باغ میں صیّاد بسیرا ہوتا

اے صنم طالبِ دیدار کا جی چھوٹ گیا
بیرخی کرکے مُنہ اس طرح نہ پھیرا ہوتا

اک مرے حال نے مغموم کیا عالم کو
کاش دُنیا میں کوئی دوست نہ میرا ہوتا

ناتوانی، وہی اب ہم ہیں کہ اللہ اللہ
کوچۂ یار کا برسوں نہیں پھیرا ہوتا

نہ کرے اب کوئی دل کو مری جانب منسوب
میرے پہلو میں نہ ہوتا جو یہ میرا ہوتا

چونک غافل کہ نمایاں ہے سحر پیری کی
چاہتا کیا ہے کہ اس سے بھی سویرا ہوتا

نہ دیا چین مجھے وحشتِ دل نے ورنہ
کسی جنگل میں کسی رات تو ڈیرا ہوتا

لو، چلو باغ سے اے زمزمہ سنجانِ بہار
کٹ گیا نخل وہی جس پہ بسیرا ہوتا

بے رخی کا گل و بلبل کی عبث شکوہ شاد
آخر اس باغ میں تھا کون جو تیرا ہوتا

---

## رباعیات

۱

طفلی و ضعیفی و جوانی دیکھی
ہر حال میں عمر کی روانی دیکھی

عالی سر بقا سمجھ میں آیا؟
عالم کی ہر ایک چیز فانی دیکھی

۲

سچ پوچھو تو کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے
دل فکرِ طلب میں اور گھبراتا ہے

ساری دُنیا بھی گر ملے حاصل کیا
جب مرنے پہ کچھ ساتھ نہیں جاتا ہے

# قطعات

**۱**

جب لڑکپن تھا تو اس کو کھیل میں کھویا کیا — جب شباب آیا تو میٹھی نیند میں سویا کیا
کھل گئیں آنکھیں جو سر پر صبحِ پیری آ گئی — عمر بھر اُس کھیل کو اُس نیند کو رویا کیا

**۲**

میں مصیبت سے بھی خوش ہوں عیش سے بھی شاد ہوں — یعنی میں پابندیٔ افکار سے آزاد ہوں
میرے دشمن میری بربادی میں کوشاں ہیں فضول — غیر ممکن ہے کہ میں برباد ہوں ناشاد ہوں

**۳**

زندگی کا راز مجھ سے فاش ہو سکتا نہ تھا — اس دُرِ نایاب کو میں مفت کھو سکتا نہ تھا
مجھکو وقتِ نزع بھی تھا راز داری کا خیال — موت سر پر ہنس رہی تھی اور میں رو سکتا نہ تھا

**۴**

آدمی کوشش کا اپنی جب صلہ پاتا نہیں — دل میں درد اُٹھتا ہے ایسا، کچھ کہا جاتا نہیں
ہے یہ رازِ کامیابی غور سے دیکھو اگر — گر نہ ہوں ناکامیاں پھر لُطف کچھ آتا نہیں

**۵**

جب کثرتِ الم سے وہ ناشاد ہو گیا — سمجھا تھا میں کہ دل مرا برباد ہو گیا
آخر ہجومِ غم نے مٹا ہی دیا اُسے — آباد ہوتے ہوتے وہ برباد ہو گیا

**۶**

دُنیائے دنی کی چالوں سے دل اپنا گھبراتا ہے — اک بنتا ہے، اک مٹتا ہے، اک کھوتا ہے اک پاتا ہے
کچھ عقبیٰ کی بھی فکر کرو، فرصت یہ غنیمت ہے عالی — ہاں وقت گزر جاتا ہے جب پھر ہاتھ نہیں کچھ آتا ہے

**۷**

انسان کی بھی کیا ہستی ہے مسرور کوئی، ناشاد کوئی — ہے فطرت کا قانون یہی، پابند کوئی، آزاد کوئی
اس فکر میں تو کیوں مرتا ہے، ہاں عمر تلف کیوں کرتا ہے — ہے رنگ یہی اس دُنیا کا آباد کوئی برباد کوئی

عالی لکھنوی

---

دل میں جو ایک قطرۂ خوں تھا مدارِ زیست — وہ بھی نیازِ حسرتِ پیمانہ ہو گیا
(بیباک)

محبت رنگ دے جاتی ہے دل جب دل سے ملتا ہے — مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے
(جلیل)

فقط اک قطرۂ خوں رہ گیا ہے جسم کے پہلو میں — اسی کو دل سمجھ لو تم اسی کو آرزو دل کی۔
(رسا رامپوری)

# تقریظات

## ہیئت جدید

مؤلفہ

پروفیسر منہاج الدین ۔ بی ۔ اے ۔ ایم ۔ ایس ۔ سی ۔ اسلامیہ کالج پشاور

و

پروفیسر برکت علی ۔ ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ایس ۔ سی ۔ اسلامیہ کالج پشاور

اُردو زبان علوم و فنون جدیدہ کے تراجم اور صحیح معلومات سے محروم ہے ۔ بعض بعض مضامین مختلف علوم پر لکھے گئے لیکن ناکافی خصوصاً علم ہیئت (اسٹرانومی) کے ضروری معلومات اور نئے اکتشافات سے اُردو کے گوش آشنا بھی نہیں ۔ حضرات پروفیسران موصوف الصدر نے برسوں کی سعی مسلسل سے ملک و زبان کی ایک بڑی قابل فخر خدمت انجام دی ہے کہ علم ہیئت کی جملہ معلومات قدیمہ و جدیدہ ایک جگہ جمع کر دی ہیں ۔ زبان نہایت سلیس و عام فہم ہے ۔ اس کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے ۔ کہ یہ کتاب نہ صرف شائقین علوم کے لئے مفید ہو ۔ بلکہ جو اصحاب اس علم کو سیکھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا چاہیں ۔ انکو دوسرے ملکوں کی اجنبی زبانوں کا دست نگر نہ ہونا پڑے ۔ اکتشافات جدیدہ پوری تلاش اور کوشش سے جامعیت کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں ۔ کثرت و وسعت مضامین کا سرسری اندازہ تعداد صفحات سے ہوسکیگا

### کتاب کے تین حصے ہیں

**حصہ اوّل** ۔ اس میں علم ہیئت کی مجمل تاریخ ہے ۔ اور علم ہیئت کی مبادیات وقت عرض بلد طول بلد ۔ تاریخ کا مفصل بیان کیا گیا ہے ۔ تجاذب مادی کا مشرح تذکرہ ہے ۔ آفتاب زمین اور سیاروں کے وزن معلوم کرنیکا طریقہ وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے ۔ اجرام سماوی کے فاصلے معلوم کرنیکے طریقے قلمبند کئے گئے ہیں ۔ اور آلات ہیئت جو آجکل رصد گاہوں میں استعمال ہوتے ہیں ۔ بیان کئے گئے ہیں آخر میں کسوف و خسوف پر سیر کن بحث ہے ۔ اور دیگر مناظر ہیئت کے عام فہم اور مفصل حالات ہیں تقطیع کلاں تعداد صفحہ ۳۵۰ ۔ قیمت کاغذ قسم اول تین روپیہ (سے) قسم دوم دو روپیہ (عہ)

**حصہ دوم** ۔ یہ مستقل کتاب نظام شمسی کے متعلق ہے ۔ اس میں آفتاب سیاروں ۔ زمین اور قمر کے مفصل حالات صحیح قلمبند کئے گئے ہیں ۔ دمدار ستاروں اور شہاب ثاقب کی ہیئت وغیرہ پر شرح بحث ہے زیر طبع ۔ صفحوں کی تعداد ۳۰۰ کے

قریب ہوگی اور قیمت قسم اول دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ/) قسم دوم ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/)

**حصہ سوم** - اس میں مجامع النجوم کا تفصیلی بیان ہے۔ تمام مجامع النجوم اور انکی شناخت کے طریقے دیئے گئے ہیں ستاروں کی ماہیت انکے بعد حرکات اور اوزان معلوم کرنیکے طریقے واضح کئے گئے ہیں ہیولائے فضائی کے تذکرہ کے بعد یہ بحث ہے دنیا کیا تھی۔ اور کیا ہو جائیگی۔ زیر طبع۔ صفحوں کی تعداد ۳۰۰ کے قریب ہوگی قیمت قسم اول دو روپیہ ۸ر (عہ/) قسم دوم (عہ/)

## زینت آسمان

ہندوستان میں جو ستارے نظر آتے ہیں۔ انکا ہر ماہ کیلئے الگ نقشہ دیکر ستاروں کی شناخت کرائی گئی ہے۔ جس شخص کو ستاروں کے مطالعہ کا شوق ہو اسکے لئے اس جامعیت کی کوئی کتاب اردو میں نہیں ہے۔ قیمت (عہ/)

# عرب اور انکا مستقبل

از

سید مقبول احمد الہ آبادی بی۔ اے

مصنف نے اس کتاب کو مصر کے آزادی اعلان سے دو سال پہلے ترتیب دیا تھا اور اس میں (آئندہ) آزاد مصریوں کو اتحاد و آزادی عرب کی ضرورت پر مائل کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ترک صلح نامہ سیورے سے بالکل پامال ہو چکے تھے اور ان سے عرب کیلئے کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی۔ مصنف کا خیال ہے کہ ترک عرب کے لئے کبھی موزوں نہ تھے اور نہ ہونگے۔ مگر خود عرب بھی اس قابل نہیں کہ وہ اپنے پیر پر کھڑے ہو سکیں عرب کی برادری میں مصری قوم ضرور ترکوں کی جگہ عرب کی صیانت کا بار اٹھا سکتی ہے۔ اور انکے خیال کے مطابق عرب عظیم (جسکا نقشہ صفحہ اول پر دیا گیا ہے) جزیرۃ العرب سے نکلکر انہائے الخلا تک پھیلا ہوا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مصنف پین تورانزم کی طرح پین عربزم کا خواب دیکھ رہا ہے۔ کتاب دو سو صفحے کی ہے اور چند مضمون پر حاوی ہے۔ پہلا مضمون قدیم عرب۔ دوسرا فتوحات عرب پر تیسرا تمدن عرب پر چوتھا انحطاط عرب اور پانچواں ممالک عرب پر اور اس میں مصنف نے خیال کے مطابق عالم عرب کی تفریح اور تشریح ہے چھٹا مضمون مستقبل عرب ہے جو عربوں کی طرف سے مصریوں کو ایک پیام ہے اور مصنف کی طرف سے اپنی ہمقوم ہندوستانیوں کے لئے اپیل اور ہندوستان میں انجمن اعراب کی انعقاد کی تحریک۔ اسی مضمون میں شریف مکہ (دکور باطن) کا وہ اعلان بھی درج ہے جو ترکوں سے بغاوت کے وقت عالم عرب میں شائع کیا گیا تھا اور اتحادی شریف کی تردید۔ طباعت نفیس۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ (آجکل جبکہ عالم اسلام کی نظریں خصوصاً عرب کی طرف اٹھی ہوئی ہیں یہ کتاب وقت کی کتاب سمجھی جائیگی) +

# فہرست مضامین بابت ماہ نومبر ۱۹۲۳ء

جلد ۴ — نمبر ۵

## نثر



## نظم



محمد انور کاتب چوک متی۔ لاہور

# جہاں نُما

یُورپ میں کیا ہو رہا ہے ؟ ہم سُنتے ہیں کہ نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگِ یورپ کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس جنگ کا تو بیشک خاتمہ ہو گیا جو خندقوں میں برپا تھی جو فضا میں بُہت دُور سے آنے والے لوگوں کی ہیبتناک آوازیں بولتی تھی جو زندگی کو جلا دینے والی بہا دینے والی ڈُبا دینے والی شیطانی طاقتوں میں ہزاروں شکلوں میں ظاہر ہوتی تھی روز و شب کی شائید ہر ہر ساعت میں ظاہر ہوتی تھی جس سے غم و غصہ اور علالت و کُلفت کے اندوہ گیں منظر پیدا ہوتے تھے اور انسانیت کو اپنے کھیتوں اور باغوں اپنے شہروں اور گھروں میں دُکھ اور تکلیف میں مُبتلا کر دیتے تھے! آج اُن لوگوں اور گولیوں کی بوُچھار تو نہیں ہوتی آج اُن ہوا بازوں کی اُڑان تو شائید خوفناک نہیں رہی آج سرکاری اعلان کے مُطابق صلحنامہ پر دستخط ہوئے اور صُلح ہوئے بھی مُدت گذر چکی ہے لیکن کیا دُنیا امن میں ہے کیا خود یورپ دُنیا پر حکومت کرنیوالا یورپ اطمینان سے زندگی بسر کر رہا ہے ؟ ہمارے ایشیائی اطمینان کا معیار نہ سہی اُنہیں مغربی خردمندوں کی مشغول و منہمک زندگی کے سکون کا معیار لے لیجئے۔ کیا وہ آرام و امان کی زندگی گذار رہے ہیں ؟ افسوس کہ وہ خود دن رات میں گھنٹوں اسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں کہ صُلح کو ہوئے عرصہ ہو چکا لیکن ”صُلح کی فضا“ پیدا نہیں ہوتی۔ اتحادیوں نے صُلحنامہ ورسائی پر جرمنوں کے دستخط کرا لئے، حضرت لائڈ جارج نے متمدن دُنیا کو بتا دیا اور غیر متمدن قوموں کو سمجھا دیا کہ دُنیا میں ایک نئے دَور کا آغاز ہونے والا ہے بلکہ ہو گیا ہے ہونا لازم ہے اب لڑائی پھر نہ ہو گی جنگ کا دیوتا ہلاک ہو چکا اب اتحادی امنِ عالم کے ذمہ دار ہیں کون ہے جو پھر برسرِ پرخاش ہو کہ انجمنِ اقوام منضبط ہو گی اور ساری دُنیا عدل گستری اور باہمی محبت و معاونت سے معمور ہو جائیگی + کہنے اور یقین دلانے اور یقین کر لینے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے لیکن جب معاملہ ہی باطل ہو تو اس منتر سے کچھ نہ بنتا ہے نہ بن سکتا ہے اور اگر بن بھی جائے تو اُس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا بلکہ جلد ہی اس قصرِ اہل کا دھڑام سے گر پڑنا اُس رعب داب کی رہی سہی قوت کو کھو دیتا ہے جس نے برسوں دُنیا والوں کو دھوکے میں رکھا +

ہم یہ نہیں کہتے کہ جرمنی حق پر تھا اور اتحادی باطل کے پیرو تھے۔ اگر جرمنی کی فتح ہوتی تو غالباً دُنیا کو خسارہ ہوتا اور تہذیب کو تھوڑی مدت تک شائید مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اغلب یہی ہے کہ

جمہوریت کو نقصان پہنچتا اور حال کی نسبت زیادہ نقصان پہنچتا +

لیکن سوال یہ ہے کہ جن "اصولوں" جن چودہ یا سترہ یا اٹھارہ "نقطوں" کے لئے لڑائی لڑی گئی وہ کہاں غائب ہوگئے؟ اتحادی تقریروں میں برطانوی فصاحت میں امریکی بلاغت میں فرانساوی شجاعت میں انکا ایسا خاتمہ ہُوا کہ پھر اُن کا نام لینا بھی تنظیم یورپ کے قانون کی خلاف ورزی ٹھیری +

حقیقت یہ ہے کہ مقصود سب قوموں کا بازی جیت لینا ہوا کرتا ہے۔ سب قمار خانے کے شیدائی ہیں کوئی زیادہ کوئی کم۔ کوئی ہماری طرح سب کچھ تقریباً سب کچھ ہار بیٹھے ہیں کوئی اینٹھے ہوئے کھڑے ہیں اور اُن کی جیبیں حریفوں کے مال متاع سے بھری پڑی ہیں۔ ہارنے والوں کا کام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اپنی قسمت کا رونا رو ئیں یا اگر نہ روئیں تو جیتنے والوں کے ساتھ اُن کی واہ واہ میں شامل ہوں بازی لے جانے والے اُس بُت کا نام جپتے ہیں جو قمار خانے کی رُوح رواں ہے "قوّت" کا نام لیتے ہیں "قوّت" کا کام کرتے ہیں اور اُسی کے نشے میں چُور خودی و نخوت میں مخمور رہتے ہیں +

چند ماہ ہوئے پیرس کے ایک اخبار لاپاردل لیبر "گفتارِ آزاد" نے اعلان کیا کہ وہ فرانسیسی زبان کی بدترین کتاب کے لئے انعام دیگا چند اشخاص مقرر کئے گئے جنہوں نے نہ معلوم کس خیال سے فیصلہ کیا کہ یہ انعام صلحنامہ ورسائی کو ملنا چاہیئے۔ اس مسوّدے یا کتاب کے اتنے مصنف ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل ہوگا کہ انعام کس کے حصّے میں آئے؟

انگلستان والے بھی دیکھ رہے ہیں کہ فرانس مجروح مغرور ہُوا جاتا ہے۔ وہ جو افتادہ جرمنی کے گلے پر سوار ہے اور شمشیر بکف صدیوں کا بدلہ مہینوں میں نکالنا چاہتا ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ بُری سے بُری قسم کا بدلہ جلد بھی نہیں لے لینا چاہتا۔ رہ رہ کر رُک رُک کر ہنس ہنس کر غنیم کو ستانا اور رُلانا چاہتا ہے + فرانس کہتا ہے پیرو مشفق درست! جسے دُکھ ہو وہی جانتا ہے۔ پچاس سال سے میرے بچّے ان سفّاکوں کو چپکے چپکے دیکھ کر بلکتے رہے ہیں ہچکیاں لیتے رہے ہیں اور جبکہ قہر آسمانی نے اُن کو آلیا ہے اور انصاف نے ہمارے سروں پر سایہ کر دیا ہے آپ کی ہمدردی انسانی جوش میں آتی ہے اور دُنیا بھر کو آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے +

یہ ہے انتقام کا نتیجہ! یہ ہے عناد کا کارنامہ جو ایک کے سینے میں اُٹھ کر دوسرے کی چھاتی پر تلوار کی صورت میں جا دھمکتا ہے اور اس طرح وہ "پُرصلح" جنگ شروع ہوتی ہے جس کا انجام انسانیت

کا اپنے تئیں ہلاک کرنا ہے +

اس طریقے سے قدرت اپنے قوانین کے ذریعے فطرت کو کرب و عنا کی سختیوں میں سے ہوکر علم و کمال کی چوٹیوں پر پہنچنا سکھاتی ہے۔ دُکھ پہنچتا ہے کہ سکھ پہنچے تکلیف آتی ہے کہ آرام ملے جہالت کی حکومت کی رات پڑھاتی ہے کہ دل آزاری کی تاریکی میں خلقِ خدا طمانیت کی روشنی کے لئے گڑگڑائے اور خالقِ کائنات کے آگے سربسجود ہو! لیکن صبح جلد آئے یا نہ آئے یہ ہمارے اختیار میں ہے ہمارے خیال و اعمال ہمارے رنج و راحت کے کفیل ہیں ہم آپ ہی اپنے بہی خواہ ہیں یا بدخواہ ہیں جیسا کرینگے ویسا بھرینگے +

فرانس کا شاہنشاہ لوئی چاردہم اپنی نخوت کے زور میں جرمنی پر جا پڑتا ہے اور اُس کے دو علاقے اپنی مملکت میں شامل کر لیتا ہے۔ جرمنی متحدہ ملک نہیں نہ ایک قوم اُس میں آباد ہے وہ خاموش ہے اگرچہ محسوس کرنے والے بھی وہاں موجود ہیں۔ ملحقہ علاقے پونے دو صدیاں فرانس کے گھر میں رہ کر فرانسیسی بن جاتے ہیں۔ اب جرمنی والے زوروں میں آتے ہیں وہاں قومیت کی رُوح بیدار ہو چکی ہے شجاعت رہ رہ کر خیال انتقام کو اکساتی ہے کہ چل اپنا مال لے لے۔ جرمن فرانس میں گھس آتے ہیں اور چند ماہ میں نپولین صغیر اور فرانس دونوں صلح کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ "فرنت زدہ" علاقے پھر جرمنی میں شامل کر لئے جاتے ہیں اور فرانس کا دل دھڑکتا ہے اور بدن غصے سے کانپتا ہے + جرمنی فرانس کو پھر کمزور سمجھ کر اُس پر حملہ کرتا ہے لیکن فرانس کی قسمت اُسکی معاون بنتی ہے انتقام جو سینے میں موجزن رہا ہے۔ بھڑکاتا ہے قومیں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں اور بڑے گھمسان کی لڑائی ہوتی ہے۔ علاقے پھر واپس لے لئے جاتے ہیں اور جرمنی مجبور و مقہور ہو کر ہتھیار ڈال دیتا ہے!

کیا یہ علاقے اب فرانس کے پاس ہی رہینگے؟ جرمنی تو کمزور ہو چکا ہے اب کون چھین سکتا ہے؟ لیکن ستم ظریفی اس میں ہے کہ فرانس اپنے ڈر میں جرمنی پر پھر حملہ کرتا ہے اور اُسکے چند "اصلی" جرمن علاقوں پر قابض ہو جاتا ہے اور جی میں کہتا ہے کہ ان کو مار کوں پھر اگر واپس بھی دینے پڑے تو یہی دیدیئے جائینگے وہ پہلے دونوں میرے پاس ہی رہیں گے۔ پھر خیال آتا ہے کہ جرمنی تو کمزور ہو چکا انہیں بھی کوئی نہیں لے سکتا

اے فرانس! اے ژان دارک کے وطن! اے وہ کہ جس نے اپنے انقلابِ عظیم کے واسطہ سے اک دُنیا کو آزاد خیال بنا دیا جرمنی کمزور ہو چکی ہے لیکن خدائے قدیر تو بے طاقت نہیں ہو گیا۔ اپنے حقوق کی نگہداشت کر لیکن ایک حد سے تجاوز نہ کر!

**تحریک کا محرّک** - ڈاکٹر اینی بسنت اپنے ایک مضمون میں اس عنوان کے نیچے لکھتی ہیں کہ تحریکات کا محرّک کون ہوتا ہے؟ لیڈر یا اُسکے پیرو؟ اور اس سوال کے جواب میں لکھتی ہیں کہ دونوں! تاریخ کا فیصلہ یہی ہے دونو! لوگوں کا ایک بے قاعدہ گروہ بگاڑ سکتا ہے بنا نہیں سکتا۔ علم اور باقاعدگی عام لوگوں کے جمگھٹے کو حفاظت عامہ اور تعمیر قومی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں شخصیت خواہ کتنی رُعب انگیز کیوں نہ ہو جبتک اپنے گرد تعداد کو جمع نہ کر سکے نکمّی رہتی ہے۔ کرامول اور نپولین محض اسی لئے فتح کر سکے اسی لئے دُنیا کو اپنا لوہا منوا سکے کہ انہوں نے اپنے قول و عمل سے اپنے پیروؤں میں ایک شاندار عقیدتمندی اور اعتقاد قائم کر دیا تھا جنکی بدولت اُنکے سپاہی اُنکے کہے پر مرنے مارنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے + علاوہ بریں پیروی کرنیوالوں میں عالی خیالات کا ہونا ضروری ہے تب ہی تحریک قوی اور زندہ رہ سکتی ہے + کرامول کے "آہنی سپاہی" وہ لوگ تھے جو بقول کرامول "اپنی گردار میں اپنا ضمیر" روشن رکھتے تھے۔ اُن میں فرض کا احساس انتہائی درجہ تک پہنچ چکا تھا خواہ اُس فرض کو اُنہوں نے ٹھیک طرح سمجھا یا غلط طرح۔ اس سے اور محض اسی سے ارادے کو وہ استقلال اور عمل کو وہ راستی حاصل ہوتی ہے جو مشکلات اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں دل میں ہونا ضروری ہے + اسی طرح نپولین کے جنگجو آزادی کے لئے اپنے جی میں اک بے پناہ جوش رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ پُرانی بیڑیوں کو اپنی شمشیر سے کاٹ دُنیا اُنکی زندگی کا انتہائی مقصد ہے + بغیر اصول و مقاصد کے کوئی تحریک حقیقی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی اور پیغمبر وقت کو وہ اصول وضع کرنے چاہئیں جو لیڈروں اور لوگوں دونوں کے دلوں کو گرما دیں اور اُنکو زندگی کی شاہراہ پر لگا کر راستبازی اور عالی خیالی کی طرف لے چلیں +

**تعلیمیافتہ کون ہے؟** ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کا جواب کیا مشکل ہے؟ تعلیم امتحان پاس کرنا ہے اور تعلیمیافتہ وہ حیوان ہے جو امتحان پاس کرے پھر جسے نوکری ملجائے اور وہ بھی سرکاری نوکری تو وہ تعلیم چھوڑ تمدن پر حاوی ہو گیا + لیکن جن لوگوں سے ہم نے علم سیکھا ہے یا سیکھ رہے ہیں اُنکے اپنے گھر میں خیال اور ہے + ایک امریکی عالم نے حال میں لندن میں معلموں کے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پُرانے زمانے میں تعلیم کا معیار یہ تھا کہ اسکے حاصل کرنیوالا زیادہ سے زیادہ معلومات جان لے لیکن اب تعلیم یہ ہے (۱) اپنی مادری زبان میں درستی اور کمال (۲) مہذب و لطیف آدابِ مجلس کہ انہیں سے اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے (۳) حُسن کو جانچنے کے صحیح معیار اور اصلیت و فطرت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا (۴) غور و فکر کی قوت حاصل کرنا اور ان کی عادت ڈالنا + (۵) قابلیت یا کام کرنیکی طاقت اس معنی میں کہ کرنے والے میں باقاعدہ قوتِ ارادی پیدا ہو +

ہمیں یہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ پہلے لوگوں کی طرح خیال کریں اور کہیں کہ یہ تو ہمکو پتہ نہیں کہ ہم جا کہاں رہے

ہیں لیکن آؤ چلے چلیں" +

**ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ** - جاپان میگزین میں ٹوکیو کے شاہی دارالعلوم کے ایک پروفیسر ڈاکٹر کیٹو لکھتے ہیں کہ مختلف مذاہب دو طرح کے اصول کے ماننے والے ہیں بعض مثلاً بدھ مت یہ کہتے ہیں کہ انسان جب کافی ترقی پا جائے تو خدا بن جاتا ہے روحانی کمال اُسے ذاتِ ربانی میں ملا دیتا ہے۔ خدا بعض بعض وقت انسان کی شکل میں زمین پر نمودار ہوتا ہے تاکہ نوعِ انسان کو ذلت و خواری سے بچا کر راستی کی راہ پر چلے۔ اس طرح بدھ آیا۔ جو پیدا تو ہُوا ایک معمولی آدمی ہو کر لیکن جب وہ تکمیل کو پہنچ گیا تو وہ بدھ یعنی روشن ضمیر بن گیا اور اُس نے علم مذہب کی روشنی میں ربانیت کو حاصل کر لیا + اسی طرح قدیم رومیوں اور یونانیوں کے مذہب تھے چنانچہ یونانی اپنے قومی رہنماؤں کی پرستش کرتے تھے مثلاً اسکندر اعظم۔ رومیوں نے سیزر اور آگسٹس کو پوجا + پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ بعض مذہب مثلاً یہودیت اور اسلام انکے برعکس ہیں انکے مطابق انسان کبھی خدا نہیں بن سکتا۔ محمدؐ نے کہا کہ میں خدا کا بندہ اور ایلچی ہوں میں اُسکی مرضی سے خلقت کو آگاہ کرنے آیا ہوں اور بس۔ موسیٰ خدا کے جلوے کی تاب نہ لا سکا اور خدا کو دُور ہی دُور سے پوجنے لگا +

کیا خدا کے جلوے کی تاب بدھ لا سکا؟ کیا دیگر مذاہب کے انسانی خدا حقیقت میں انسانی کمزوریوں سے بالکل پاک ہو گئے تھے؟ اور کیا اسلام میں انسان کے خدا تک پہنچ جانیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ذاتِ ربانی کا جزو بن جاتا ہے؟ كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ والی آیت کے معنی ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ انسان خدا سے انکار کیسے کر سکتا ہے حالانکہ اُسکی ترقی خود اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ کائنات میں بحبس اشیاء کے مرتبے سے چل کر خدا تک پہنچ جاتا ہے جب وہ خود خدا تک پہنچ جائے ذاتِ الٰہی میں جذب ہو جائے پھر اُسکی بظاہر جُدا گانہ ہستی بھی کیونکر قائم رہی۔ ہستی بظاہر نیستی ہو کر حقیقت میں حاملی اور حقیقت بنگئی۔ اس پر یہ خود خدا میں مل جانے والا خدا کی ہستی سے کیونکر انکار کر سکتا ہے! اپنے سے منکر ہو جائے؟ کہے میں نہیں ہوں؟ اپنے آپکو سمجھنا خدا کو سمجھنا اپنے دل کو ماننا خدا کو ماننا ہے۔ سب لوگ عام اس سے کہ وہ پیغمبر ہوں یا نہ ہوں خدا کی طرف چلتے ہیں خدا کے نزدیک ہوتے جاتے ہیں خدا کبھی نہیں ہوتے انفرادی طور پر خدا نہیں ہو سکتے + انسان کس طرح خدا میں جذب ہو سکتا ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے یا ہر اُس انسان کا دل جس میں خدا کی بے لاگ محبت اور جس پر خدا کی بے پایاں عنایت ہو!!!

د ب

# علم اور زمانہ

صدیاں کی صدیاں گذر گئیں، دُنیا میں تمدن آئے اور چلے گئے، قومیں بنیں اور بگڑیں زمانہ جو ہماری دُنیا پر بھی اپنا تسلط رکھتا ہے اپنا مستقل اور نچلا قدم بڑھائے چلا گیا، ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں کو جائیگا۔ ہم نے جہاں سے یہ آیا اُس مُلک کے دو حصّے کر دیئے ایک وہ جسے ہم محض خواب میں سوچ سکتے ہیں زمانۂ قبلِ تاریخ! اور دوسرا وہ جسے ہم صرف خیال میں دیکھ سکتے ہیں زمانہ تاریخی! اس دُوسرے مُلک میں ہمارا خیالِ ترقی ہماری آرزوئے کمال علم کی صورت میں زمانہ کے ساتھ ساتھ رہی ہے اور جہاں جہاں اُس نے حقیقت کے پھُول دیکھے ہیں اپنا دامن اُنکی حسین اداؤں سے بھر لیا ہے یہاں تک کہ آج اِس گلچینی کی طفیل ہماری زندگیاں "پھُول بھری" ہو چکی ہیں!

کون گمان کرتا ہے کہ انسانیت بامِ ترقی پر چڑھ چڑھ کر گری ہے اور جہاں پہلے تھی وہیں ہے کون اِس احسان فراموشی کا اظہار کر سکتا ہے؟ جو کرے لازم ہے کہ نوعِ انسان اُسکی اور اپنی بدقسمتی پر آٹھ آٹھ آنسو روئے!

یہ پھُول جو ہم نے علمیت کے ہاتھوں پائے ہیں کیا اِنہیں کے بیجوں سے ہر انسان نے اپنا اپنا اک جُدا باغ نہیں بنا لیا پھر کیا نوعِ انسان نے ایسے چمنستان قائم نہیں کر دئے جن میں ایک لمحے کی گلگشت بھی ہزاروں خوشیاں اپنے اندر مستور رکھتی ہے؟؟

یہ پھُول کیا ہیں؟ نیکوں کی نیکیاں، عالموں کی علمیتیں، عاقلوں کی عقلیں، حسینوں کا حُسن! اِنہیں پھُولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں غرور جہالت غلطی نفسانیت! نیکبخت ہیں وہ جنہیں ربّ ذو الجلال نے سمجھنے اور غور کرنیکی توفیق دی بدقسمت وہ جن کے نفس اُنہیں لیکر کہیں بھٹک گئے!

کتنے حسین و رنگین وہ چمنستان ہیں جہاں ہر کہ و مہ کو آنے جانے کی اجازت ہے جہاں انسانیت کی قسمت مسرّتِ حقیقی کی آبجو کے کنارے اپنی زندگی سے مطمئن ہے!

یہاں کے کون کون سے درختوں کے سائے میں بیٹھیں کون کون سے پھُولوں کو سونگھیں؟؟ ابراہیم عیسیٰ محمد بُدھ زرتشت کس کس کے قدموں کو چومیں کس کس کی گفتار و کردار پر اپنا مال اور اپنی جان قربان نہ کر دیں؟؟

بشیر احمد

# چینی تمدن کی قدامت

اور

# علم الحرب

کچھ عرصہ ہوا کہ انگلستان کے مشہور رسالہ نائنٹینتھ سینچری کے نامہ نگار رسینٹ لوی اسٹراسی نے چین کی ایک قدیم ترین کتاب کے کہ جو فن جنگ میں لکھی گئی تھی چند ابواب شائع کئے تھے جسکو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فن جنگ آج سے ہزاروں سال پیشتر چین میں کس قدر عروج و ترقی پر رہ چکا ہے۔ لہذا ہمارا یہ مضمون ان ہی ابواب پر ایک اجمالی تبصرہ ہے۔

چینیوں کی یہ کتاب علم حرب میں ہے جسکو سن ٹسو نامی ایک شخص نے شہنشاہ ہولو کے عہد سلطنت میں تصنیف کی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چارسو برس قبل گذرا ہے یعنی قبل اسکے کہ ارسطاطالیس نے اسکندر مقدونی کو فن جنگ کی تعلیم دی۔ اس کتاب کو چینیوں میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ کثرت سے شارحین نے اُسکی شرحیں لکھی ہیں اور مصنف کے متعلق عجیب و غریب قصے روایت کئے ہیں۔ لیکن یہ سب اُن اصول و قواعد کی بنا پر جن کے متعلق کتاب مذکور میں مصنف نے اشارات کئے ہیں اُسکی ثقاہت و صحت پر دلالت کرتے ہیں۔ شارحین میں سے ایک نے مصنف کے متعلق ایک قصہ کو اس طرح سے بیان کیا ہے:-

شہنشاہ ہولو نے ایک دن کتاب مذکور کے مصنف سے کہا کہ میں نے تیری کتاب کی تیرہ فصلوں کا مطالعہ کیا پھر کہا تو اپنی رائے کا لشکر کی مشق قواعد میں امتحان دے سکتا ہے؟ سن ٹو نے کہا کہ ہاں! پھر ہولو نے کہا کہ کیا یہ امتحان عورتوں میں بھی ممکن ہے؟ سن ٹو نے کہا کہ ہاں! تب اتفاق اس بات پر ہُوا کہ محل سے ۱۸۰ لونڈیاں نکالی جائیں اور پھر سن ٹسو اپنے جنگی قواعد کے طریقہ کی مشق کا امتحان اُن میں کرے۔ سو وہ اُسکے پاس لائی گئیں اور اُس نے اُنہیں دو فرقوں میں تقسیم کر دیا اور اُن میں سے دو کو بطور اُن دونوں فرقوں کے سردار (آفیسر) کے کھڑا کر دیا۔ پھر سن ٹسو نے اُن لونڈیوں میں سے ہر ایک کو

سلام کیا اور کہا کہ مجھے اُمید ہے کہ تم اپنے آگے، پیچھے، اور داہنے و بائیں جانب کے فرق کو تو جانتی ہونگی تب اُنہوں نے جواب دیا کہ ہاں! تب اُس نے اُن سے کہا کہ جب میں تم سے یہ کہوں کہ "آگے" تو تمکو لازم ہے کہ تم سب اپنے سامنے کی جانب متوجہ ہو جاؤ اور جب میں تم سے کہوں کہ "داہنے" تو تمکو لازم ہے کہ تم اپنے داہنے جانب پھر جاؤ، اور جب میں تم سے کہوں کہ "بائیں" تو تمکو لازم ہے کہ تم اپنے بائیں جانب پھر جاؤ۔ اور جب میں تم سے کہوں کہ "گھومو" تو تمکو چاہیئے کہ اپنے پیچھے کی جانب گھوم جاؤ۔ تب اُن سب نے کہا اچھا! تب اُس وقت طبل بجایا گیا اور پکارنے والے نے پکارا کہ "بائیں" لیکن وہ اپنے بائیں جانب نہ گھومیں بلکہ خوب ہنسنے لگیں اور کہنے لگیں کہ جب لشکر اپنے قائد کے احکام کو اس وجہ سے نہ سمجھے کہ وہ غیر واضح ہو یا اس وجہ سے کہ اُنہوں نے اُسکو نہ سنا ہو تو قابل ملامت وہ نہیں ہے بلکہ خود قائد۔ اور جب وہ ہنس چکیں تو ندا دینے والے نے اُنہیں پھر ندا دی کہ "داہنے" لیکن وہ اس پر بھی اپنے داہنے جانب نہیں گھومیں بلکہ ہنسی میں مشغول ہو گئیں اور کہنے لگیں کہ جب قائد کے احکام غیر واضح ہوں پوری طرح سمجھ میں نہ آئیں تب وہ خود ہی قابل ملامت ہے لیکن واضح ہوں اور سمجھ میں آئیں اور پھر لشکر اُن پر عامل نہ ہو تب البتہ ملامت اُسکے سرداروں پر ہو سکتی ہے۔ اس پر سن تسو نے حکم دیا کہ اُن دونوں فرقوں کی سرداروں کی گردن ماردی جائے ؛

یہ جو کچھ گذر رہا تھا پادشاہ اُسکو ایک بلند گنبددار محل میں سے دیکھ رہا تھا پس جب اُس نے جو کچھ کہ سن تسو نے حکم دیا اُسکو سُنا تو مضطرب ہو گیا اور اُسکو کہلا بھیجا کہ ہم تمہاری فوج کی تربیت و مشق قواعد سے خوش ہوئے لیکن ہم اس سے خوش نہیں ہیں کہ تم ان دونوں لونڈیوں کو قتل کرو اور نہ ہم تمکو اُن دونوں کے قتل کی اجازت دیتے ہیں۔ اس پر سن تسو نے جواب دیا کہ اعلیحضرت نے اس لشکر کی قیادت میرے سپرد کی ہے پس میں ہی اُس کا ذمہ دار ہوں اور میں جو کچھ کہ اس قیادت کے واجبات سے ہے اُسکے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس نے اُن دونوں لونڈیوں کا سر اُڑا دیا اور اُنکی بجائے دوسری لونڈیوں کو سردار بنا دیا اور اُنہیں "دائیں" "بائیں" وغیرہ کی جانب توجہ کرنیکا حکم دیا اور اُن سے پوری طرح مشق کرائی تب وہ بڑی مشکل سے اُسکے احکام کی اطاعت کی عادی ہوئیں اُس وقت اُس نے پادشاہ کی خدمت میں اطلاع بھیجی کہ لونڈیوں کی جنگی حرکات کی تربیت ہو گئی۔ اور اُسکو اُنکے مشاہدہ کے لئے دعوت دی۔ پس بادشاہ اُنکو دیکھ کر خوش ہوا اور سن تسو کو اپنے

تمام لشکر کا قائد بنادیا تب اُس نے اُس کی بھی تربیت کی اور پھر اُسکے ساتھ وہ سلطنت کے دشمنوں سے شمالاً و غرباً لڑا اور اُن پر فتح پائی۔

اِس قِصّہ کے لکھنے کے بعد اب ہم اصل کتاب کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ناظرین کو اُسکے ایسے جستہ جستہ فقرات و جملوں سے روشناس کراتے ہیں کہ جو کتاب مذکور کی اہمیت و حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کتاب کا وہ ابتدائی جملہ کہ جسکو لارڈ رابرٹس مشہور برطانی فیلڈ مارشل نے منتخب کیا ہے :-

"در حقیقت فن جنگ ہمیں سکھلاتا ہے کہ ہم اپنی اس ترجیح پر اعتماد نہ کریں کہ دشمن ہم پر حملہ نہیں کریگا بلکہ اس پر کہ جب ہم حملہ کریں تو ہماری استعداد اُسکے مقابلہ کے لئے کس قدر ہے یعنی ہم اس پر بھروسہ نہ کریں کہ وہ ہم پر حملہ نہیں کریگا بلکہ اس پر کہ ہم ایسے پوزیشن میں ہوں کہ اُس میں ہم پر حملہ کیا جانا محال ہو"

مسٹر سینٹ لوی اسٹراسی اس جملہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے ذہنوں کو اس کے متعلق اخبار اسپکٹیٹر نے ۱۹۱۰ء میں آگاہ کیا اور اسکی خواہش کی کہ اس کو جلی حرفوں میں لکھ کر وزارت عالیہ، وزارت حربیہ، اور وزارت بحریہ کے دفاتر میں آویزاں کیا جائے لیکن کوئی اُسکی اس تجویز کی طرف متوجہ نہ ہوا اِلّا جرمنی کے کہ اُس نے صرف آویزاں ہی نہیں کیا بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔

دراصل دنیا میں ضیانت حیات کے لئے جنگ و مجادلہ ایک ضروری شئے ہے، افراد و جماعات اقوام و ممالک، حکومتیں و سلطنتیں جب تک کہ اپنی زندگیوں کو دشمنوں سے محفوظ و مصئون نہ کرلیں ظاہر ہے کہ ترقی و عروج کی کسی راہ میں بھی گام زن نہیں ہوسکتیں اس لئے اُنکی بقا و حیات کا بڑا انحصار ایک لحاظ سے جنگ پر بھی ہے اسی کو ڈارون نے تنازع للبقاء سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جنگ کے بھی قواعد و اصول ہیں اور ان قواعد و اصول کی بنا پر وہ ایک مستقل فن کی حیثیت رکھتی ہے جس کا جاننا ہر قوم و سلطنت کے لئے اپنے بقاء کی غرض سے ضروری ہے چنانچہ سن تسو اس کے متعلق لکھتا ہے کہ :-

"فن جنگ سلطنت کے لئے نہایت ضروری ہے اس لئے کہ اُسکی موت و حیات کا دار و مدار اسی پر ہے پس یہی اُسکی نجات و ہلاکت کی راہِ واحد ہے اسلئے کسی سلطنت کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اسکی جانب سے غافل رہے"

میدان جنگ میں اس امر کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ فوج کے وہ افسر جو کہ فوج کے ساتھ رہ کر فوج کو دشمن کے مقابلہ میں نقل وحرکت دیتے ہیں اور جو اپنے اعلیٰ ومقامی افسروں کی بہ نسبت میدان کے حالات وکیفیات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اپنے ان اعلیٰ ومقامی افسروں کے احکام کی تعمیل پورے غور وخوض کے بعد میدانی حالات وکیفیات کا لحاظ کرتے ہوئے کریں اور کورانہ تعمیل احکام کرکے موت کے گھاٹ نہ اتریں چنانچہ سن ٹسو انکو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ:-

"تم میری ہدایتوں پر اعتماد تو کرو لیکن وقائع حال کی بھی رعایت کرو اور اپنے اقدامات کو اُن کے مطابق درست کیا کرو"

کسی فن کے مکمل ہونے کے معنے یہ ہیں کہ اُسکے قواعد وضوابط کے اندر ہر قسم کے نشیب وفراز کا احاطہ کیا گیا ہو اور ہر قسم کے نقائص وناکامیابیوں کے سد باب کی اُس میں کوشش کی گئی ہو۔ حتی الامکان ہر قسم کی متوقع وغیر متوقع برائیوں کا علاج وتدارک اُنکے اندر ملحوظ رکھا گیا ہو۔ سن ٹسو کی اس کتاب کے اندر جو قواعد وضوابط فن جنگ کے درج ہیں اُن میں ان باتوں کا لحاظ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں چینیوں کے اندر یہ فن کس قدر مکمل صورت میں رائج تھا اور یہی اُنکے تمدن وترقی کے کمال کی ایک بین دلیل ہے۔ اُن قواعد وضوابط میں سے بعض یہ ہیں:-

"جنگ دھوکہ وفریب کا نام ہے، اس لئے اگر تو حملہ کرنے پر قادر ہے تو ظاہر یہ کر کہ گویا کہ تو قادر نہیں ہے اور اگر تو اپنے دشمن سے قریب ہے تو اُسکو یہ یقین دلانے کی کوشش کر کہ تو اُس سے بعید ہے، اور اگر تو بعید ہے تو اُسکو یہ یقین دلا کہ تو قریب ہے"

"اگر تیرے دشمن کا مزاج صفراوی ہے تو کوشش کر کہ تو اُسکو غصہ دلادے اور اُس کے اندر صفرا کو حرکت دیدے"

"چاہیئے کہ حملہ دفاع کی بنیاد ہو اور دفاع حملے کی تمہید"

"حملہ کرنے میں ماہر اپنے دشمن پر اس طرح گرجتا ہے جس طرح کہ بجلی آسمان سے گرجتی ہے"

"تیرا یہ یقین کہ تو مقہور نہیں ہوگا اس امر کا مستلزم ہے کہ تونے دفاع کی پوری احتیاط کرلی ہوگی اور تیرے دشمن کے قہر پر تیری مقدرت تیرے حملہ کرنے کی قدرت کی مستلزم ہے"

"ہم کسی مکان کے حالات معلوم نہیں کرسکتے جب تک کہ اُسکے رہنے والوں کی نشانیوں کو

کام میں نہ لائیں"

"چاہیئے کہ تیری چستی پرندوں کی چستی کی طرح ہو اور تیرے آدمیوں کا اختلاط و انضمام جھاڑیوں کے درختوں کے اختلاط و انضمام کی طرح ہو"

"چاہیئے کہ تیری چالیں رات کی طرح مخفی ہوں اور تیرا حملہ بجلی کی طرح سریع ہو"

"جونہی تو دریا کو عبور کرلے تو اُس سے فوراً دور ہو جا"

"جب پرندے کسی مکان میں اکٹھے ہوتے ہوں تو سمجھ لے کہ وہ خالی ہے"

"اگر تو نے دشمن کو مہلت دیدی اور اُسکو غنیمت نہیں جانا تو اُسکا لشکر قوت میں سبقت لیجائیگا"

"جب فوجی افسر غصہ ہو جائیں تو فوج کے لئے مصیبت ہے"

"اگر تو اپنے لشکر کو اُس کی محبت کے اسکے کام کے قبل سزا دیگا تو تو اُن سے واجبی اطاعت حاصل نہیں کرسکیگا۔ اور جب وہ تیری اطاعت نہیں کرینگے تو تجھے اُن سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور جب وہ تجھ سے محبت کرنے لگیں اور پھر تو انکو سزا دینے سے باز رہے تو بھی تجھے اُن سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اسلئے یہ ضروری ہے کہ لشکر کے ساتھ ابتداء میں نسبت کے ساتھ برتاؤ کیا جائے لیکن اُنکی غلطیوں اور لغزشوں پر اُنکی سزا کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے"

"اپنے لشکر کے ساتھ ایسا برتاؤ کر جیسا کہ تو اپنی اولاد کے ساتھ کرتا ہے تو پھر وہ عمیق ترین وادیوں میں بھی تیرا ساتھ دیگا"

"تو فوج کی طرف اس طرح سے دیکھ جیسے کہ تو اپنے عزیز ترین بیٹوں کی طرف دیکھتا ہے۔ تو پھر وہ اپنی روحوں کو تجھ پر فدا کر دیگی"

"وہ قائد و زعیم کہ جو بلا کسی شہرت کی طلب کے پیشقدمی کرتا ہے اور بلا کسی عار کے خوف کے تاخیر کرتا ہے، اور اُسے کسی قسم کی فکر نہیں رہتی مگر اپنے وطن کی حمایت کی اور اپنے ملک کے اُن واجبات کے قیام کی جوکہ اُس کے ذمہ عائد ہوتے ہیں حقیقت میں اپنے ملک کے تاج کا ایک قیمتی ہیرا ہے"

جنگ میں کامیابی زیادہ تر جنگی چالوں یعنی فوج کی دشمن کے مقابلہ میں دانشمندانہ نقل و حرکت پر موقوف ہے اور اس نقل و حرکت کا دارومدار دشمن کے حالات و کیفیات کے علم پر ہے لیکن حالت جنگ میں اس علم کے کسب و حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ "جاسوسی" کا ہے۔ اس لئے جنگ

کی کامیابی کا بڑا انحصار صحیح جاسوسی پر بھی ہے بلکہ اب تو یہ جنگ کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے
اس لئے ضرور ہے کہ مدون و مکمل فن جنگ کے اندر اسکے قواعد و اصول بھی منضبط ہوں چنانچہ
سن تسو کی کتاب کے اندر اسکے قواعد و ضوابط کے متعلق ایک پوری فصل موجود ہے جسکا خلاصہ یہ ہے
"یہ علم (یعنی دشمن کے حالات و کیفیات کا) نہ تو وحی سے حاصل ہوتا، نہ استقرا سے، اور نہ"
"منطقی قیاسوں سے بلکہ بعض خاص شخصوں کے ذریعہ جنکو "جاسوس" کہتے ہیں اور انکی چار"
"قسمیں ہیں۔

(۱) مقامی جاسوس۔ (۳) ساختہ جاسوس۔
(۲) داخلی جاسوس۔ (۴) موت سے نجات پانے والے جاسوس

"مقامی جاسوس تو وہ ہیں کہ جن سے خدمت لینے کے لئے تو اُن ہی شہروں کے باشندوں
میں سے انتخاب کرے"
"جن میں کہ تو ہے۔ اور داخلی جاسوس دشمن کے آدمی ہیں اور ساختہ جاسوس دشمن کے وہ"
"جاسوس ہیں جنکو تو گرفتار کرے اور پھر انکو گراں بہا عطیات دیکر اُن سے خدمت لے"
"اور موت سے نجات پانے والے جاسوس وہ ہیں جو دشمن کے متعلق خبریں لیکر صحیح سلامت واپس"
"لوٹ آئیں"
"قائد کے لئے یہ لازمی ہے کہ جاسوسوں سے کامل میل رکھے اور انکو بہتر سے بہتر صلہ دے اور"
"انکے راز کو محفوظ رکھے اور انکے امور کو پوری طرح سے چھپالے"
"قائد جاسوسوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جبتک کہ ذہین نہ ہو اور صحیح فراست نہ رکھتا ہو"
"تاکہ اُن کی سچی و جھوٹی خبروں کے درمیان تمیز کر سکے اور جاسوسوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا"
"جب تک کہ انکے ساتھ کشادہ دلی اور لطف و کرم کے ساتھ برتاؤ نہ کیا جائے"
"اگر کوئی جاسوس کسی راز کو اسکے معینہ وقت سے پہلے فاش کردے تو اسکو اور جس سے راز"
فاش کیا ہے اسکو قتل کر دینا چاہیئے"
"اگر تیری غرض دشمن کو مقہور کرنے، یا کسی شہر کو برباد کرنے یا کسی شخص کو ہلاک کرنیکی ہے پس"
"واجب ہے کہ تو سب سے پہلے اپنے دشمن کے تبعین، نگہبان، اور دربانوں سے شناسائی

پیدا کرے"

"اور یہ جاسوسوں کے ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے"

"جب دشمن کی جانب سے تیرے نزدیک جاسوس آویں تو اُنکو رشوت دے اور فریب دے اور اُنکی"
"مہمانی اچھی طرح کر، اس سے تو اُنکو اپنا بنا لیگا اور وہ تیری خدمت کرینگے اور اُن کے" "ذریعہ سے تو مُقامی جاسوسوں" سے بھی خدمت لے سکیگا اور اُن ہی کے ذریعہ سے تو جھوٹی" "خبریں دشمن کی جانب بھی بھیج سکیگا"

"جاسوسیت سے مقصود خواہ وہ کسی قسم کی ہو دشمن کے حالات و کیفیات سے واقفیت حاصل"
"کرنا ہے اور سُاختہ جاسوس" لوگوں میں تجھے اس امر سے واقف کرنے میں سب سے زیادہ قدرت"
"رکھتا ہے۔ سب سے زیادہ ماہر حکام اور سب سے زیادہ ماہر قائدین جاسوسی کے کام کے لئے لشکر"
"میں سے سب سے زیادہ ذکی شخص کا انتخاب کیا کرتے ہیں اور اس لئے اسکا نتیجہ بھی اُنہیں اچھا ملتا ہے"
"جاسوس جنگ کے عناصر ہیں اس لئے کہ جنگ پر قدرت رکھنا اُنہیں کے اوپر موقوف ہے"

فن جنگ کے ان تمام اُصول و قواعد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن چینیوں میں کس قدر کمال عروج پر پہنچ چکا ہے جو چینیوں کے تمدن و تہذیب کے کمال کا پوری طرح ضامن ہے لیکن تعجب ہے کہ اس فن کے باوجود اسقدر مکمل صورت میں موجود ہونیکے توسیع مملکت میں چینیوں کو اس سے کوئی بھی فائدہ نہ پہنچ سکا الا یہ کہ اُنکی سلطنت کا جو رقبہ قدیم سے چلا آتا تھا وہ کم و بیش محفوظ رہا حالانکہ اس ترقی و کمال کا مقتضا تو یہ تھا کہ وہ آج دنیا کی متمدن و ترقی یافتہ و وسیع سلطنتوں کی اولین صف میں نظر آتی۔ نیز ان ہی قواعد و اصول پر عمل کر کے جو ترقی کہ امریکہ نے دس سال میں کی اُسکا عشر عشیر بھی وہ دو ہزار سال میں نہیں کر سکے۔ گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ اُنہیں ان سے سلبی فائدہ تو حاصل ہوا لیکن ایجابی نہیں ہوا یعنی یہ تو ہوا کہ اغیار کا قبضہ چین پر نہ ہو سکا لیکن خود نہ تو اُسکی عمرانی حالت میں ان سے کوئی ترقی ہو سکی اور نہ اُسکی سطوت میں اور نہ ہی وہ جاپانیوں کے غلبہ و سبقت سے محفوظ رہ سکا باوجودیکہ چینی آبادی جاپانی سے چھ گُنا زیادہ ہے اور اُسکا تمدن و عمران جاپانیوں کے تمدن و عمران سے زیادہ قدیم و راسخ ہے۔

ابو النصر سید احمد بھوپالی

# تربیتِ اطفال

اعادہ و تکرار اگرچہ ہر چیز کو نہایت عام نہایت متداول اور نہایت مؤثر بنا دیتا ہے تاہم یہ عمومیت اُسکو نہایت حقیر، مبتذل اور عامیانہ بنا دیتی ہے، فن تعلیم و تربیت کا اس زمانہ میں اس قدر بار بار تذکرہ کیا جاتا ہے کہ وہ ہماری تعلیمی انجمنوں کا ایک دلچسپ فسانہ بن گیا ہے، لیکن اس نے جس قدر اس فن کو عام اور متداول بنایا ہے، اُسی قدر اُس کی فلسفیانہ اہمیت کو صدمہ پہنچایا ہے اب ہر باپ، ہر ماں، اور ہر استاد کا دعوےٰ ہے کہ وہ طلباء کو بہترین تعلیم و تربیت دیتا ہے، لیکن اگر سوال کیا جائے کہ اس فن کی تاریخ کیا ہے؟ اسکی ابتدا کیونکر ہوئی؟ وہ کیونکر پیدا ہُوا؟ اور کیونکر بڑھا؟ تعلیم اور تربیت کے کیا کیا مختلف اصول قائم ہُوئے؟ اس فن پر کون کون سی کتابیں لکھی گئیں؟ اور کس نے لکھیں؟ تو خاموشی کے سوا کُچھ جواب نہ ہوگا، اس بناء پر ہم چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس فن اجمالی تاریخ ناظرین کے پیش نظر کر دیں۔

**اجمالی تاریخ**

قدیم زمانہ میں یونان تمام علوم حکمیہ کا گہوارہ تھا، اس لئے یونان میں فلسفہ کی جن شاخوں نے ترقی کی اُن کے سلسلہ میں فن تربیت و تعلیم نے بھی نشوونما پائی، یونانیوں نے اس فن کے متعلق جو لطیف مباحث پیدا کئے ہونگے، وہ اگرچہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہونگے، لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے دامن میں اُس خرمن کا ایک خوشہ بھی نہیں آیا، مُسلمانوں نے اگرچہ ابتداءمیں نہایت فیاضی اور بے تعصبی سے یونانیوں کے علمی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کر لیا، لیکن اُنکو قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم نے یونان کے فلسفہ عملی کی تمام شاخوں سے بے نیاز کر دیا تھا، اس بناء پر اُنہوں نے فلسفہ کی اس شاخ کی طرف بہت کم توجہ کی جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن میں یونان کے عملی فلسفہ کی اشاعت عام طور پر نہ ہو سکی، فن تربیت و تعلیم بھی اس عملی فلسفہ کی ایک شاخ تھا اس لئے مُسلمانوں نے اُسکو بالکل نظر انداز کر دیا اور تربیت اطفال کے لئے قرآن مجید و احادیث صحیحہ کی اخلاقی تعلیم اور علمی نصائح کو کافی سمجھا،

قرون وسطیٰ (مڈل ایجز) میں اگرچہ فن تربیت و تعلیم کی طرف غیر معمولی توجہ کی گئی لیکن

اس زمانے میں اُس کی فلسفیانہ حیثیت نمایاں نہ ہوسکی، بلکہ جو کچھ ہُوا، اُسکا دائرہ اخلاق، عمل، اور مذہب تک محدود رہا، تمام قوم کا نظام تربیت پیشوایانِ مذہبی کے ہاتھ میں تھا، وہ تمام بچوں کو عقائد مذہبی، اور قدیم موروثی اخلاق کے مطابق تعلیم و تربیت دیتے تھے، اور اس تعلیم میں سب سے زیادہ اس مسئلہ پر زور دیا جاتا تھا کہ پیشوایان مذہبی کے جبر و اقتدار اور انکی روحانی سلطنت کے غیر محدود اختیارات کو بے چون وچرا تسلیم کرلیا جائے، قرون وسطیٰ میں تقلید، جمود، تعصب، اور جوش مذہبی کا جو طوفان اُٹھتا رہتا تھا وہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا، لیکن پندرھویں اور سولھویں صدی میں ایک عام انقلاب ہُوا، یہ وہ زمانہ ہے جس میں یورپ کی تمام ترقیوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور آج جو کچھ نظر آتا ہے اسکا سلسلہ انہی صدیوں کے آغاز سے ملا ہُوا ہے، یورپ کی تہذیب و تمدن کے اس جدید دَور میں جن علوم و فنون نے فلسفیانہ حیثیت سے ترقی کی اُن میں ایک فن تربیت و تعلیم بھی تھا، اس فن کی ابتداء اگرچہ اول اول اخلاقی اور علمی حیثیت سے ہُوئی، لیکن آخیر میں وہ پالٹیکس کا ایک نمایاں جزو بن گیا، چنانچہ امریکہ کے اکثر مُدبرین سیاست صرف اس بناء پر بچوں کی تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دیتے تھے کہ جن لوگوں میں بچوں پر حکومت کرنیکی صلاحیت نہیں ہوتی وہ تمام قوم پر اپنا اخلاقی اقتدار نہیں قائم رکھ سکتے، لیکن ان صدیوں کی ابتدا میں چونکہ قومیت و جمہوریت نے بہت کم ترقی کی تھی، اور ایشیا کی طرح یورپ میں بھی دو مختلف گروہ قائم تھے، اور اُنکے حقوق اور تعلیم و تربیت کے اصول بالکل مختلف تھے، اس لئے اُس زمانہ میں اس فن کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں اُنکا تعلق صرف اُمرا کے گروہ کے ساتھ تھا، غرباء اور عوام کی تعلیم و تربیت کی طرف کسی مُصنف نے توجہ نہیں کی،

جان جوک روسو پہلا شخص ہے جس نے اس روش کو بدلا، چنانچہ اُس فن تربیت پر ایک کتاب لکھی جس کا نام امیل تھا، اُس نے جو کچھ اس کتاب میں لکھا وہ کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ اُس کا تعلق عام تعلیم اور تربیت کے ساتھ تھا، اسکے بعد نیسالوزی نے انیسویں صدی میں اسکو نہایت ترقی دی، چنانچہ اُس نے اپنا موضوع بحث صرف "غریب بچوں کی تعلیم و تربیت" قرار دیا، اور اس پر بکثرت کتابیں لکھیں، نیسالوزی کے بعد یہ مذاق عام ہوگیا، اور اطبا و حکماء نے اس موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں،

تربیت کے مختلف اصول

اُس زمانے میں فن تعلیم و تربیت کے جو اصول قائم ہوئے وہ مُصنفین کے فلسفیانہ مذاق پر مبنی تھے، یعنی جس فلاسفر نے اپنا فلسفیانہ اصول قائم کیا تھا، اُسکے مطابق اُس نے اس فن کے بھی قواعد مقرر کئے تھے، ہلنفینبوس نے جو اصول قائم کیا تھا اُسکا خلاصہ یہ ہے کہ "ابتدا میں بچے کا دماغ بالکل آئینہ کی طرح صاف اور سادہ ہوتا ہے، اس لئے اُسکے سامنے جو صورت آتی ہے، اُس کا عکس اُس کے حس مشترک پر مرتسم ہوجاتا ہے، اور اگر یہ صورت اُس کے دماغ پر ایک مدت تک قائم رہی تو وہی اُس کی فطرت بن جاتی ہے، لیکن سب سے پہلے بچے کو اپنی ضروریات کا احساس ہوتا ہے، اور ان تمام ضروریات کی متکفل اُس کی ماں یا دایہ ہوتی ہے، اس لئے ابتدا میں بچے کی فطری تربیت کا تمامتر تعلق ماں یا دایۂ سے ہوتا ہے، اور وہی اُسکی مربی ہوتی ہے"

اس اصول تربیت کے رو سے بچے کو نیک خو، بد اخلاق، عقلمند، بیوقوف کچھ نہیں کہنا چاہیئے بلکہ اُس کو بالکل خاموشی کے ساتھ سادہ طور پر نشو و نما دینا چاہیئے، اس طرح پر جب اُس پر دو برس گذر جائینگے، تو وہ آزادانہ تربیت حاصل کرنیکا عادی ہوجائیگا، وہ خود بخود ہر چیز کو دیکھیگا، سُنے گا، اور اُس کو سمجھنے اور اُس سے نتائج منبط کرنے کی کوشش کریگا، اُس میں زندگی کی حرکت پائی جائیگی، اُس کی نگاہ تیز اور دور رس ہوجائیگی، اور وہ ایک ترقی پذیر انسان کی صورت میں دُنیا کے سامنے نمایاں ہوگا، لیکن اگر اُسکو بچپن ہی سے یقین دلادیا گیا کہ وہ نیک، بدسیرت، عقلمند، یا بیوقوف ہے، تو اُسکی مستقل زندگی کا خاتمہ ہوجائیگا، اور اُسکو جس چیز کا یقین دلایا گیا ہے، اُس سے آگے قدم نہ رکھ سکیگا،

بعض لوگوں نے بچوں کی تشبیہ موم سے دی تھی، جو ہر قسم کی شکل کو قبول کرتی ہے، اسی طرح بچہ ایک موم کا پتلا ہوتا ہے، اُسکو جس قسم کی تعلیم اور تربیت دی جائے، وہ اُسی قالب میں ڈھل جاتا ہے لیکن ہلنفینبوس کہتا ہے کہ یہ تشبیہ بالکل غلط ہے، بچے کی ابتدا ہی میں ایک مستقل فطرت بن جاتی ہے، جو ماں یا دایۂ کی ابتدائی تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لئے وہ صرف اُسی تعلیم و تربیت کے قالب میں ڈھل سکتا ہے جو اُس کی فطرت کے مطابق ہوتی ہے، وہ موم نہیں آئینہ ہوتا ہے، اور آئینہ میں دوسری صورت اُسی وقت مرتسم ہوسکتی ہے، جب ایک چیز کا عکس زائل ہوجائے،

اس لئے وہ ہر موم کی طرح ہر قالب میں ڈھلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، بلکہ صرف اُسی اصول پر ترقی کرسکتا ہے، جس کا وہ بچپن سے خوگر رہ چکا ہے، اسی بنا پر وہ کہتا ہے کہ بچپن میں لڑکوں کو کسی چیز کا یقین نہیں دلانا چاہیئے، ورنہ وہ اُس کی فطرت ہوجائیگی، بلکہ اُسکو سادہ لوح رکھنا چاہیئے، تاکہ وہ خود آزادانہ طور پر اپنے زندگی کے اصول قائم کرے،

ڈاکٹر گال اور لافاتر کے نزدیک تمام جذبات، اور تمام احساسات کا مرکز اصلی جسم اور نظام عصبی ہے، اس لئے بچے کی جسمانی حالت جس قدر ترقی پذیر اور نشوونما کے قابل ہوگی، اُسی قدر وہ انسان کامل ہوگا، لیکن اگر اُسکا نظام جسمانی ضعیف اور کمزور بنیاد پر قائم ہے تو اُس پر تعلیم اور تربیت کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا، اُنکے نزدیک بچہ موم کا ایک کھلونا ہوتا ہے، اُس کی اصلاح اور اُسکا افساد خود اُسکے مربی کے ہاتھ میں ہے وہ بذات خود کسی چیز کی صلاحیت نہیں رکھتا،

تطبیق وتوفیق | یہ دونوں اصول باہم متضاد اور ایک دوسرے کے حریف مقابل نہیں، اور دونوں میں مبالغہ، اغراق، اور غلو سے کام لیا گیا ہے، اس بنا پر ایک فرقہ نے ان دونوں سے الگ ہوکر ان میں ربط وارتباط پیدا کیا ہے، اور ایک معتدل روش قائم کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ گال و لافاتر کا یہ اصول کلیتہً غلط ہے کہ تعلیم وتربیت کا تمامتر دارمدار نظام جسمانی کی قوت اور ضعف پر ہے، بہت سے بچے فطرۃً نہایت کمزور پیدا ہوتے ہیں، لیکن تعلیم وتربیت اُنکو ایک فرد کامل بنادیتی ہے، چنانچہ اکثر بڑے بڑے حکماء وفلاسفر ضعیف الخلقت تھے، اس کے بخلاف بہت سے تنومند اور قوی الجثہ بچوں کو بُری تعلیم وتربیت دی گئی، جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن کے تمام قوائے فطریہ مضمحل اور پژمردہ ہوکر رہ گئے، اس بناء پر یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ تعلیم وتربیت کا تمامتر دارومدار نظام جسمانی پر ہے، بلکہ بچوں کی نشوونما میں فطرت، وتربیت دونوں کا حصّہ شامل ہے، فطرت بچوں کو مختلف قواء عطا کرتی ہے، اور تربیت ان قواء کو سیدھی راہ پر لگاتی ہے، اس لئے بچوں کی تربیت میں اصول فطرت، واصول تربیت دونوں کا یکساں لحاظ رکھنا چاہیئے، لیکن اس نظام تربیت پر عمل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمکو یہ پتا لگانا چاہیئے کہ بچوں کی اصلی فطرت کیا ہے، اور اس فطرت کے مطابق اُنکے لئے کیا اصول تربیت مقرر کئے جاسکتے ہیں؟ بچوں کی فطرت کا اندازہ ہر شخص بآسانی کرسکتا ہے، اُن میں استقلال بالکل

نہیں ہوتا، وہ کسی خیال کو دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے، اُنکے دل میں ہر وقت نئے نئے جذبات اور نئے نئے احساسات پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور وہ ہر وقت نئی نئی چیزوں کے لئے مچلتے رہتے ہیں، ابھی روتے ہیں، ابھی ہنستے ہیں، ابھی شگفتہ ہوتے ہیں، ابھی افسردہ ہوجاتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت متلون مزاج ہوتے ہیں، اس لئے اُن کی تعلیم و تربیت میں بھی اسی فطرت کا لحاظ رکھنا چاہیئے، اُنکو ایسے اسلوب پر تعلیم نہیں دینا چاہیئے جس میں کسی قسم کا تغیر و انقلاب نہ پیدا ہو، بلکہ ایسے طرز پر اُنکو تعلیم و تربیت دینی چاہیئے۔ جس میں ایک مستقل حرکت اور ترقی جاری ہو، تاکہ اُنکے تلون مزاجی کے اصول پر ٹھیک اُتر جائے، اس اصول کے موافق بچّوں کو تصاویر اور بائیسکوپ کے ذریعہ سے تعلیم دینا نہایت مفید ہے، خود فطرت نے اس اصول کا لحاظ رکھاہے، چنانچہ بچّے کی پہلی مربی عورت ہوتی ہے، جو فطرۃً بچّوں ہی کی طرح سریع الانقلاب، زود رنج، اور متلون مزاج پیدا کی گئی ہے، اس لئے قدرت نے بچّے کی ابتدائی تربیت کے لئے ماں کو زیادہ موزوں سمجھا اور اسکو یہ ودیعت تفویض کی،

بچّے کے ادوار مختلفہ | بچپن کا پہلا دور بچّے کی عمر کے پہلے سال سے شروع ہوکر ۶ یا ۷ برس کی عمر تک ختم ہوجاتا ہے، اس زمانے کو اکثر لوگ نہایت بے پروائی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن درحقیقت یہی سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے، اسی سن میں بچّہ چلنے، بولنے، اور غور و فکر کرنیکی عادت سیکھتا ہے، اس لئے اگر اس زمانے میں اُس کی تربیت عمدہ طور پر کیجائے، تو وہ ہر قسم کی غلطیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، اور ایک عمدہ روش اختیار کر سکتا ہے، آٹھویں سال میں بھی اگرچہ اُس کی اصلاح ہوسکتی ہے، لیکن اس زمانے میں قدیم روش و عادت کا چھڑانا نہایت مشکل ہوجاتا ہے، اگر اس میں غور و فکر کرنیکا عمدہ طریقہ سیکھا دیا گیا، تو وہ اُسکے بچپن کے دوسرے دَور میں جو سات سال کے بعد شروع ہوتا ہے، نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہوسکتا ہے، لیکن اس زمانے میں اگر بچّوں کو قدرتی اشیاء مثلاً ابر، نہر، دریا، پہاڑ، نباتات اور حیوانات کے مختلف مناظر دکھائے جائیں تو وہ اُسکے آئندہ زندگی پر نہایت عمدہ اثر ڈالینگے، علوم جدیدہ کی تمام بنیاد انہی چیزوں پر قائم ہے، اس لئے وہ بچپن ہی میں سادہ طور پر اُنکے موضوع بحث سے واقف ہوجائیگا، جو اُسکی آئندہ علمی زندگی کے دشوار گذار

مراحل میں نہایت آسانی پیدا کریگا، فرانس کے مشہور فلاسفر روسی فنیلون اور مونٹیسی نے اس اصول تربیت کو نہایت مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے، روسی کہتا ہے "انسان کی تربیت اُسی دن سے شروع ہو جاتی ہے، جس دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے" فنیلون کہتا ہے "سب سے زیادہ ناقابل تغیر وہ عادت ہے جو بچپن میں پڑ جاتی ہے" مونٹیسی کہتا ہے "تمام عیوب کے جراثیم بچپن ہی میں ہمارے جسم سے لپٹ جاتے ہیں، جبکہ ہم پر دایہ کی حکومت ہوتی ہے"

**ماں باپ کے فرائض۔** تربیت اولاد کی سب سے بڑی ذمہ داری ماں باپ پر عائد ہوتی ہے، س لئے اُنکو چند خاص اصول کا پابند رہنا نہایت ضروری ہے، سب سے بڑی چیز جسکا بچے کی تربیت پر اثر پڑتا ہے ماں باپ کا اتحاد و اتفاق ہے، یہ اتحاد صرف محبت سے پیدا ہوتا ہے، اور محبت ادب و احترام کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن یہ ادب و احترام اُسی وقت قائم رہ سکتا ہے۔ جب عورت، مرد کی فضیلت کا اعتراف کرتی ہے، اس لئے جب تک مرد کی فضیلت اور اُسکا اثر عورت پر قائم نہ رہے، بچوں کی کامل تربیت ناممکن ہے، لیکن اس اتحاد و اتفاق کے بعد بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق ماں باپ سے، سب سے بڑی غلطی جو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بچے کو اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتے، بلکہ اپنا ایک عکس یا پرتو خیال کرتے ہیں، اس بناء پر وہ اُسکو اُسی اصول پر تعلیم و تربیت دیتے ہیں، جنکے مطابق اُنہوں نے خود تعلیم و تربیت پائی ہے، ایک تاجر اپنے بچے کو تجارت کی تعلیم دیتا ہے، زمیندار اُسکو زمینداری کا فن سکھاتا ہے، فلسفی اُسکو فلاسفر بنانا چاہتا ہے، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ بعض لوگوں کو اپنے پیشے میں کامیابی نہیں ہوتی، مثلاً ایک تاجر کو تجارت میں فروغ حاصل نہیں ہوتا، اس لئے وہ اپنے بچوں کے لئے تجارت پسند نہیں کرتے، اور دوسرے فن یا پیشے کی تعلیم دیتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ اصول تربیت نہایت مضر ہے، بچہ باپ ماں کا وجود ظلی نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی ایک مستقل ہستی ہوتی ہے، اُس کے احساسات اور جذبات مستقل ہوتے ہیں۔ اُسکا طبعی مذاق الگ ہوتا ہے، اس بنا پر یہ ممکن ہے کہ باپ ماں نے جو تعلیم و تربیت حاصل کی ہے وہ اُسکے لئے موزوں نہ ہو، بس بچے کی تعلیم و تربیت کا

پہلا اصول یہ ہے، کہ اُسکی ذات کو ایک مستقل چیز تسلیم کیا جائے، اور اُسکے مستقل جذبات اور احساسات اور طبعی مذاق کے موافق اُسکو تعلیم و تربیت دیجاوے، بعض لوگ بچّوں کو اپنی حالت کے برعکس تعلیم و تربیت دیتے ہیں، مثلاً جن لوگوں کے ساتھ بچپن میں اُنکے ماں باپ نے سختی کی تھی، وہ بچوں کے ساتھ نہایت نرمی کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور جن لوگوں کے ساتھ ماں باپ نے نرمی اختیار کی تھی، وہ بچّوں پر سختی کرتے ہیں لیکن اس طرز تربیت کا اثر بچّوں پر نہایت مضر اثر پڑتا ہے، بچوں کو تعلیم و تربیت میں اپنی حالت کا لحاظ کرنا بالکل لغو چیز ہے، خود بچّوں کی حالت کا لحاظ کرنا چاہیئے، اگر سختی کا موقع ہے تو اُس حالت میں نرمی نہایت مضر ہوگی۔ اور اگر نرمی کی ضرورت ہے تو سختی کا نہایت بُرا اثر پڑیگا۔

**تنبیہ کے طریقے** کامل نگہداشت کے بعد یہ ناممکن ہے کہ بچوں سے فروگذاشتیں نہ ہوں، لیکن اس معاملہ میں باپ ماں کو اُنکا مواخذہ نہایت احتیاط سے کرنا چاہیئے، سب سے زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ بچّے کے سامنے اُسکی گذشتہ فروگذاشتوں کا ذکر بار بار نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے وہ بے حیا اور شوخ چشم ہوجاتا ہے، اور بعض حالتوں میں باپ ماں سے بغض و عناد پیدا کرلیتا ہے، تاہم ہر غلطی کی اصلاح بھی عین وقت پر ضروری ہے، اسکا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لڑکے کے جرم پر باپ ماں کے چہرے پر ناراضی کا جو اثر طاری ہوتا ہے، اُسکی زبان حال سے ذریعہ اصلاح بتایا جائے، بچہ فطرۃً باپ ماں کے تمام حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے اور رنج و غم کی حالت میں اُن پر جذبات کا جو اثر پڑتا ہے، اُس سے واقف ہوتا ہے۔ اس لئے جب حالت جرم میں وہ باپ ماں کا چہرہ بدلا ہوا پاتا ہے تو اُسکو خود بخود عبرت ہوتی ہے، اور وہ در پردہ اپنی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، لیکن صرف یہ خاموش طریقہ کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ محاسن اخلاق کی خوبیاں اور اوصاف ذمیمہ کی بُرائیاں بھی اُنکے ذہن نشین کرتے رہنا چاہیئے۔

اگرچہ بعض علمائے فن تعلیم کی رائے میں بچّے پر جرمانہ کرنا جائز نہیں، تاہم بعض حالتوں میں اسکی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس قسم کے جرمانوں کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لڑکوں کا ناشتہ بند کردیا جائے۔ یا انکو مٹھائی وغیرہ کے لئے پیسے نہ دئے جائیں، یہ اگرچہ

نہایت معمولی درجہ کا جرمانہ ہے، لیکن لڑکوں کی فطرت کے لحاظ سے نہایت مؤثر ہے تاہم جرم اور جرمانہ میں موازنہ و تعادل کا قائم رکھنا ضروری ہے، جرمانہ ہر جرم کی حیثیت کے موافق ہونا چاہیئے اور جو فروگذاشتیں لغزشیں اور عدم احتیاط کی بنا پر سرزد ہوں اُن پر بجز چند کلمات نصیحت کے اور کوئی مواخذہ نہ کیا جانا چاہیئے، لیکن اگر کسی بچے پر باپ ماں کی ناراضی اور اُنکے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ کا اثر نہیں پڑتا تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ باپ ماں کی صحبت میں تربیت پذیر نہیں ہو سکتا، اس لئے اُسکو کسی عزیز یا دوست کے گھر بھیجدینا چاہیئے، اسے جلاوطنی کی سزا میں جب وہ اُس اجنبی گھر میں لطف و محبت کی وہ صورتیں نہ دیکھے گا، جو باپ ماں کے گھر میں نظر آتی تھیں، تو خود بخود اُسکو اپنے جرائم پر ندامت ہوگی اور وہ اُن سے باز آئیگا،

محمد حنیف خاں

---

# سچ

افریقہ میں پرانے زمانے کی ایک سلطنت کور کے نشانات شاہی محلوں قلعوں اور فصیلوں کی صورت میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ باشندگان کور کے ایک سب سے بڑے مندر کے بھی کچھ نشان باقی ہیں۔ صداقت کی دیوی کی تصویر بنی ہے اور اُس پر یہ کندہ ہے۔

"کیا اس عالم میں کوئی ایسا دلیر نہیں جو میرے برقعہ کو ہٹائے اور میرے روئے روشن کا نظارہ کرے؟ جو میرا برقع ہٹائے میں اُسکی ہو رہونگی میں اُسکو امن امان دونگی۔ علم و دانش کے بیش بہا خزانے عطا اور انبساط رُوح کے سامان مہیا کرونگی"

ایک آواز آتی ہے "اگرچہ وہ تمام ہستیاں جو تیری تلاش میں سرگرداں ہیں تیری محبت کا دم بھرتی ہیں لیکن اے صداقت کی دیوی! پارسا و پاکزہ دوشیزہ! اختتام عالم تک دوشیزہ رہنے والی! دیکھ کوئی بشر نہ تو اس عالم میں پیدا ہُوا اور نہ ہوگا جو تیرا برقعہ ہٹائے اور زندہ رہے۔ اے دیوی! صرف موت ہی تیرے برقعہ کو ہٹا سکتی ہے"

(ترجمہ) خواجہ بہاؤالدین زکریا

# علم الجرائم

:: ۵ ::

دُنیا کے ہر خطہ میں کم و بیش اور خصوصاً ہندوستان جنت نشان میں ۸۰ فیصدی ایسے کاہل الوجود انسان ہونگے جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تمام جہان کے زر و جواہر اور مال و دولت پر ناجائز قبضہ حاصل کر لینے کے آرزومند ہیں۔ ایسی ہی فقیدالمثال ہستیوں میں کلکتہ کا ایک نوجوان بنگالی چندر دت بھی تھا جو اپنی دنیاوی وجاہت قائم رکھنے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کرنے کے درپے رہتا تھا۔ بشیشر پنڈت کے شاطر ہمراہی تو ایسے اوباش مزاج اور شوریدہ سر نوجوانوں کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے چنانچہ اُنہوں نے چندر دت کو دولت و امارت کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ اُس نے پنڈت موصوف کی فوری زیارت کا ارادہ ظاہر کیا۔ چند دنوں تک تو یہ بدکردار لٹیرے اُس نوجوان بنگالی کا اشتیاق بڑھانے کی خاطر اُسے اِدھر اُدھر ٹالتے رہے کہ ایسے باکرامت بزرگوں سے ملنا کوئی آسان کام نہیں لیکن چندر دت کا تقاضا حد سے بڑھ جانے کے باعث اُنہوں نے بعد از ہزار منت و سماجت اُسے اُس باغ میں پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا جہاں پنڈت صاحب کی جائے سکونت اور اُنکی عدیم النظیر کرنسی نوٹوں کی ٹکسال تھی۔ پنڈت صاحب اُس وقت بنگلہ کے وسیع ہال میں رونق افروز تھے۔ کمرہ میں صاف ستھری دری کے اوپر ایک گول میز کے اردگرد نصف درجن کے قریب معمولی حیثیت کی کرسیاں نہایت بے ترتیبی سے رکھی تھیں۔ جنوب رویہ ایک چھوٹے ملحقہ کمرہ میں پنڈت صاحب کا دار التجارب تھا جہاں ایک سفید رنگ میز پر شیشے کی چند نلکیاں کچھ تیزاب اور کچھ کاربن کاغذ کے ٹکڑے پڑے تھے اور یہی اُس تجربہ گاہ کی کُل کائنات تھی۔ دیگر متعدد کمرے اُن کی ذاتی رہائش کے کام آتے تھے۔ اُس وقت صبح کے چھ بجے ہونگے۔ آفتاب عالمتاب کی تیز شعاعیں کلکتہ کی بلند ترین عمارات کی چوٹیوں سے ٹکرا کر ضیا پاش بن رہی تھیں کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی چندر دت کو ہمراہ لئے پنڈت موصوف

کے کمرہ میں داخل ہُوا۔ رسمی تعارف اور معمولی مزاج پُرسی کے بعد چند منٹ تک موسم اور حالات حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی چنانچہ موقعہ پاکر پنڈت کے ہمراہی نے چندردت کے آنے کی اصلی وجہ بیان کردی۔ پنڈت موصوف نے مُنہ پر ہاتھ پھیر کر سر نیچے جُھکالیا پھر اپنے آپکو ایک مافوق العادت ہستی ظاہر کرنے کی نیت سے نہایت ہمدردانہ انداز میں پوچھا"کیا آپکے پاس کوئی دس روپیہ کا کرنسی نوٹ ہے؟"

نوجوان بنگالی کا دل باغ باغ ہوگیا اور اُسے اُس بات کا احساس ہُوا کہ واقعی پنڈت صاحب نہایت رحمدل۔ فیاض طبیعت اور برگزیدہ بزرگ ہیں جنہوں نے بغیر کسی خدمت۔ معاوضہ یا منت وسماجت کے ایک سے دو نوٹ بنا دینے کا ارادہ کرلیا ہے۔ چنانچہ اُس نے خندہ پیشانی اور مؤدبانہ انداز سے دس روپیہ کا کھڑکھڑاتا ہُوا نوٹ جیب سے نکال پنڈت صاحب کے حوالہ کردیا جو اُسے ہاتھ میں لئے اپنے دارالتجارب میں داخل ہوگئے اور چندردت اُسی کمرہ میں حیران کردینے والے شعبدہ کا نہایت بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

اس اثناء میں چندردت کو ساتھ لانے والے شاطر عیار نے اُسکا دل بہلانے کی خاطر پنڈت صاحب کی کئی ایک کرامات کا ذکر کرنا شروع کردیا اور بیسیوں ایسے نوجوانوں کے فرضی نام گن دئے جو ملک کے مختلف حصّوں میں محض پنڈت صاحب کی کرم گسترانہ توجہ کے باعث عیش وآرام کی زندگی بسر کررہے تھے۔ ان بے سروپا فسانوں اور دروغ بافیوں کی وجہ سے سینکڑوں قسم کے پریشان خیالات اُس کے دماغ میں زیروزبر ہونے لگے اور اپنی آرزؤں کی خیالی دُنیا کا نقشہ اُسے اصلی رنگ روپ میں دکھائی دینے لگا۔ مال ودولت حاصل کرلینے کے بعد وہ ایک نہایت عالیشان محل بنوانے اور اُس حور طلعت لڑکی سے شادی کرنے کا متمنی تھا جسے وہ نہایت شاندار ساڑھی میں ملبوس ہر شام کسی خادمہ کے ہمراہ ایک خوبصورت بنگلہ کے پائیں باغ میں محوخرام دیکھتا تھا۔ اگرچہ یہ تمام افسانہ نما خیالات چندردت جیسے سمجھدار اور اعلیٰ تعلیمیافتہ آدمی کو بادی النظر میں نہایت تمسخر انگیز معلوم ہوتے تھے مگر پھر بھی اُمید ہر لحظہ ہمت بڑھائے جاتی تھی کہ مستقل مزاج رہو کامیابی اب دُور نہیں یہ صرف چند ایک منٹ کی بات تھی کہ سامنے کا دروازہ کھُلا اور بشیشر پنڈت عجب

ہیت کذائی میں چندردت کے سامنے نمودار ہوُا۔ پیشانی سے لیکر تالو تک قریباً چار انچ عریض وسطی حصہ منڈا ہوُا تھا جس میں ایک فٹ سے زائد لمبی گیھے دار چوٹی عجب شانِ قلندری کے ساتھ بائیں کان کے اوپر لٹک رہی تھی۔ ایک لمبا قشقہ ناک سے لیکر پیشانی کے وسط تک چلا گیا تھا جس میں چاول کے چند ایک سُرخ دانے بھی نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ضرورت سے زیادہ سُرخ۔ کان چوڑے جس میں سونے کے بڑے بڑے بالے لٹک رہے تھے۔ گلے میں زنار اور ٹانگوں پر سُرخ رنگ کی دھوتی۔ پاؤں میں چوبی کھڑاویں۔ اُسکی گھنی کھچڑی دار مونچھیں جنھوں نے اُسکے موٹے لبوں تک کو پوشیدہ کر رکھا تھا اور چھاتی اور توند پر سیاہ وسفید بالوں کا تکاثر و توافر اُسکی صورت کو نہایت ہی مکروہ و بھیانک بنا رہا تھا۔ یا تو چند منٹ پیشتر پشیشر بنارسی پنڈتوں کے شریفانہ لباس میں ملبوس اندر داخل ہوُا تھا۔ یا بایں وحشت اس تمسخر انگیز حالت میں دس دس روپے کے دو نوٹ لئے باہر نکلا کہ وہ الہ دین کے چراغ کا تمنائی ساحرِ ہندی معلوم ہوتا تھا، پھر نہایت کامرانہ آواز میں کہنے لگا "یہ میں نے اپنے منتروں کے ذریعہ پیدا کیا ہے"

چندردت نے بندر جیسی گرفت سے دونوں کرنسی نوٹ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اُسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ اس نوزائیدہ نوٹ کو کسی طور بھی جعلی نوٹ نہیں کہا جاسکتا، کونسی بات تھی جو اُس میں موجود نہ ہو۔ اس ابتدائی تجربے نے اُسے بہجت و شادمانی کے پُر بہار چمنستان میں پہنچا دیا پھر نہایت مسرت سے تین چار نوٹ اور نکالکر پنڈت صاحب سے عرض کیا "اگر انہیں بھی دو دو بنا دیں تو زہے قسمت"۔

پنڈت صاحب نے پُر تبسم ہونٹوں سے کہا بہت بہتر لائیے، مگر اسکے بعد میں آج کوئی اَور نوٹ آپ سے نہیں لونگا۔ ہاں کل آپ بڑی خوشی سے تشریف لائیں۔ ان نوٹوں کو دوگنی تعداد میں تبدیل کر دینے کے لئے کم از کم پندرہ منٹ درکار ہونگے، اُدھر میری ریاضت کا وقت قریب آ رہا ہے، لیکن آپکو ایسی چھوٹی چھوٹی رقوم کے نوٹوں کے لئے میرا عزیز و قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ آپ ہزار ہزار روپے کے نوٹ لائیں تاکہ میں صحیح معنوں میں آپکی کچھ مدد کر سکوں"۔ یہ کہکر پنڈت صاحب اپنے دار التجربہ میں گھس گئے اور اُسی

پیشتر کے طریق سے نہایت مکروہ آواز میں منتر جنتر پڑھے جانے لگے۔ بالآخر ٹھیک پندرہ منٹ بعد پنڈت صاحب وہ نوٹ لیکر باہر نکلے اور تمام کے تمام چندر دت کے حوالے کر دیئے جسکا چہرہ آنِ واحد میں دفورِ مسرت سے تمتما اُٹھا۔ اسکے بعد اُس نے پنڈت صاحب کو نہایت تعظیم سے "آداب" کہا اور دوسرے دن بڑی رقوم کے نوٹ لانیکا وعدہ کر کے شاداں و فرحاں اپنے گھر کی طرف چلدیا +

لیکن دوسرے روز اُسکے سامنے ایک نہایت اہم اور غور طلب سوال درپیش تھا۔ خود اُسکے پاس پانچ چھ دس دس روپے کے نوٹوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا چونکہ پنڈت جی مہاراج نے یہ فرمایا تھا کہ وہ ہزار روپے سے کم مالیت کے کسی نوٹ پر کیمیادی عمل کرنا تضیع اوقات سمجھتے ہیں اس لئے اُسے مجبوراً اسی قیمت کے نوٹ حاصل کرنے کے وسائل سوچنے پڑے چنانچہ چند گھنٹوں کی دماغ سوزی کے بعد اُسے معاً خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے باپ کی میز کے دراز سے ایک ہزار روپیہ کا نوٹ نکال لیا جائے جو ڈبل کرا لینے کے بعد باحتیاط وہیں رکھدیا جائیگا۔ درحقیقت یہ کوئی ایسا لاینحل مسئلہ بھی نہ تھا۔ البتہ تھوڑی سی جرات اور احتیاط درکار تھی جسکا اختیار کرنا چندر دت جیسے آدمی کے لئے کوئی مشکل امر نہ تھا جو مستقبل قریب میں نہایت متمول و عظیم المنزلت آدمی بن جانے اور ہر دنیاوی خواہش پر کامرانی و غلبہ حاصل کر لینے کے موہوم خواب دیکھ رہا تھا اُسکے نزدیک ایک میز کی دراز توڑ ڈالنا تو کوئی بڑی بات نہ تھی وہ اپنے خلجان و وحشت کے اُس مرحلہ تک پہنچ چکا تھا جہاں صرف شہیدانِ اُلفت ہی کی رسائی ہو سکتی ہے جن کے نزدیک پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر بہالے جانا بازیچہ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ دُنیا میں تین بڑی قوتیں ہیں۔ انتقام۔ حسُن اور دولت۔ ان چیزوں کے حصول کی خاطر کون ایسا بشر ہے جو دیوانہ اپنی انتہائی قوت و طاقت صرف نہیں کر دیتا خواہ وہ صنفِ لطیف سے ہو یا صنفِ قوی سے اور چندر دت تو بھلا ایک جوشیلا نوجوان بنگالی تھا۔ جس کی قومی روایات حصول خواہشات کے لئے گذشتہ صدی میں اس قابل رہی ہیں کہ اُنہیں اگر تاریخ ایشیا کا نہیں تو تاریخ ہند کا ایک زرین ورق کہا جا سکتا ہے۔ حاصل کلام ایسے آدمی کے لئے لکڑی کی ایک مقفل دراز کا توڑ ڈالنا کوئی جان جوکھوں کا کام نہ تھا۔ اُس نے مختصر سے آلات اور چابیوں

کے ایک کُھچے کی مدد سے "کٹاک" کی آواز کے ساتھ وہ روپے اور نوٹوں سے نیم پُر دراز باہر کھینچ لی پھر نہایت احتیاط کے ساتھ ایک ہزار روپے کا کرنسی نوٹ نکال کر اُسے بہت ہوشیاری سے بند کر کے دبے پاؤں دروازہ کھول باہر نکل آیا اور سیدھا پنڈت صاحب کے بنگلہ پر جا دم لیا۔

مئی کا مہینہ تھا۔ جہاں دیگر صوبجات ہندوستان میں گرم لُو نے اس وقت دُنیا کو جُھلسا دینے پر کمر باندھ لی تھی۔ یہاں ثمردار بلند قامت درختوں کے گھنے پتے غربی ہواؤں کی روح افزا تازگی کو تیز اور چمکدار آفتاب کی شعاعوں سے بچا کر باغیچہ والوں کے لئے ابرِ رحمت کا کام دے رہے تھے۔ صبح گیارہ بجے کے قریب جبکہ بشیشر پنڈت اپنے یارانِ سرپل سمیت پائیں باغ کے فرش زمردیں پر چہل قدمی میں مصروف تھا کہ سامنے مشرقی دروازہ سے چندر دت ہانپتا کانپتا پسینہ میں تر بتر اندر داخل ہُوا۔ پنڈت صاحب نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ اور نہایت آرام دہ چوکی پر بٹھلا کر مزاج پوچھا۔ چندر دت نے شکریہ ادا کیا پھر اِدھر اُدھر کے چند الفاظ کہکر اُس نے ہزار روپے کا نوٹ پنڈت صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔

پنڈت صاحب چندر دت کا دلی منشا سمجھ گئے پھر نوٹ کو ہاتھ میں لیکر کہنے لگے "یہ ہزار روپیہ کا نوٹ ہے اور اسکے دو بنانے میں کم از کم ایک گھنٹہ درکار ہوگا۔ اس عرصہ میں آپ ان کتب و اخبارات اور میوہ جات سے، جو آپ کے پاس میز پر رکھے ہیں، دل بہلائیے۔ میں اپنے کام میں مشغول ہوتا ہوں۔ مگر کیا آپکے پاس ایک ہی نوٹ ہے یا کچھ اور بھی لائے ہیں۔ چونکہ دوپہر بعد ایک اور نوجوان کے نوٹوں کو بھی مجھے دو دو بنانا ہے اس لئے آج میں آپکو مزید مدد نہ دے سکونگا"۔ یہ سنتے ہی چندر دت کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ اور اُس عرصہ میں اُسے معلوم ہُوا کہ ہزار روپے کا صرف ایک نوٹ چُرا لانے میں اُس نے بڑی نادانی اور بُزدلی کا ثبوت دیا ہے۔ جب میز کی دراز نکال لینے میں کامیاب ہو گیا تھا تو پھر کم از کم نصف درجن نوٹ تو لے آتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ زیادہ لالچ کرنا درست نہیں، انسان کو ہر حال میں قناعت پسند ہونا چاہیئے۔ یہ سوچ کر اُس نے مؤدبانہ نگاہوں کے ساتھ پنڈت موصوف کو دیکھ کر کہا "نہیں جناب اور تو نہیں لایا۔ صرف یہی ایک نوٹ دستیاب ہو سکا وہی حاضر خدمت کر دیا ہے۔ میں پھر کسی وقت

زیادہ نوٹ لانے کی کوشش کرونگا"۔

سیاہ فام پنڈت نے ایک بلند قہقہہ لگا کر کہا "آپکی مرضی پر منحصر ہے"۔ یہ کہکر وہ اپنی تجربہ گاہ میں داخل ہوگئے اور چندر دت اپنے پریشاں دماغ اور مضطرب قلب سے جنگ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اگرچہ نوجوان بنگالی کو کامل یقین تھا کہ صرف ایک گھنٹہ بعد وہ ایک ہزار روپیہ کا مالک بن جانے والا ہے۔ مگر ساتھ ہی اُسکے دل میں پنڈت کی طرف سے ایک گونہ بدگمانی پیدا ہوگئی۔ اُسکے دماغ میں کوئی ایسی بات نہ سما سکی جو اُسے مطمئن کردیتی کہ کیوں پنڈت بغیر کسی فیس یا بغیر کسی معاوضہ کے عوام الناس کے کرنسی نوٹوں کو، جو درحقیقت اُس سے رسمی ملاقات یا تعارف بھی نہیں رکھتے، ایک سے دو بنا دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مفلوک الحال لوگوں کی مدد کے لئے اس خداداد پُراسرار طاقت کا استعمال کرتا ہے تو پھر کیوں نہیں ایسے لوگوں کو تلاش کیا جاتا جو درحقیقت نانِ شبینہ کے محتاج اور صحیح معنوں میں ایسے سلوک کے مستحق ہیں اور کیوں میرے جیسے فارغ البال آدمیوں کی ہر طرح تسلی و دلجوئی کیجاتی ہے۔ نہیں صرف دُنیاوی وجاہت قائم رکھنے اور مصروفِ عیش و نشاط ہونے اور سامانِ تفریح و تعیش فراہم کرنے کی غرض کے علاوہ اور کوئی ضرورت نہیں۔ ان خیالات نے اُس کی رگ رگ میں بدگمانی کی برقی لہر دوڑادی۔ اُسکے کان اور رخسار معمول سے زیادہ سرخ ہوگئے اور اُس کی بلند سفید پیشانی پر عرق انفعال پھوٹ پڑا، اُسے خیال پیدا ہُوا کہ پُراسرار پنڈت سے فوراً اپنا نوٹ واپس لیکر چلا جانا چاہیئے پیشتر اسکے کہ وہ کسی خطرہ میں گرفتار ہوجائے اُس نے ملحقہ تپائی سے، جس پر چند ایک کتابیں اور متعدد اخبارات رکھے تھے، اُس روز کی اشاعت کا انگلشمین اُٹھا کر اُسکے اوراق پر ایک نظر ڈالی۔ مگر اُسکا دل آج اُن خبروں کے پڑھنے سے متنفر ہو رہا تھا جنہیں وہ ہر روز ایک پاکیزہ ذوق سے پڑھا کرتا تھا، اُس نے اخبار سے پنکھے کا کام لیا پھر ایک بیش قیمت سگار سلگا کر دو چار کش لگائے مگر طبیعت کی بے چینی بدستور بڑھ رہی تھی۔ اگرچہ مقابل کا آہنی فوارہ، جو نہایت بے پروائی اور بغیر کسی اندازہ کے سفید و شیریں پانی اپنے سنگین حوض میں جمع کر رہا تھا، چند منٹ کے لئے اُس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر اُسکے دل کی لگی کو بجھانے سے یکسر قاصر تھا۔ "ہاں اب مجھے کیا

کرنا چاہیئے؟" دوسرے لمحہ میں اُسکے منہ سے نکلا اور کرسی سے اُٹھ کر اُس نے پختہ حوض میں خوبصورت رنگدار ننھی ننھی مچھلیوں کا تماشہ دیکھنا شروع کیا۔ مگر آخر آج کیا بات تھی کہ ہر چیز اپنے حُسن اور جاذبیت سے محروم تھی۔ وہ سکونِ قلب کا متلاشی تھا لیکن آج سکون نہ صرف اُسکے دل سے ہی غائب تھا۔ بلکہ آج سکون متحرک پانی کے سکوت میں۔ خوبصورت و معطر پھولوں میں، خاموش فضاؤں میں، ثمردار درختوں میں، اخباروں کے اوراق اور کتابوں کے صفحات میں بھی ناپید تھا۔ اُسے ہر چیز اپنے سیماب صفت دل کی طرح مضطرب و بیقرار نظر آتی تھی، دُنیا چکر میں تھی۔ کلکتہ کے تمام مکان ہوا میں اُڑ رہے تھے، سورج ایک پتنگ کے کاغذ کی مدھم قندیل کی طرح فضائے آسمانی میں ہچکولے لے رہا تھا۔ چنانچہ کامل ایک گھنٹہ کی تشویش سے اُسکے نازک دماغ میں خون حدت پاکر ایک نئی قسم کی گرفت و بے چینی پیدا کر رہا تھا اور اُسے اپنے ساتھ نہ صرف مادی اشیا بلکہ تمام اجرامِ فلکی بھی چکر میں نظر آرہے تھے +

چندردت کئی منٹ تک اس حالت اضطراب میں رہا، ایک مخمور و بدمست انسان کی طرح اُسکی آنکھیں سُرخ اور سر درد کر رہا تھا۔ اُسکے دل و جگر آگ کے شعلوں میں جلتے ہُوئے معلوم ہو رہے تھے، اُس نے صاف و شفاف پانی کے چند چلو لیکر مُنہ میں ڈالے پھر چند چھینٹے آنکھوں پر مارے جن سے اُسکی آتشِ اضطراب کُچھ حد تک فرو ہوگئی۔ اسی اثناء میں بشیشر پنڈت اُسی ہیت کذائی میں تبارک اللہ کی روٹی کا سا منہ لئے، ہاتھ میں کاغذ کے چند ایک ٹکڑے پکڑے نہایت غم و اندوہ اور سُست رفتاری سے سر جُھکائے اُسکی طرف آتا دکھائی دیا۔ پھر چندردت کے سامنے کھڑے ہوکر نہایت افسوس آمیز لہجہ میں کہنے لگا "نوجوان عزیز دوست، اس دفعہ میرا تجربہ ناکامی کی صورت اختیار کر گیا۔ کیونکہ کیمیادی عمل کرتے ہُوئے تھوڑا سا تیزاب زیادہ پڑجانے سے آپکا نوٹ جل گیا، مجھے سخت افسوس ہے، مگر میں کوشش کرونگا کہ اگر تم دس بارہ نوٹ لاؤ تو میں آج ہی دوسرے نوجوان کا کام چھوڑ کر تمہارے نوٹوں کو زیادہ تعداد میں تبدیل کر دوں" +

یہ سُنتے ہی چندردت کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور خوف و ہراس سے اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُسے اب معلوم ہُوا کہ فی الحقیقت بشیشر پنڈت کی کرنسی نوٹوں کی ٹکسال اُس

جیسے راسخ الخیال اور خوش عقیدہ بنگالیوں کو پھانسنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ درحقیقت وہ بیوقوف آدمی تو نہیں تھا لیکن جس طرح دانہ کا لالچ معصوم پرندوں کو صیاد کے جال میں پھنسا دیتا ہے بعینہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اور بغیر کسی محنت و مشقت کے زر و مال حاصل کر لینے کا خیال اُسے اندھا بنا کر پنڈت کے دار التجارب میں کھینچ لایا تھا۔ مگر وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہر کر اپنی حماقت کا مزید ثبوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ بغیر پنڈت کو کسی قسم کا جواب دیئے نہایت عجلت و تیز رفتاری کے ساتھ اپنے گھر کی طرف چلا گیا اور ایک سعادتمند فرزند کی طرح تمام ماجرا اپنے باپ سے بلاکم و کاست کہہ سُنایا۔ اپنے لڑکے کی پُرحماقت داستان سنتے ہی سالخوردہ بنگالی کا رنگ فق ہو گیا۔ آدمی تھا جہاندیدہ اُس نے ایک منٹ تک اپنی چندیا کو کھجلایا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد چندر دت کو ساتھ لئے اُس نے پولیس کے ایک افسر اعلےٰ سے ملاقات کی اور عیار پنڈت کی شرانگیزی کا تمام حال کہہ سنایا۔ خوش قسمتی سے اُنہیں دنوں کلکتہ کی پولیس کو شمالی ہندوستان کی طرف سے ایک ایسے شاطر بدکردار کی فریب کاریوں کے متعلق اشتباہی اطلاعات موصول ہو چکی تھیں جس میں بیان کیا گیا تھا کہ اس حلیئے اور اس قماش کے ایک بزرگ اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرزمین بنگال کو بھی متبخر فرمایا چاہتے ہیں۔ اُسی وقت پولیس کی ایک مسلح جماعت باپ بیٹے کی معیت میں اُس بنگلہ پر پہنچی جہاں ایک سے دو نوٹ بنا دینے کے منتر پڑھے جاتے تھے اور جملہ افسرانِ پولیس مع گارد کے عین اُسی وقت بنگلہ کے پھاٹک پر پہنچے جبکہ بدقماش پنڈت اپنا تمام ساز و سامان ایک گاڑی میں لاد اپنے شریر و عیار ہمراہیوں کے ساتھ کسی دوسرے حصہ ملک میں وہی پاکھنڈ پھیلانے جا رہا تھا۔ اُس کی جامہ تلاشی پر دس دس روپے کے نوٹوں کے کئی بنڈل نکلے جن کی مجموعی مالیت چار ہزار کے قریب تھی۔ اُسی وقت مقامی افسرِ مالیات سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گذشتہ دو مہینہ میں پنڈت موصوف نے چار نوٹ ہزار ہزار روپے کے دس دس روپے کے نوٹوں کے تبادلہ میں داخل خزانہ کئے تھے اور یہ کہ چندر دت کے نمبر والا نوٹ اُسی صبح خزانہ میں موصول ہوا تھا؎

ہندوستانی جرائم پیشہ اقوام کی حشر انگیزیوں کے بیشمار واقعات بیان کرتے ہوئے

؎ ماخوذ از کرائم اینڈ کرمنلز (پولیس اینڈ کرائم ان انڈیا) صفحہ ۳۱۰

سر ایڈمنڈ کاکس بردہ فروشوں کی ایک جماعت کا نہایت دلچسپ الفاظ میں ذکر کرتے ہیں جنہوں نے پنجاب سے مختلف المذاہب مستورات اکٹھی کر کے سندھ کے متمول زمینداروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کا خلافِ قانون پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ پانچ دریاؤں سے سیراب ہونیوالی زمین کے بنجارے مختلف علاقوں کی نوجوان لڑکیاں سندھ میں لیجا کر یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ معزز ترین ہندو یا مسلمان گھرانوں کی بہو بیٹیاں ہیں لیکن درحقیقت وہ نہایت ادنے قماش اور رذیل پیشہ لوگوں کی اولاد ہوتی تھیں۔ فارغ البال زمیندار پری چہرہ لڑکیوں کے لئے ہزاروں روپے پیش کرتے تھے اور خریدنے کے بعد ضروری مذہبی رسومات ادا کر کے اُنہیں اپنی زوجیت میں لے آتے۔ اور حسبِ معمول گھر بار کا تمام انتظام اُنہیں کے سپرد کر دیا جاتا۔ جب تمام چیزوں اور قیمتی اشیا پر نئی دُلہن کا قبضہ ہو جاتا تو وہ موقع پا کر تمام نقد روپیہ اور سونے چاندی کے زیورات سمیٹ پنجاب میں اپنے گھر بھاگ آتی جہاں کچھ مدت تک محو عیش و نشاط رہنے اور رنگ رلیاں منانے کے بعد اُسکے لواحقین پھر سندھ میں لیجا کر کسی اور زمیندار کے پاس فروخت کر آتے۔ کچھ عرصہ بعد دہ نئے خاوند کو بھی اُسی طریق سے دھوکا دیکر واپس آ جاتی۔ جب ایسے مجرمانہ اور اخلاق سوز واقعات کی نسبت سر ایڈمنڈ کو خبر پہنچی تو اُنہوں نے اپنی فطرتی ذہانت و قابلیت سے ہمیشہ کے لئے بردہ فروشی کے اس سلسلہ کا خاتمہ کر دیا۔ علاوہ ازیں ایک اور قسم کے جرم کا قلع و قمع کرنے میں سر موصوف کو نہایت کاوش کا سامنا کرنا پڑا۔ چند سال ہوئے کہ مانچسٹر کی ایک کمپنی نے بڑی بھاری تعداد میں اس قسم کے رومال بنا کر ہندوستان بھیجے جن پر دس روپے کے نوٹ کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ چالاک و بیباک آدمیوں نے اُس حصہ رومال کو پھاڑ کر اور سادہ کاغذوں پر چسپاں کر کے بے علم و ناواقف دیہاتیوں کو دس دس روپے کے نوٹوں کے عوض دینے شروع کر دیئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں شورِ محشر بپا ہو گیا چنانچہ بعد از تحقیقات کئی ایک شر و فساد کے بانی پولیس کے بے پناہ شکنجہ میں کس دئے گئے اور مجبوراً حکومت ہند کو ان رومالوں کی درآمد بند کرنی پڑی *

دنیا کے ہر خطہ میں ہر قسم کی جرائم پیشہ اقوام کا سب سے بڑا حربہ لالچ اور چرب زبانی ہے حیرت کی بات ہے کہ بیشمار تعلیمیافتہ سمجھدار انسان تھوڑے سے لالچ اور پر تملق الفاظ کے

دام میں گرفتار ہو کر لُٹ جاتے ہیں یا دوسروں کو برباد کرانے میں ممد و معاون بنتے ہیں۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ ۸۰ فیصدی حالتوں میں دھوکہ دینے والا فریب خوردہ سے کسی حالت میں بھی ہوشیار و چالاک نہیں ہوتا۔ اُس کی تعلیم۔ ذہانت و قابلیت۔ دماغی و جسمانی حالت موخرالذکر سے کسی طور بھی اعلیٰ نہیں ہوتی۔ حال ہی میں ہوڑہ کے سشن جج نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کیا ہے جس میں ایک شخص مسمی ہری سیتا وشنو ماخوذ تھا۔ اس چالاک آدمی پر الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے آپکو ڈگمبر اینڈ کمپنی کے بانیان میں سے ظاہر کر کے ہندوستان کی ستر میونسپل کمیٹیوں سے ٹھیکہ کیا کہ کمپنی ایک میعادِ معینہ تک اُنکے تمام سامان پر مفت رنگ کر دیگی۔ اسی خدمت کے صلہ میں اس شخص نے حکام میونسپلٹی سے صرف اِتنی استدعا کی کہ وہ اس کارخانہ کی معزز آدمیوں سے سفارش کر دیں کہ وہ اپنے مکانوں یا اپنے ساز و سامان پر اس کمپنی سے رنگ کرائیں۔ یہ سفارش کرا کر اس شخص نے لوگوں کو دھوکہ دیا۔ اور اُن سے جو رقوم وصول کیں اُنہیں جیب میں رکھا۔ لیکن درحقیقت اس قسم کا کوئی کارخانہ ہندوستان کے کسی حصہ میں موجود نہ تھا۔ اس طور پر ملزم نے شرفا اور وسا سے کئی ہزار روپیہ اُڑایا۔ چنانچہ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جیوری نے ملزم کو مجرم قرار دیا اور اُسے سات برس کی قید سخت کا حکم دیا گیا"۔

کیسی سادہ اور سلجھی ہوئی عیاری ہے کہ ستر میونسپل کمیٹیوں کے سالخوردہ اور سرد و گرم چشیدہ کارکنان نے محض اپنے ذاتی فائدہ کی بنا پر سینکڑوں شرفا کا نقصان کیا۔ بغیر کمپنی کا کام دیکھے اور بغیر اس بات کا ثبوت طلب کئے کہ آیا درحقیقت کوئی ایسی بڑی کمپنی ہندوستان کے کسی شہر میں موجود ہے جو میونسپل کمیٹی کے تمام ساز و سامان پر پانچسو روپے کا مفت رنگ کر دیگی، عمائد و معززین شہر کے نام سفارشی خطوط لکھدینا کیسی غیر مآل اندیشی کا کام تھا۔ یہ لازمی امر ہے کہ ہری سیتا وشنو نے کمپنی کا صدر مقام ہر ایک ناظم بلدیہ کو مختلف بتایا ہوگا لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ ستر کی تعداد تک پہنچنے سے پیشتر کسی ایک نے بھی اس مجرم کی حیلہ سازی کو نہ سلجھا اور یوں کھلے بندوں اُسے فریب دہی کا موقع ملتا رہا۔

ہندوستان کا میدان صرف ہندوستانی مجرمین ہی کے لئے صاف نہیں بلکہ غیر ملکی لوگ بھی یہاں اپنا جال پھیلانے میں ہر طرح کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس چلن کے کئی آدمی ہندوستان

کے متعدد شہروں میں مختلف النوع جرائم کی پاداش میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ایک یوروپین مسمی اے فریزر جس کی عمر ۲۵ سال کے قریب ہے بنگلور اور مدراس میں چوری اور جعلسازی کے الزامات میں دو سال قید بھگت رہا ہے۔ ۷ مئی ۱۹۲۳ء کو اس پر بمبئی کی کئی دو کانوں میں نقب زنی کر کے ۱۵ ہزار روپیہ مالیت کے گراموفون۔ جواہرات و ریوالور چُرانے کے مقدمات چلائے گئے۔ اُس نے تمام جرائم کا اقبال کیا۔ پولیس انسپکٹر نے عدالت کو بتایا کہ وہ انگلینڈ کے ایک معزز خاندان کا لڑکا ہے، بحری و بری فوج میں ملازم رہ چکا ہے اور یہ کہ ۱۶ سال کی عمر ہی سے اُسے چوری وغیرہ کی لت پڑ گئی۔ گذشتہ سال جب پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے تو انگلستان کے متعدد جرائد نے ہندوستانیوں کو پیش از وقت انتباہی اطلاعات بھیجکر ممنون کیا کہ سرزمینِ تہذیب کے بہت سے تعلیمیافتہ و مہذب عیار اس موقعہ پر ہندوستان پہنچنے کی کوششوں میں مصروف ہیں اس لئے ہندوستانی رؤسا و عمائد اور عامتہ الناس کو اُن کے زرق البھڑک لباس اور بیش قیمت ساز و سامان سے ہرگز مرعوب نہ ہونا چاہیئے اور ان شاطروں کی بدعنوانیوں سے پیشتر ہی مطلع رہنا چاہیئے جو ایک عظیم المنزلت قوم کی قبائے تہذیب پر ایک سیاہ داغ کی حیثیت رکھتے ہیں ؞

لیکن جہاں ہم بے بس ہو کر ایسے عیاروں کی فتنہ سازیوں کے دامِ تزویر سے اپنے آپکو ہرطرح محفوظ رکھتے ہوئے بھی گرفتار ہو جاتے ہیں وہیں ہم بہت دفعہ اپنی ذراسی سہل انگاری اور ناعاقبت اندیشی کی بدولت اُنکے لئے بہت کچھ سامانِ کامیابی بہم پہنچا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے ہم میں سے بہت کم اصحاب نے اس بات کا خیال کیا ہوگا کہ آیا کسی لفافہ پر ضرورت سے زیادہ ٹکٹ لگانے سے کسی قسم کے نقصان کا احتمال ہو سکتا ہے ؟ عام طور پر لوگ بیمہ یا رجسٹری کراتے وقت کم مالیت کے زیادہ ٹکٹ چسپاں کر دینے کے عادی ہیں۔ فرض کیجئے ایک بیمہ شدہ لفافہ پر ۱۲؍ کے ٹکٹ لگنے ہیں مگر بجائے اسکے کہ اُس پر ایک ۸ ؍ کا اور ایک ۴ ؍ کا ٹکٹ لگایا جائے اُس پر آنہ آنہ والے ۴ ۲ ٹکٹ ایک قطار میں لگا کر تمام لفافہ بھر دیتے ہیں — بادی النظر میں تو آپنے کوئی ایسا فعل نہیں کیا جس سے کسی قسم کا خوف لاحق ہو مگر ڈاکخانہ کے چوروں کو یہ سنہری موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ وہ نہایت احتیاط سے ٹکٹ اُتار کر کسی نیز اور زار سے

لفافہ چیر نوٹ نکال لیتے ہیں اور ان کی جگہ ردی کاغذ کے ٹکڑے بھر دیتے ہیں پھر ۲۴ کے ۲۴ ٹکٹ اُسی جگہ باحتیاط تمام لگا دیتے ہیں۔ بیمہ وصول کرتے وقت لینے والا لاکھ کی مہروں کے سوا کسی اور چیز کو نہیں دیکھیگا۔ اس سہل انگاری سے نہ صرف گورنمنٹ کا نقصان ہُوا بلکہ جو تکلیف فرستندہ دیا بندہ کو پہنچی وہ بیان سے باہر ہے۔ اس لئے ہر دیانتدار و امن پسند شہری کا فرض ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ٹکٹ استعمال کرکے اپنے لئے کوئی نیا خطرہ نہ پیدا کرے۔

لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک اور تکلیف دہ جیب کتروں کا فرقہ ہے جس کے ممبر آپکو ہر جگہ ملینگے۔ سرکاری محکمہ جات میں۔ کاروبار کی منڈیوں میں۔ تماشہ گاہوں میں۔ تفریح و تفرج کے مقامات میں۔ ریلوے سٹیشنوں میں۔ ریل گاڑیوں میں۔ سراؤں میں۔ ہوٹلوں میں پُررونق بازاروں میں ویران گلیوں میں۔ اعلےٰ سوسائٹی میں۔ اسفل طبقہ میں۔ میلوں میں۔ متحرک تصاویر کے تھیٹروں میں۔ مذہبی مقامات میں حتیٰ کہ عبادتگاہوں میں یہ ذلیل ترین لوگ اپنا کام کرتے پکڑے گئے ہیں۔ خورد و کلاں۔ امیر و غریب۔ مرد و زن۔ جاہل و تعلیمیافتہ۔ کمزور و توانا۔ غرضیکہ ہر طبقے کے شہری ان سے نالاں ہیں۔ ایسے بدمعاشوں کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لئے چند دلچسپ واقعات اور گیارہ نہایت ضروری اصول ہیں جو ہر شخص کو بغور مطالعہ کرکے اُنہیں یاد رکھنا چاہیئے اور وہ یہ ہیں۔ (باقی آئندہ)

محمد ضیاء الدین شمسی

---

# تقریظ

**کلمات طیبات** حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے منتخب زرین اقوال کا ایک مفید مجموعہ ہے۔ عربی متن کے ساتھ اُردو ترجمہ اور صفحہ مقابل پر انگریزی ترجمہ درج ہے۔ منشی شرف الدین صاحب ہیڈ کلرک ہوم ڈیپارٹمنٹ ریاست رامپور سے مل سکتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے

# رنگروٹ

## (۱)

چار دن کے ابر اور کُہر کے بعد دُھوپ کی صورت نظر آئی، سات بجے ہونگے، ہواؤں سردی بھی ملی تھی، دالان میں کلو پنڈت اور راما اہیر بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے ہیں، وہ ابھی کھیت دیکھ کر آئے ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ کہیں گیہوں کے کھیتوں میں اولے نہ گریں، یا کُہر کی وجہ سے کیڑا نہ لگ جائے، گھر میں سے پرم سکھ مہاراج آنکھیں ملتے ہوئے نکلے۔ راما نے "پالاگن" کی اور کلو پنڈت نے "نمسکار" کیا،

پرم سکھ مہاراج نے تیوری چڑھا کر کہا، "دھن رے بھگوان!"

کلو پنڈت نے پرم سکھ مہاراج کی صورت غور سے دیکھی اور بولا، "مہاراج کیا ہوا؟"

مہاراج ٹھنڈا سانس بھر کے کہنے لگے، "کرم داس چمار کے ہاں آج ایک اور لڑکا پیدا ہوا ہے ـــــ وہ اب پورے دس بچوں کا باپ ہو گیا،"

جماہی لیکر کلو پنڈت نے کہا، "پرماتما کی اِچھا ہے"

"جن کو ارمان ہے ان کو تو دیتا نہیں، جو نہیں چاہتے انہیں جبراً دیتا ہے" یہ کہکر پرم سکھ بھی آگ تاپنے لگا۔

راما چلم پیتے پیتے کھانسنے لگا۔ پھر اس نے کہا، "مہاراج سچ ہے، درگا بنجارے کو دیکھو دو عورتوں سے اس کے آٹھ لڑکے چھ لڑکیاں ہیں، یہ مرغی کے بچوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرا کرتے ہیں۔ چھوٹی عورت تو دن بھر ان کے پیچھے بکتی رہتی ہے"،

پرم سکھ نے لمبا سانس لیکر کہا، "میرے بال سفید ہو چلے، مگر میری خدا نے ایک نہ سُنی، کیسے کھوٹے بھاگ ہیں!"

راما کہنے لگا، "مہاراج نربدا مائی نے ایک لڑکا تو دیا ہے، رام پرشاد ـــــ وہی بس ہے"

کلو پنڈت نے کہا، "ہاں۔ مگر۔ . . . . . . . . . . . . . ."

کلو پنڈت ابھی بات پوری نہیں کرنے پایا تھا کہ "پٹواری جی" ٹین کا بڑا اسائل (جس میں شاید کاغذ بھرے تھے) ہاتھ میں لئے گھوڑے پر سوار تشریف لے آئے، اور کلو پنڈت اور پرم سکھ مہاراج کو ان کے استقبال کے لئے آگے بڑھنا پڑا،

کلو پنڈت نے اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر جو ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے کہا "فرمایئے پٹواری جی! کیسے آنا ہوا؟"

"بڈھے پٹواری جی، نے ٹین کا ئل دکھا کر کہا کہ "پیمائش کے لئے" اور سنجیدگی کے ساتھ گھوڑے سے اتر پڑے،

## ۲

موضع کھیری میں دو سو خاندان آباد ہیں، یہاں کا مالگذار پرم سکھ مہاراج ہے، ہر سنیچر کو اس گاؤں میں بازار بھی لگتا ہے۔ پرم سکھ مہاراج کی اصلی بیوی سے اولاد نہیں ہے، جسکا اسکو بہت قلق ہے، جوتشی جی بتا گئے تھے کہ "اولاد بہت ہو گی" مگر سات برس ہو گئے، "نہیں ہوئی" اس کی عورت بلا ناغہ پیپل دیوتا کو جل چڑھاتی ہے، ہنومان جی کے مندر میں ہر پندرھویں دن ناریل پھوڑنے جاتی ہے، اور اگر کوئی سادھو یا فقیر کہیں سے گاؤں میں آجاتا ہے تو وہ پرم سکھ کو اسکے پاس ضرور بھیجتی ہے۔ گاؤں کی عورتوں کو اس سے بہت ہمدردی ہے، ہر تہوار کو وہ انہیں بلاتی ہے تو وہ سب مل کر کہتی ہیں "نربدا مائی پٹیلن پر دَیا کرو" پرم سکھ مہاراج کا بہت دنوں سے خیال تھا کہ وہ دوسری شادی کرلے، مگر اپنی بیوی کے خوف سے وہ کرہی نہیں سکتا تھا، بیوی کو جب کبھی خبر ملتی کہ پرم سکھ دوسری شادی کی تجاویز کر رہا ہے، تو وہ پہلے اس کو بہت سمجھاتی تھی کہ میں روز پرماتما سے دعا کرتی ہوں، تم مایوس مت ہو، ایک دن میں کامیاب ہونگی" مگر جب وہ نہیں مانتا تو وہ اٹوائی کھٹوائی لیکر اتنا کہرام مچاتی تھی کہ تمام بستی کی عورتوں کو اسکے منانے سمجھانے کے واسطے آنا پڑتا تھا، پرم سکھ کمزور طبیعت کا آدمی تھا، اس کی عورت کا فقرہ "میں زہر ہی کھالوں گی!" اس کے حق میں اتنا مہیب تھا کہ وہ مارے ڈر کے اپنے تمام ارادوں کو بھول جاتا تھا،

ایک اہیرن کو جو بیوہ تھی مخفی طور پر پرم سکھ نے رکھا تھا۔ جب بہت دن ہو گئے، بالوں میں سفیدی آگئی اور اس کے دانت ہلنے لگے، اس کی ایک آنکھ سے کم نظر آنے لگا۔ اس وقت خدا

نے اہیرن کے ہاں لڑکا دیا، مگر وہ کانا! اس لڑکے کا نام رام پرشاد رکھا گیا، پرم سکھ کی بیوی رام پرشاد اور اس کی ماں کو زہر کی طرح دیکھتی تھی، اسکو معلوم تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر میری تمام دولت کا واحد مالک ہوگا، پرم سکھ کو جب بہت برا لگا اور اسکی گرم مزاجی کے لئے عورت کے طعن و تشنیع ناقابل برداشت ہوگئے، تو اس نے کلو پنڈت سے کہا کہ نیا گھر رام پرشاد اور اس کی ماں کے واسطے بنائے، اور اسکی خور و نوش کا انتظام کرے، پھر اس نے رام پرشاد کے ہاتھوں کے لئے چاندی کے کڑے کانوں کے لئے دو بالیاں بنوادیں، پرم سکھ مہاراج ایک گاؤں کا مالگذار تھا۔ تیس چالیس بیل، گائے، اور بھینسیں تھیں، چھ ہزار روپے نقد ایک ساہوکار کے ہاں اس کے جمع تھے، کلو پنڈت کا پورا نام ہے" کالو رام پنڈت"، مگر لوگ اس کو کلو پنڈت ہی کہا کرتے ہیں، وہ بنارس یونیورسٹی کا کوئی فاضل تو نہیں ہے۔ البتہ تھوڑی بہت ہندی اور برائے نام سنسکرت جانتا ہے، اسکی بیوی، بچے، سب مر گئے، وہ اکیلا ہی ہے، وہ پرم سکھ کا دور کا رشتہ دار ہے۔ پرم سکھ نے اسکو گاؤں کا مختار کر دیا ہے، کھیتی کا کام، گھر کی نگہداشت، نوکروں کی نگرانی، مقدمات کی پیروی، یہ تمام کام کلو پنڈت کے ذمہ ہے، وہ بہت محنتی اور چالاک آدمی ہے۔ گاؤں والے اس کا بہت ادب کرتے ہیں، جب کبھی کسی کو ضرورت ہوتی ہے تو گاؤں کے کسی برہمن کی بجائے اسی کو پوجا پاٹ کے لئے بلاتے ہیں، کلو پنڈت بہت سرد مزاج ہے، وہ پرم سکھ کے غصہ اور تلوّن کو کامیابی کے ساتھ اپنے قابو میں رکھتا ہے، جب پرم سکھ جھڑکیوں اور خفگیوں سے اسکی تواضع کرتا ہے تو وہ "گلابی شربت کے گھونٹ" کی طرح پی جاتا ہے۔ کبھی کبھی پرم سکھ غصہ میں آکر کہہ بیٹھتا ہے "تو یہاں سے نکل جا!" تو کلو پنڈت اپنے دو بچے کچھے پیلے پیلے دانت نکال کر اسکی خفگی کا ازالہ کر دیتا ہے،

## ۳

ہیضہ گاؤں بھر میں پھیلا، لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگے، کوئی گھر نہیں بچا۔ کلو پنڈت نے دس پندرہ روپے کی دوائیں ہیضہ سے بچنے کے لئے منگائی تھیں، مگر افسوس! پنڈت جی کی "پران داتا" اور ڈاکٹر صاحب کا عرق کافور بالکل مٹی ہوگئے اور ہیضہ کی دیوی نے دو ہی دن کے اندر، پرم سکھ کے گھر بھر کی صفائی کر دی، پرم سکھ مرا، اسکی بیوی مری، اسکی سالی مری، رام پرشاد کی ماں مری، اور تین نوکر مرے، کئی مُردوں کو گاڑنے کی وجہ سے کلو پنڈت کو بخار آگیا، پرم سکھ کا کانا لڑکا

رام پرشاد بھی سخت بیمار ہوگیا تھا، مگر وہ کمبخت ایسا سخت جان ہے کہ پندرہ پندرہ قے دست ہوئے، دو دن تک بیہوش پڑا رہا، کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ پھر بھی نہیں مرا اور بالکل تندرست ہوگیا اگرچہ کمزوری کئی دن تک رہی، کلو پنڈت رام پرشاد کو دوا نہ پلاسکا، جس کی وجہ سے کالرا ڈیوٹی کے بنگالی ڈاکٹر صاحب اس پر بہت ناراض ہوتے تھے اور کہتے تھے "شالا لوگ! تم نے ہمیں کھابر (خبر) کیوں نہیں دیا؟"

مرتے وقت پرم سکھ کہہ گیا تھا کہ رام پرشاد کے بالغ ہونے تک کلو پنڈت اسکی سرپرستی کرے اس لئے گاؤں والے اب اسکی بہت توقیر کرنے لگے ہیں۔ کلو پنڈت نے گاؤں والوں کو اپنا جاں نثار بنالیا ہے، اس نے کاشتکاروں کو ایک سال کا لگان معاف کردیا۔ کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کے گھر ضرور جاتا ہے، گاؤں بھر میں باری باری سے میٹھا تقسیم کراتا ہے، اور جب اسکے ہاں کتھا ہوتی ہے، تو چھوٹے سے لیکر بڑے تک کو بلاتا ہے۔ وہ کنوار اور کاتک بھر اپنے گاؤں کے اور آس پاس کے کاشتکاروں کو بونے کے واسطے سستے داموں غلہ دیتا ہے۔ اس کے گھر کے سامنے سے اگر کوئی دولت مند کسان نکلتا ہے تو کلو پنڈت سو کام چھوڑ کر، اسکو چلم ضرور پلاتا ہے البتہ اس کو یہ بُرا لگتا ہے کہ بعض لوگ رام پرشاد کو "پٹیل صاحب" آخر کیوں کہتے ہیں؟ کلو پنڈت کو مالاؤں (تسبیح) کا بڑا شوق ہے۔ سوتے اور جاگتے میں اسکے گلے میں ایک مالا پڑا ہی رہتا ہے، چاند گرہن کے دن وہ ایک گز لمبا موٹے موٹے دانوں کا مالا جپتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ کلو پنڈت کے پاس کوئی تسخیر کا عمل ہے، کیونکہ بڑے صاحب اسے لگا کر تحصیل کے چپراسی تک اس سے خوش رہتے ہیں، جب کوئی صاحب آتے ہیں تو کلو پنڈت بنفسِ نفیس ان کے واسطے انڈے، مرغی، اور دودھ کا انتظام کردیتا ہے، اور وہ ہمیشہ معائنہ کی کتاب (VISITORS Book) میں کلو پنڈت کے حسن انتظام کی رپورٹ درج کر کے جاتے ہیں۔ پولیس یا تحصیل کا اگر کوئی سپاہی آتا ہے تو کلو پنڈت اسی وقت اپنے کسی نوکر کے ہاتھ سے ایک تھالی میں سیر بھر چاول، تھوڑی دال، تھوڑی مرچیں، تھوڑا گھی، تھوڑا نمک اس کے لئے بھجوادیتا ہے، محکمہ بند وبست کے تمام افسر واقف ہیں کہ پٹواری جی کلو پنڈت کی کبھی شکایت نہیں کرتے حالانکہ ہر مہینہ میں ایک دو بار پرم سکھ کی شکایت ضرور ہوا کرتی تھی۔ اسکے شکریہ میں کلو پنڈت

پٹواری جی کے ہاں فصل کے موقع پر کچھ غلہ بھیج دیتا ہے، اور جب وہ پیمایش کی غرض سے رونق افروز ہوتے ہیں تو کلو پنڈت ان کی بیحد خاطر کرتا ہے،

گاؤں میں جو اسکول ہے، اس کے ہیڈ ماسٹر صاحب البتہ کلو پنڈت سے ناراض رہتے ہیں، وہ ہمیشہ کہتے ہیں" مہاراج! تم رام پرشاد کی زندگی برباد کر رہے ہو، اسکو پڑھنے کیوں نہیں جانے دیتے؟" تو کلو پنڈت یہ کہکر ٹال دیتا ہے کہ" رام پرشاد اب سولہ برس کا ہوگیا، اس عمر میں وہ کیا پڑھیگا؟ ہم کسان لوگ اگر پڑھنے میں مصروف ہو جائیں تو کھیتی کا کام کون کرے؟"

گھر کی کھانا پکانے والی برہمن عورت رام پرشاد کو روز تین موٹی موٹی روٹیاں اور ساگ پات دیدیتی ہے، پھر رام پرشاد بھینسیں چرانے لیجاتا ہے۔ لوکروں سے کھیتوں کی جوتائی کراتا ہے کبھی کبھی وہ خود بھی ہل چلاتا ہے۔ ہفتہ میں ایک دن جو بازار لگتا ہے تو وہ غلہ بیچنے جاتا ہے، اگر اتفاقاً رات کو فرصت ملی تو دو چار ہمجولیوں کے ساتھ مل کر وہ بھجن گایا کرتا ہے، گھر میں دس بارہ بھینسوں کا دودھ ہوتا ہے، مگر اس کو ایک بوند نہیں ملتی، اس نے بھی یہ انتظام کر لیا ہے کہ جنگل میں ڈیڑھ دو سیر دودھ دوہ کر خوب مزے سے خود پیتا ہے اور اپنے شرکار کو پلاتا ہے، اس کو پیسے بالکل نہیں ملتے، لہذا بعض دوستوں کی صلاح ہے کہ وہ جب بازار میں غلہ بیچا کرے تو آنکھ بچا کر کچھ الگ رقم نکال لے، چنانچہ اب وہ اس تدبیر کو عمل میں لانے والا ہے، وہ کلو پنڈت سے ہمیشہ ناراض رہتا ہے، کیونکہ کلو پنڈت اس کی خواہش کو بھی پورا نہیں کرتا، جب اسکا باپ اور ماں، سوتیلی ماں، وغیرہ مرے تھے، تو یہ کلو پنڈت کے ہمراہ ریل میں بیٹھ کر پریاگ، کاشی، اور بندرابن گیا تھا، جہاں سے سر مونچھیں، اور ڈاڑھی منڈا کر یہ لوگ آئے تھے،

رام پرشاد کو جغرافیہ کا حال کچھ بھی معلوم نہیں تھا، چنانچہ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ جہاں میں رہتا ہوں اور جو دیہات میں نے دیکھے ہیں اسی کا نام "دنیا" ہے۔ لیکن پریاگ سے واپس آنے کے بعد اسکو معلوم ہوا کہ دنیا بہت بڑی ہے، سال بھر میں صرف دسہرے اور ہولی کے وقت ایک روپے والی موٹی دھوتی اور پانچ آنے گز والی کھادی کی نیم آستین اور

دو پیسے کی ٹوپی رام پرشاد کو دلا دی جاتی تھی، برسات میں وہ ننگے پیر پھرتا تھا۔ گرمی اور جاڑوں میں بارہ آنے کا چار تلے والا جوتا پہنتا تھا، پریاگ اور کاشی میں رام پرشاد نے لوگوں کے فیشن ایبل کپڑے، باریک دھوتیاں، چمکدار بوٹ، اور فلٹ کیپ وغیرہ اشیاء دیکھی ہیں، اب وہ ان سب کا خواہشمند ہے، لیکن بیچارے کو کلو پنڈت کچھ نہیں دلاتا،

۴

یورپ کی حکومتیں تو جنگ و جدل کر رہی تھیں، مگر غلہ، رنگروٹ، اور لڑائی کا چندہ اور اسی قسم کی بیگار دیتے دیتے بیچارے ہندوستان کا دیوالہ نکلا جاتا تھا! ملک کی عام حالت بہت تشویشناک تھی، عالم کیمیائیات اپنے دار التجربہ میں بیٹھے بیٹھے غور کرتے تھے کہ اب گھی میں تین گنی چربی کیوں ملائی جانے لگی ہے؟ سنسروں کے مارے ایڈیٹر اور مالکانِ اخبارات کو نیند نہیں آتی تھی، محکمۂ نہر کے بڑے بابو صاحب دن بھر اپنی بوسیدہ کرسی پر انگڑائیاں لیا کرتے تھے، اور جب شام تک کوئی موکل نہیں آتا تھا تو جھریوں دار چہرے پر سے عینک اتار کر کہتے تھے، "آجکل جیب خرچ نہیں ملتا! کیا سب مر گئے؟" لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں، "امیر افغانستان کی فوج دہلی پر قابض ہو گئی" وثوق کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا، جرمن آلات پرواز سات سمندر پار رات کو فضائے نیلگوں میں منڈلاتے لوگوں کو نظر آتے تھے، بلکہ دوربین حضرات کو ان میں فوج بھی نظر آتی تھی! مردم شناسی کا جنہیں خوب ملکہ تھا انہوں نے "قوزپاشا" کو کلکتہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھ ہی لیا تھا!

"جرمن جیت رہا ہے" یہ خبر ایسی مقبول عام ہوئی تھی کہ کسی کو اس کے خلاف یقین ہی نہ آتا تھا چاہے سرکار (Government Publicity Bureau) بڑی بڑی تصویریں چھاپ کر اپنی فتحیابی کا کتنا ہی یقین دلائے!

تحصیلدار صاحب کسانوں سے "جبری قرضہ" وصول کرتے پھرتے تھے، اور رنگروٹ بھرتی کرنے والے جابجا رنگروٹ بھرتی کر رہے تھے۔

دیہات میں سرکاری آدمیوں کے آنے کی خبر خفیہ پولیس کے سراغرسانوں سے بھی قبل معلوم ہو جاتی ہے، ایک رنگروٹوں کا ایجنٹ جب کھیری میں پہنچا تو باوجود کلو پنڈت پر اعتماد

ہونے کے کوئی ایجنٹ سے ملنے نہیں آیا۔ کلو پنڈت نے بہت ہاتھ پیر مارے، کئی ایک کو بُلایا بھی، مگر کوئی نہیں آیا، البتہ فقیرا جو بہت ڈھیٹھ تھا اور مُدت تک "میونسپل" کی جمعداری کر چکا تھا رنگروٹ کے پاس آیا، کلو پنڈت نے اسکو مکرر سب کے بلانے کو بھیجا مگر ہر جگہ سے جواب ملگیا کہ "گھر میں نہیں ہیں!"، کئی کسان تو "اچھا ابھی آتے ہیں" کہکر گھر میں بیٹھ رہے، شام کو جب رام پرشاد آیا تو کلو پنڈت نے "صاحب وہ لڑکا یہی ہے" کہکر ایجنٹ سے اسکا تعارف کرایا۔

دوسرے دن رام پرشاد اور کلو پنڈت ایجنٹ کو بستی دکھانے لے گئے، پھر اپنے کھیت دکھائے پھر جو نیا کنواں کھدایا تھا وہ دکھایا، جس کی ایجنٹ نے بہت تعریف کی، راستے میں جو لڑکے کھیل رہے تھے وہ ایجنٹ کی خاکی وردی دیکھ کر ایسے ڈرے کہ "ارے گوئیاں (ٹیکہ لگانیوالا) آیلا ہے رے!" کہہ کر وہ بے تحاشا بھاگے،

کلو پنڈت کو ایجنٹ کی ملاقات سے معلوم نہیں کیوں بے انتہا مسرت تھی؟ مارے خوشی کے اس کو آج بھوک بھی نہیں لگی۔ اسکو نہانے، پوجا کرنے، اور ہنومان جی کو پھول چڑھانے کی بھی یاد نہیں رہی، بات بات میں اسکے بتیس دانتوں میں کے پس خوردہ دو دانت نظر آنے لگتے تھے۔ اس کے چہرے پر جو چیچک کے گہرے گہرے داغ تھے، ان میں بہت سُرخی معلوم ہوتی تھی، کلو پنڈت "رادھا کرشن" کہنے والوں پر بہت ناراض ہوتا تھا، مارنے کو بھی دوڑتا تھا، اور دھمکی دیتا تھا کہ خبردار چوروں کا نام ہمارے سامنے مت لو، لوگ جانتے تھے کہ وہ دل سے مانتا ہے، وہ صرف بظاہر چڑھتا ہے، لیکن آج فقیرا نے، اور کئی لڑکوں نے اس کو بہت چڑھایا، مگر وہ کسی کو مارنے نہیں دوڑا، آج وہ اپنے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگانا بھی بھول گیا، آج کسی کام کے نہ کہنے سے نوکروں پر نہ وہ خفا ہوا نہ اسکے ماتھے پر جھرّیاں پڑیں۔ اس نے اپنا صافہ آج جس بے ترتیبی سے باندھا ہے، اس کا احساس تک اسکو نہیں ؛

## ۵

بصرہ کے برطانی کیمپ میں کام کرتے کرتے رام پرشاد کو نو مہینے ہوگئے۔

وہ جتنا زیادہ بکی تھا، اب اتنا ہی کم سخن ہوگیا ہے، دن بھر میں شاید دس پندرہ بار وہ کسی سے بولتا ہو، اسکے ہونٹ ہمیشہ ایسے رہتے ہیں جیسے کسی نے جوڑ کر سی دئے ہوں

اس کا چہرہ بالکل اداس رہتا ہے۔ اب اسکو کبھی ہنسی نہیں آتی۔ البتہ بعض اوقات وہ ٹھنڈے سانس بھرا کرتا ہے۔ رام پرشاد کے سپرد کوئی خاص کام نہیں ہے۔ موقع پر جس خدمت کا اس کو حکم ملتا ہے، وہ طوعاً وکرہاً اسکو کرنی پڑتی ہے، کبھی وہ اور رنگروٹوں کے ہمراہ خچروں کی آہنی گاڑی لیکر دریائی اسٹیشن پر جاتا ہے جہاں سے باروانہ یا بارود، آٹا، اور شکر کی بوریاں لانی پڑتی ہیں بندوقوں کے پارسل، کپڑوں کے گٹھے، تیل کے ٹین لادنے پڑتے ہیں، کبھی وہ خندقیں (Trenches) کھودنے جاتا ہے، کبھی توپخانے کے نکلنے کا راستہ بناتا ہے۔ ہر ایک اتوار کو اسکو قواعد، بندوق کی گرفت، وغیرہ سکھائی جاتی ہے، جس کے بعد اسکو مینجر صاحب کی میز اور کرسیاں پونچھنی پڑتی ہیں، رام پرشاد کے ہاتھوں میں خندقیں کھودنے کے باعث چھالے پڑجاتے ہیں، کدالی ہاتھ میں نہیں لیتے بنتی، مگر مجبوراً اسکو کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ جس دن وہ کام نہیں کرتا۔ اور علالت کا بہانہ کرتا ہے، اس دن کی آدھی تنخواہ کٹ جاتی ہے، اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں کی کڑوی دوا پینی پڑتی ہے۔ اس کو ماہوار پندرہ روپے ملتے ہیں، مگر کُل نقد نہیں ملتے اسکو کہا گیا ہے کہ جب وہ گھر جائیگا اس وقت بقیہ تنخواہ ملجائیگی، وہ سگریٹ پینے کا عادی ہوگیا ہے اس لئے جو کچھ نقد ملتا ہے وہ سب سگریٹ اور دودھ میں صرف ہوجاتا ہے، وہ دودھ کا بڑا چٹورا ہے، اس لئے ہر روز آدھ سیر دودھ عرب لڑکوں سے خرید لیتا ہے، یا کافی شاپ رچائے کی دکان سرکاری) سے جاکر لے آتا ہے، اسکو کھانا سرکار کی طرف سے مفت دیا جاتا ہے۔ جو رسوئی بنانے والے مہاراج ہیں اگر انہیں ایک آدھ روپیہ ماہوار نہ دے تو اسکو بغیر گھی کی دال اور باسی روٹیاں کھانی پڑیں! اس لئے وہ ہر مہینہ کچھ ان کی مٹھی میں چپ چاپ دیدیتا ہے اگر مہاراج ایسا نہ کریں تو "انکے گانجہ" کا خرچ کس مد سے آئے؟ کام تقسیم کرنے والے جو مینجر صاحب ہیں اگر انہیں کچھ دیکر پیر نہ پڑے تو وہ ناراض ہوکر اسکو ایسی خدمت تفویض کردیں جو اس کی شان سے بعید ہے، اسکو گھوڑوں کی لید پھینکنی پڑے، ان کی مالش کرنی، اور انہیں نہلانے لیجانا پڑے! لہذا وہ دو روپے اس مصیبت سے محفوظ رہنے کے لئے مینجر صاحب کو دیکر انکے پیر چوم لیا کرتا ہے۔ رام پرشاد شام ہوتے ہی کھانا کھا کر اپنے کیمپ میں چلا جاتا ہے۔ اسکا کیمپ ساڑھے چار گز عریض وطویل ایک جھونپڑا ہے، جہاں وہ جاتے ہی سوجاتا ہے۔ اس کے

رفقاء بہت چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ہنسے بولے، لڑائی کے تذکرے سنے، مگر وہ کسی کی پروا نہیں کرتا، وہ جاتے ہی کمبل پر پڑ جاتا ہے اور اوڑھنے کے کمبل میں منہ چھپا لیتا ہے لوگ سمجھتے ہونگے کہ رام پرشاد جاتے ہی سو جاتا ہے، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کو کروٹیں بدلتے بدلتے کبھی رات کے تین بج جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے، میں اب یہاں کی تکالیف سے بالکل پریشان ہو گیا ہوں، میں یہاں سے نجات پاؤں وہ دن کب آئیگا؟" جنگ کے ہولناک مشاہدات و تجربات نے اسکو بہت وحشت زدہ کر دیا ہے۔ اسکو یقین ہو چکا ہے کہ "میں اب یہاں سے بغیر مرے نہیں جاؤنگا۔"

اگر کبھی خندقیں کھودنے وہ جاتا ہے، یا فوج کے ساتھ میدانوں میں جانیکا اسکو اتفاق ہوتا ہے، تو وہ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے اس خیال سے کہ "کہیں عافیت کا راستہ ملے اور میں بھاگ جاؤں"، مگر اپنے نگہبان سارجنٹ کا لال لال چہرہ اور نیلی نیلی آنکھیں دیکھ کر اور اس کی نوکدار سنگین کا خیال کر کے، اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ رام پرشاد یا اسکا کوئی رفیق راستے میں کہیں بہک جاتا ہے تو نگہبان سارجنٹ ڈپٹ کر گھور کر کہتا ہے "کہاں جاتا ہے تم" اکثر رنگروٹ بھاگنے کی سازشیں کرتے ہیں، مگر سارجنٹ کے مارے انکی دال نہیں گلتی۔ نیز کئی رنگروٹوں کا فرار ہونے کے سبب کورٹ مارشل ہو چکا تھا، اس لئے کسی کو بھاگنے کی جرأت نہیں ہوتی، رات کو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رام پرشاد کے گال آنسوؤں سے تر ہو جاتے ہیں، کبھی وہ مغلوب الغضب ہو کر ہونٹ چبانے لگتا ہے، کبھی دل میں کہتا ہے، "ہائے رام! مجھے اس کمبخت برہمن نے پھنسا دیا، مجھے بالکل برباد کر دیا! نربدا مائی اسکو کتے کا جنم دے!"، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رام پرشاد اپنا سارا غصہ کلو پنڈت کی خیالی تصویر پر نکالنا چاہتا ہے، اسکو اکثر وطن کی یاد آتی ہے، وہ سوچتا ہے "کلو پنڈت بستی میں مالگذار بنا بیٹھا ہوگا، جب میں دیس جاؤنگا تو اس بڈھے کی جان ضرور لونگا!" کبھی وہ وطن کی یاد کرتے کرتے سو جاتا ہے تو خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ بھجن گا رہا ہے، "یا نربدا اشنان" کرنے گیا ہے، کبھی اسکو نظر آتا ہے کہ وہ اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہے، کبھی یہ دیکھتا ہے کہ اسکا باپ پرم سکھ اسکو پیار کرتا ہے اور کلو پنڈت ہاتھ پیر بندھا کھڑا ہے، بعض وقت اسکو نظر

آتا ہے کہ وہ آم کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا بانسری بجا رہا ہے اور اس کی کالی کالی بھینسیں تیز دھوپ میں گھاس پر بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی ہیں، جب اسکی آنکھ کھلتی ہے تو وہ بہت بیقرار ہوتا ہے۔ کبھی سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔ کبھی کہتا ہے، میں بھینسیں چراتا تھا، موٹے کپڑے اور سوکھی روٹی پر ہی قانع تھا، میں کلو پنڈت کی تمام سختیاں جھیلتا تھا، مگر اس نمک حرام نے مجھے اس حالت میں بھی چین نہ لینے دیا، بھگوان اس کا بھلا کرے، کبھی وہ زار و قطار روتا ہے، اور اپنے ماں باپ کی یاد کرتا ہے، کبھی دوستوں کی یاد کرکے افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے دھرم لال اور نین سکھ میرے دو دوست معلوم نہیں کیسے ہیں؟ انہیں مجھ سے بڑی محبت ہے، معلوم نہیں انہوں نے اپنے جی میں کیا سمجھا ہوگا جب کلو پنڈت کے سمجھانے سے میں راتوں رات بغیر ملاقات کئے ایجنٹ کے ساتھ ناگپور چلا گیا تھا؟ کیا اب ان سے ملنے کا مجھے موقع کبھی نصیب ہوگا؟"

۶

فوجی ہسپتال کے دوسو نمبر والے کمرہ میں رام پرشاد کراہ رہا ہے، آئڈوفارم کی بدبو کمرے سے آرہی ہے۔ اندر آہنی پلنگ بچھا، جس پر ایک گدی، اور اس کے اوپر سفید چادر بچھی ہے یہ مریض ایک کروٹ سے اسی پر لیٹا ہے، پاس ایک چھوٹی میز ہے جس پر ایک کانچ کی بوتل ایک گلاس رکھا ہے، ایک عیسائی دایہ پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھی ہے،

دو دن ہوئے کہ رام پرشاد فوج کے ہمراہ گیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں جدید خندقیں اسکو کھودنی پڑیں، اس دن رام پرشاد کے کان کے پاس سے ایک گولی سنسناتی ہوئی نکل گئی؟ ایکبار اور بچ گیا، مگر قضا کار ایک گولی اس کی ران میں لگی، جس کے صدمہ سے وہ بیہوش ہوگیا، آج اس کا اپریشن ہوا ہے، گولی تو نکل گئی لیکن تکلیف بہت سخت ہے، اسکو تکلیف کا احساس نہ ہونے کے لئے آج دوا پلائی جاتی ہے، رام پرشاد کی صورت بالکل پھیکی پڑ گئی ہے۔ آج اس کی زبان ایسی سخت ہوگئی ہے کہ وہ کوئی لفظ صحت کے ساتھ نہیں بول سکتا، وہ مارے گرمی کے جلدی جلدی سانس لیتا ہے، اس کی آنکھ میں چمک بہت ہے، عیسائی دایہ نے کئی بار گھنٹی بجا بجا کر ڈاکٹر صاحب کو بلایا، کیونکہ رام پرشاد کو بے چینی بہت ہے، وہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ کبھی زور سے ہنستا ہے، کبھی روتا ہے، "وہ میری ماں کھڑی ہے، وہ باپ کھڑا ہے، وہ دیکھو دھرم لال

مجھے لینے آیا! ہاں چلتا ہوں، ٹھیرو ٹھیرو، وہ کچہری کے لوگ کھڑے ہوئے ہنستے ہیں،، وہ بکتا ہے دایہ ہر چند کوشش کرتی ہے کہ رام پرشاد چپ رہے، رام پرشاد کو نیند آجائے، مگر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی،

ڈاکٹر پٹی مضبوط باندھ کر اور دایہ کو ضروری ہدایات کرکے چلا گیا ہے،

رام پرشاد کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے متواتر آرہے ہیں، اس کے ہاتھ پاؤں میں کپکپی ہے، اور وہ اگرچہ ایک موٹا کمبل اوڑھے پڑا ہے تاہم اس کا تمام جسم لرز رہا ہے، اس کا سانس اب رک رک کر آنے لگا ہے، وہ ہچکیاں بہت لے رہا ہے، مارے ہچکیوں کے "ہائے رام ہائے رام" بھی برابر نہیں کہہ سکتا۔

دایہ نے اس کی صورت دیکھی اور غمگین آواز سے کہا، "تم گھبراؤ نہیں، تم بہادر سپاہی ہو، تم تکلیف برداشت کرو، تم ابھی اچھے ہوئے جاتے ہو،،

جو دو ڈاکٹر اس کے پلنگ کے پاس انگریزی میں باتیں کھڑے کرتے ہیں وہ دایہ کی بات سن کر کہنے لگے "رام پرشاد تمہارا ٹانگ اچھا ہو جائیگا۔ تم گھبرائے گا نہیں!"

ان کی باتیں سننے سے رام پرشاد کے آنسو اور زیادہ بہنے لگے، اس کو اپنی غریب الوطنی کا بڑا صدمہ ہے، وہ سوچتا ہے "یہاں میں بالکل اکیلا ہوں، کوئی رشتہ دار نہیں ہے، کوئی دوست نہیں ہے،" پھر جب وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اسکی کمپنی کے رنگروٹوں میں کا کوئی بھی اس کی عیادت کے لئے نہیں آیا تو سخت افسوس اور حیرت ہوتی ہے، وہ اپنے دل میں کہتا ہے "ایسی خود غرض دنیا میں آدمی کس کا بھروسہ کرے؟" پھر خود بخود وہ کہتا ہے،، شاید میرے ہمراہی سپاہیوں کو مہلت نہیں ملی ورنہ وہ ضرور آتے،،

رام پرشاد کو یقین ہے کہ "میں ابھی نہیں مرونگا" مگر پھر بھی خدا جانے کیا اسرار ہے کہ وہ بہت مضطرب ہے، اور حسرت آلود نظروں سے اپنے گردو پیش کی اشیاء کو دیکھتا ہے،

۷

رام پرشاد کا تین برس کا معاہدہ تھا، وہ اب پورا ہو چکا، اس کو گھر جانے کا پروانہ راہداری مل گیا ہے، البتہ جاتے وقت اس سے عہد لیا گیا ہے کہ جب سرکار کو ضرورت ہوگی تو اسکو آنا پڑیگا

گذشتہ گولی لگنے کی وجہ سے اس کی بائیں ٹانگ میں خفیف سا لنگ آگیا ہے۔ اس کے پاس تین خاکی وردیاں ہیں، دو کمبل ہیں، گھٹنوں تک کا خاکی جانگیہ، اور خاکی قمیص پہنتا ہے، کوٹ، اتفاقاً پہن لیتا ہے، فوجی بوٹ اور پٹیاں ہمیشہ باندھے رہتا ہے،

اس کو جیب خرچ کے طور پر چالیس روپے ملے ہیں، اور گھر تک کا ریل کا اور جہاز کا پاس باقی تنخواہ کے اسکو منڈلہ ضلع کے خزانہ سے ملنے کا پروانہ دیدیا گیا ہے۔ اس کو فہمایش کی گئی ہے کہ یہ پروانہ ضلع کے مجسٹریٹ صاحب کو دکھانا تب اسکو تین برس کی تنخواہ ملجائیگی، رام پرشاد نے بصرہ سے روانہ ہوتے وقت آدھ سیر کھجوریں مول لی ہیں۔ اسکا ارادہ ہے کھیری والوں کو تحفتاً تقسیم کرے۔ جب وہ ننگے سر انگریزی وضع کے بالوں میں کنگھی کرکے کھڑا ہوتا ہے تو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے! صرف ایک نقص اس میں ہے کہ ایک آنکھ پھوٹی ہے، وہ سوچتا ہے کہ خدا کی مرضی ایسی تھی، مگر اُس نے اپنے اس عیب کو چھپانے کے لئے آٹھ آنے کا ایک کالے کانچ کا چشمہ خریدا ہے، جس کے لگا لینے سے کوئی تمیز نہیں کرسکتا کہ رام پرشاد کانا بھی ہے، وہ ہمیشہ ہی کالی عینک لگائے رہتا ہے، رام پرشاد عدن سے جہاز پر سوار ہوا اور بمبئی پہنچا، ایک دن قیام کرکے پھر بھوساول جانے والی گاڑی میں روانہ ہوگیا۔

جب وہ گاڑی میں سوار ہوتا تو اپنی فرانسیسی ٹوپی بنچ پر رکھدیتا تھا، اور بیگ اور بستر اوپر رکھکر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ڈبے کے تمام مسافر اس کے مارے چین سے نہیں بیٹھنے پاتے تھے ڈبے کے دروازے ہی پر تو وہ بیٹھتا تھا۔ پھر فوج میں ہونے کا زعم، جہاں کوئی اسٹیشن آیا اور وہ دونوں ہاتھ اونچے کرکے ڈبے کے دروازے میں کھڑا ہوگیا، وہ کسی کو اندر گھسنے ہی نہیں دیتا، اور جو اس کی خاکی وردی اور سیاہ عینک کو دیکھ کر اس سے التجا کرتا کہ "صاحب ہمیں چڑھ جانے دو" تو وہ تحکمانہ لہجہ میں کہدیتا تھا، "دوسرے ڈبہ میں جاؤ!" بچارے اسکی ڈانٹ ڈپٹ سُن کر بھاگتے ہُوئے آگے چلے جاتے تھے،

بصرہ سے آنے کی خوشی میں رام پرشاد اپنے تمام مصائب بھُول گیا ہے، اس کا ارادہ ہے کہ میں پہلے سیدھا ضلع کے ڈپٹی کمشنر صاحب سے جاکر ملوں اور اپنی کتھا اور کلو پنڈت کی دغابازی بیان کرکے کھیری پر قابض ہوجاؤں۔ کلو پنڈت کی فریب دہی پر اس کو غصہ تو بہت آتا ہے،

مگر وہ اپنا دل اس طرح سمجھاتا ہے" اونہہ جانے دو! وہ بڈھا اپنے کئے کی سزا دوسرے جنم میں بھگتیگا" کبھی وہ کہتا ہے کہ "اسی بڈھے کے طفیل میں مجھے بصرہ کی سیر کرنی نصیب ہوئی اور ایسی عزت حاصل ہوئی" اس نے یہ بھی طے کر لیا ہے کہ کھیری والے مجھے دیکھ کر چاروں طرف سے ضرور ہی گھیر لیں گے، اور بصرہ کی کیفیت ضرور ہی پوچھیں گے، تو میں اپنی قلی گیری کا حال کسی کو نہیں بتاؤنگا بلکہ بس اتنا کہدونگا کہ مجھے ترکوں اور جرمنوں سے لڑائی کرنی پڑتی تھی"

رام پرشاد ہر ایک اسٹیشن پر "سرکار بہادر کی جے" ضرور پکارتا ہے، جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ لڑائی پر سے آ رہا ہے +

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

ڈپٹی کمشنر صاحب سے رام پرشاد ملا، انہوں نے اس سے بہت ہمدردی ظاہر کی اور اسکو پانچ سو روپے خزانہ سے دلاتے ہوئے نصیحت کی کہ "تم نے تین برس تک اپنی سرکار کے دشمنوں سے لڑنے کی تکلیف اُٹھائی ہے، اس کے صلہ میں تم کو پانچسو روپے دیئے جاتے ہیں۔ رام پرشاد! میں اُمید کرتا ہوں کہ اس روپے کو اچھے کام میں لگاؤ گے"

ڈپٹی کمشنر نے رام پرشاد کو کھیری پر قبضہ دلا دیا، اور جو سیٹھ جی چھ ہزار روپے دبائے بیٹھے تھے انہوں نے نہ کلو کو ایک پیسہ دیا نہ رام پرشاد کو کیونکہ کوئی رسید نہیں تھی رام پرشاد کے جانیکے بعد کلو پنڈت کی قلعی کھل چکی تھی اسلئے لوگ اسکو "دغا باز" کہتے تھے، مگر جب رام پرشاد گاؤں میں ڈپٹی کمشنر صاحب کا پروانہ لیکر آیا تو لوگوں نے کلو پنڈت کا بہت فضیحتہ کیا، ہزاروں گالیاں دیں، بُرا بھلا کہا، بعض آدمی تو غصہ میں آ کر اسکو مارنے بھی دوڑے،

جس دن رام پرشاد پہنچا اسی دن شام کو کلو پنڈت نے اپنے پرانے کوسے کے صافہ کا پھندا بنا کر ایک درخت میں لٹک کر پھانسی لگا لی، اس کی خودکشی کے دو دن بعد جب اس کا پوسٹ مارٹم (عمل جراحی) کیا گیا تو اس کا کلیجہ دو سیر وزنی نکلا!

حسن عزیز، اسسٹنٹ ایڈیٹر زمیندار

# استعداد

تحصیل علم کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جو انسان عام طور پر درسگاہوں میں سیکھتا ہے، دوسری وہ جو گلستان فطرت کی خوشہ چینیاں سکھاتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ کتب بینی معلومات میں اضافہ کرنیکا نہایت آسان ذریعہ ہے۔ کیونکہ اس صورت سے ہمکو آن واحد میں ہزاروں برس کے واقعات۔ تجربات وغیرہ بلامنت و تکلیف ہر وقت حاصل ہو جاتے ہیں۔ نسل انسانی کے لئے ذخیرہ کتب ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسا کہ ایک متنفس کے لئے حافظہ۔ لارڈ ایبری نے کیا خوب کہا ہے کہ:۔

"کتابیں ہماری مشکلات میں مشیر۔ یاس والم میں آسائش وہ اور ہماری تکلیف کی ساعتوں کو راحت سے بدلنے والی ہیں۔ ہمارے خیالات کو بلند اور ہمارے حوصلوں کو اعلیٰ کرنے والی ہیں"

ایک موقع پر فلچر نے کہا ہے:۔

"مجھے اپنے کتب خانہ سے بصیرت نوازی کرنے دو۔ جہاں میرے بہترین رفیق موجود ہیں، کتب خانہ میری عظیم الشان عدالت ہے۔ جہاں میں گھنٹوں بیٹھا قدیم حکما اور فلاسفروں سے مکالمہ کرتا رہتا ہوں۔ جہاں میں بادشاہوں کے افعال اور انکے درباریوں کی حرکات کو بغور دیکھتا رہتا ہوں۔ اگر انکی فتوحات ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہوتی ہیں۔ تو میں ان سے جواب طلب کرتا ہوں۔ اور دست تصور سے اُن کے مجسموں کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالتا ہوں۔ کیا ایسے مقام سے جدا ہو کر میں غیر یقینی مسرت حاصل کرنے کے لئے کہیں اور جا سکتا ہوں؟ نہیں۔ آپ دولت کی فراہمی میں کوشاں ہوں۔ اور میں اضافہ علم کی جستجو میں غلطاں"

مگر جو باتیں ہم کتابوں کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ انہیں بھول بھی جاتے ہیں۔ البتہ جو تجربات ہم دوسروں کو سکھاتے ہیں۔ ان کو نہیں بھول سکتے۔ مسٹر بوک کا قول ہے:۔

"کہ آجتک کوئی شخص معلموں کی نگرانی میں رہ کر کسی علم یا فن کا کامل نہیں ہوا"

کتابوں کی ورق گردانی سے صحیفہ عالم کا مطالعہ ہمیشہ زیادہ مفید ثابت ہوا۔ کلائیو۔

نپولین۔ ولنگٹن۔ اساک نیوٹن اور والٹر سکاٹ وغیرہ ہونہار طالب علم نہ تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ نہایت کند ذہن تھے۔ مدارس سے نکل کر دنیا میں الوالعزم ہستیاں مانی گئیں۔ جان ہنٹر نے لکھا ہے کہ

"میں بچپن میں بادل اور گھاس کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی دریافت کرنیکی خواہش پیدا ہوئی تھی کہ موسم خزاں میں کیوں پتوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ میں مور دمکس چرند و پرند حشرات الارض وغیرہ کو بغور دیکھا کرتا تھا۔ دوران امور کے متعلق لوگوں سے اکثر دریافت کیا کرتا تھا، جنکو عوام نہیں جانتے یا اُن پر توجہ نہیں کرتے"

مسٹر ورڈ سورتھ کے متعلق بھی انکی خادمہ نے کسی سے یہی کہا تھا کہ:۔

"رہتے یہاں ہیں اور سیکھتے ہیں سبزہ زاروں میں"

دنیا میں جتنی ایجادیں ہوئیں، موجودات عالم کو بغور دیکھنے اور اُن کے خواص معلوم کرنے ہی سے ہوئیں۔ واٹ نے ریل کا انجن نکالا۔ وہیٹ سٹون نے تار کے ذریعے پیغام رسانی کی بنا ڈالی۔ آرک رایٹ نے کپڑا بننے کی کل بنائی۔ فاکس ٹبلٹ نے عکسی تصویر (فوٹو گرافی) ایجاد کی۔ لسٹر نے علوم طبیہ میں اضافہ کیا۔ جینر نے ٹیکہ نکالا۔ اسی طرح بیکن نیوٹن۔ ینگ۔ ڈیوے۔ ڈالٹن۔ ڈارون۔ ٹنڈل اور لائل وغیرہ نے علم طبیعات میں اپنی ذاتی کاوشوں سے گلکاریاں کیں۔ اس سے میری مراد یہ نہیں۔ کہ کتب بینی فعل عبث ہے۔ یا ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس کا وجود فضول ہے۔ نہیں۔ کتابی تعلیم کے ذریعہ ہی سے ہمارے تخیلات میں لطافت بلند پردازی اور پختگی آتی ہے۔ مگر کتابی تعلیم کو تجربات میں لانے کا ذریعہ مشاہدات قدرت ہی ہے۔ اور اس کے بغیر عملی ترقی ناممکن ہے۔

چوہدری غلام حیدر

# تخیلات

"رات ہوگئی ہے، دُنیا کے پُرشور ہنگامے تاریک خاموشی میں غرق ہو چکے ہیں۔ ایسے وقت میں اے راگی! تو کیا گا رہا ہے؟"

"میں گا رہا ہوں محبت کے ترانے۔

"کیونکہ میری زندگی محبت کی جلوہ ریزیوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہے۔

"میں گا رہا ہوں خوشی کے گانے۔

"کیونکہ یہ شئے میری کتاب زندگی سے حرف غلط کے مانند چھیلی جا چکی ہے۔

"میں شباب کی سحر کاریاں گاتا ہوں۔

"کیونکہ بڑھاپے کی سرد اُنگلیوں نے میرے سیاہ بالوں میں سفیدی پھیر دی ہے اور میرے سینہ میں تڑپتی ہُوئی حسرتیں ذبح کر دی ہیں۔

"میں قہقہوں کے اشعار گاتا ہوں۔

"کیونکہ میری آنکھیں ہمیشہ آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔ اور میرے ہونٹ حقیقی ہنسی کے لئے ترستے ہیں۔

"مجھے اگر محبت، مسرت، شباب اور قہقہوں کی دولت نصیب ہوتی تو میں اسوقت کسی اور عالم میں ہوتا۔ اور تم مجھ سے آکر یہ سوال نہ کرتے۔ کہ تم اس وقت کیا گا رہے ہو؟"

---

آہ! میں کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے صرف پارس کی تلاش ہے۔

میں عالیشان دوکانوں میں گیا۔ وہاں بیش قیمت کھلونے تھے، شیریں پھل تھے، پُر ذائقہ مٹھائیاں تھیں ـــــــــ مگر میں کچھ نہیں چاہتا، مجھے صرف پارس کی تلاش ہے،

پھُولوں میں بُو ہے، نوعمر نازنینوں میں حُسن۔ مگر دُنیا کے یہ دونوں تحفے ناپائیدار ہیں میری میری آوارہ نگاہوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ میں انکو دیکھتا ہوں اور بیزار

ہو جاتا ہوں۔

آہ! میں کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے صرف پارس کی تلاش ہے۔

میں دُنیائے کہکشاں میں گیا، وہاں روشنی تھی۔ میں آگے بڑھا، وہاں نغمہ تھا۔ پیچھے ہٹا، پہاڑوں پر صحت کھیلتی تھی، سمندر کے پانیوں میں موتی چمکتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک شئے روحوں میں ہلچل مچا دیتی ہے اور حریص دنیا کے خود غرض لوگ ان کے حصول کے لئے دیوانہ وار کشمکش میں مصروف ہیں۔

لیکن آہ! میں کچھ نہیں چاہتا، مجھے صرف پارس کی تلاش ہے۔

میرا لوہے کی طرح گرم دل ماگھ کے پانی کے مانند یخ ہوگیا۔ اور اُڑتی ہوئی اُمنگیں سڑک کی گرد کی طرح بیٹھ گئیں ــــــ میرے چاروں اطراف میں تاریکی یاس تھی، اماوس کی رات سے زیادہ اندھیری۔ معاً کسی غیبی آواز نے پوچھا۔ مایوس آدمی! تو کیوں اُداس ہے۔

آہ! میں کچھ نہیں چاہتا، مجھے صرف پارس کی تلاش ہے۔

اتنے میں دور، فاصلے پر ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ دکھائی دیا جیسے تاریکی یاس میں شعاع اُمید۔ میں نے تھکے ہوئے پاؤں سے یہ فاصلہ طے کیا۔ اور وہاں پہنچ گیا ــــــ یہ ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا۔ میں بے تحاشہ اندر چلا گیا۔

اور وہاں۔ اُس جھونپڑے کے ایک کونے میں میری سیماب کے مانند بے قرار آنکھوں نے کچھ دیکھا۔

یہی پارس تھا۔

سدرشن

# نغمۂ محبّت

اگر میں تجھ سے محبت کرتی اور تو مجھ سے پیار کرتا! تو یہ چھوٹی سی دُنیا کس قدر خوشنما اور دلفریب نظر آتی؟ آفتاب عالمتاب کی روشنی، فرحت انگیز گھڑیاں، گنبدِ گردوں، اشجار پرند اور گلزار پُر بہار کے گلہائے رنگارنگ یہ تمام لوازمات ہماری مسرت کامل کے ایک حصہ ہوتے اور غم والم کی کوئی بھی علامت ہماری زندگی کے شیریں ترنم میں بدمزگی نہ پیدا کرتی۔

کیا یہ سچ ہے کہ طالب و مطلوب دل میں ایک دوسرے سے خاموشانہ ہمکلام ہوا کرتے ہیں پھر میری اشکباری کا جواب کیوں نہیں آتا؟ میری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟ بلبل نے کہا۔ پیارے سب محبت بار آور نہیں ہوا کرتی اور نہ تمام اُمیدوں کا گل شگفتہ ہوتا ہے،

ایک گلگشتِ چمن، ایک محبت آمیز مصافحہ ایک پُر لطف ہم آغوشی، اور مقدر سے ایک فقط ایک لمحہ روشن اور کامل خوشی کا چھین لین۔ ستارے غروب ہوتے جارہے ہیں۔ آہ! اب دم بھر میں قافلہ چلدیگا، آہ! تجھے خبر نہیں کہ میری ساری زندگی تیرے بغیر ایک زندہ علامت استفہام ہے، سراپا ایک شوقِ جستجو ہے، ہمہ تن ایک صدائے طلب ہے۔ آ میں اور تو دونوں مل کر اپنی اپنی نامرادیوں پر آنسو بہائیں اور رشتۂ غم میں دُرہائے اشک پرو کر ہار بنائیں اور بھینچ کر کلیجہ سے لگائیں کیونکہ موت کی متلاطم فوج جلد بلکہ بہت جلد سب کا نام ونشان مٹا دیگی +

سنسان اندھیری رات ہے اور دریا کا کنارہ۔ کالی کالی گھٹائیں جھکی پڑتی ہیں۔ ہوا زور سے فراٹے لے رہی ہے میں حیران کنارے پر کھڑی ہوں اور تو دریا کے پار رہتا ہے۔ لہریں اونچی اونچی ہوکر کناروں سے ٹکراتی ہیں لیکن کوئی لہر ایسی نہیں آتی جو مجھے اپنے کندھوں پر اُٹھا کر تجھ تک پہنچا دے تیری بانسری کی آواز دریا کے پار سے ہوا کی موجوں پر سوار ہو کر میرے کانوں تک پہنچ رہی ہے اور میرا دل حقیقی خوشی سے لبریز ہو رہا ہے۔ اس لئے اے بانسری بجانیوالے تو کنارے سے دور نہ ہٹ جانا ورنہ میں اس اندھیری پُر شور رات میں اپنے آپکو دریا کی بے درد موجوں کی نذر کردونگی اور پھر تجھے ابد کے ناپیدا کنار سمندر تک میرا سراغ نہ مل سکیگا۔

(سروجنی نائیڈو) افتخار رسول بدر

# محفلِ ادب

زبان جسم ہے اور خیالات اُسکی رُوح ہیں۔ کسی مُلک کی تہذیب کی ترقی کے لئے صرف یہ ہی کافی نہیں ہے کہ مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن مضامین میں تعلیم دیجائے وہ قومی اور ملکی ضروریات کے لحاظ سے مقرر کئے گئے ہوں۔ نصابِ تعلیم کوئی ترکہ نہیں ہے جو ایک نسل سے دوسری کو وراثت میں ملتا ہو۔ بلکہ ہر قوم اور ملک کی ہر نسل کو اپنے نصاب تعلیم کو از سرِ نو ترتیب دینا ضروری ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اہلِ ملک اور اہلِ قوم اس سے واقف نہیں۔ قدیم درسگاہوں میں اب تک درس نظامیہ کی پابندی ہے اور جدید انگریزی مدارس اور کالجوں میں تمام علومِ مشرقیہ "ٹکسال باہر" خیال کئے جاتے ہیں۔ محض علوم مشرقیہ اور عربی کی قدیم تعلیم اس زمانہ میں کئی وجوہ سے غیر مفید اور نقصان دہ ہے۔ عربی تعلیم علوم جدیدہ کی واقفیت بغیر قوم کے حق میں بجائے آبِ حیات کے زہر ہلاہل اور سمِ قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ جب تک علوم مشرقیہ کا مطالعہ تنقید اور نکتہ چینی کی نگاہ سے نہ کیا جائیگا اور کھرے کو کھوٹے سے جُدا نہ کیا جائیگا علوم مشرقیہ میں جد وجہد سے بجائے آزادانہ اجتہاد کے غلامانہ تقلید اور بجائے علمی ہمت کے علمی پست ہمتی پیدا ہو گی کون نہیں جانتا کہ علوم عربیہ اور مشرقیہ کے بہت سے حصے جدید تحقیقات کی رُو سے غلط ثابت ہو چکے ہیں پس جب تک طالبعلم کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ غلطیاں کیا ہیں اور وہ اُن سے اجتناب کر سکے، علوم مشرقیہ کی تعلیم نیم جہالت نہیں تو کیا ہے؟ ہم ایسے سیاسی اور تمدنی حالات میں گرفتار ہیں جہاں زمانے کے ساتھ ساتھ حرکت نہ کرنا موت کا مترادف ہے۔ جسٹس امیر علی اپنی یادگار وقت تصنیف میں فرماتے ہیں:—

"جو قوم اپنے مردہ زمانۂ ماضی کو فرسودہ عبا میں ڈھانپنے کی کوشش کرتی ہے اُس کے نصیب میں اوّل ہی سے صفحۂ ہستی سے مٹنا لکھا ہے"

چونکہ زمانہ کو محض قدیم علوم کی ضرورت نہیں یہ علوم وجہ معاش میں بھی بہت کم

مدد دیتے ہیں۔ آج کل دُنیا کی نعمتوں اور مُلکی اور قومی آسایش کا مدار تعلیم جدید پر ہوگیا ہے۔ جسٹس شاہ دین مرحوم لکھتے ہیں:-

"وجاہت ظاہری لازمی ہے۔ اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں بلکہ یہ مجموعہ ہے مُسلمانوں کی صورتوں کا اگر مسلمانوں کی صورتیں پاکیزہ ہیں، لباس عُمدہ اور شاندار ہیں، چہرے اُداس نہیں بلکہ ارغوانی ہیں، بشرہ سے آثار جاہ وجلال پائے جاتے ہیں تو اسلام کی عزت ہے اور اگر وہ پھٹے حالوں میں ہیں، بھُوکے پیاسے ہیں، مکرر دردناتوان ہیں اور دُنیا میں اُنکی کوئی توقیر نہیں تو اسلام کی ذلت ہے، دین و دُنیا کہنے کو چاہے الگ ہوں مگر دراصل لازم و ملزوم ہیں - بلا ترقی دُنیاوی ممکن نہیں کہ دین میں شان و شوکت پیدا ہو سکے"

لیکن جہاں قدیم تعلیمیافتہ گروہ کا قدیم علوم کو تمام جدید تحقیقات علمی سے بالا خیال کرنا بیجا ہے وہیں جدید تعلیمیافتہ گروہ کا جدید علوم کی خواہ مخواہ پرستش کرنا بھی غلط ہے، جدید علوم وفنون معاذاللہ وحی خداوندی نہیں ہیں جنھوں نے قدیم علوم کا دفتر مٹادیا ہو۔ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مغربی علوم ہی جو جدید ہیں تحصیل کئے جانے کے مستحق ہیں اور جدید کو چھوڑ کر قدیم میں وقت صرف کرنا تضیع اوقات ہے اُن کو باوجود تعلیم پانے کے جاہل سمجھنا چاہئیے جس مغرب کے آستانہ پر اس خیال کے لوگ شبانہ روز سجدہ گزار ہیں وہ مشرق ہی کا ادنیٰ شاگرد ہے۔ جو بات قدیم مصری کاہن سائس نے یونانی مقنن سولن سے کہی تھی وہ نہایت سبق آموز اور ہمارے حسب حال ہے:-

"اہلِ یونان تم ہمارے سامنے بچے ہو۔ افلاطون جس پر تم کو ناز ہے ہمارے ہی مکتب کا فرزند ہے۔ تھیبس کے دبستان ہی میں تم سب نے تربیت پائی ہے۔ تمہارا فیساغورثی فلسفہ ہم ہی نے تمکو تعلیم کیا ہے اور تمکو جو عقل و دانش سے عاری تھے ہم ہی نے غور و فکر کے جوہر سے مزین کیا ہے تمہارا فلسفۂ ابتہاج اور تمہارا فلسفۂ غم ہمارا ہی عطا کردہ ہے - ہم ہی نے تمکو رونا اور ہنسنا سکھایا ہے۔ الف سے لیکر یے تک جو کچھ تمہارا سرمایۂ ناز ہے ہمارا ہی دیا ہُوا ہے" (اردو)

---

درسِ محبت۔ محبت ایک جزو ہے روح کا۔ رُوح کی طرح محبت بھی ایک شعلۂ اُلوہیت

ہے، رُوح کی طرح محبت بھی غیر فانی ہے اور ناقابل تجزیہ، وہ ایک نقطۂ آتشیں ہے جو ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ وہ غیر محدود ہے اور غیر فانی، نہ اُسے کوئی چیز محدود کر سکتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے بجھ سکتی ہے، ہم اسے اپنے مغز استخواں کے اندر جلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، اور آسمان کے عمق میں اس کی شعاعوں کو منور،

---

محبت میں ایک نوع کی طفولیت ہے اور دوسرے جذبات میں چھوٹا پن، پھر شرم ہے ان جذبات پر جو انسان کو چھوٹا بنا دیں۔ اور عزت ہے اس جذبہ کے لئے جو اسے بچہ بنا دیں،

---

تم اگر پتھر ہو تو سنگ مقناطیس بننے کی کوشش کرو۔ تم اگر درخت ہو تو لچکدار بنو، تم اگر انسان ہو تو محبت کرنا سیکھو،

---

تم اگر اذیت میں ہو، اس لئے کہ تم محبت کرتے ہو، تو اور زیادہ محبت کرو، کیونکہ محبت میں مرجانا محبت کے ساتھ زندہ رہنا ہے،

---

محبت کے لئے کوئی چیز کافی نہیں، ہمکو مسرت حاصل ہوتی ہے تو ہم فردوس کی خواہش کرتے ہیں۔ ہمکو فردوس حاصل ہوتی ہے تو ہم کونین کی آرزو کرنے لگتے ہیں، اے وہ لوگو جو محبت کرتے ہو، سب کچھ محبت ہی میں ہے۔ اس کے پالنے میں ذرا فراست سے کام لو،

(الہلال دہلی)

---

# خیالاتِ پریشاں

(۱)۔ چور کو اس لئے سزا دیجاتی ہے کہ ساہوکار کو باقاعدہ استحصال زر میں سہولت بہم پہنچے ؛

(۲)۔ خوشامد سبھوں کو بھاتی ہے مگر اسکا اقرار کوئی نہیں کرتا اور اقرار کرنا سوسائٹی کا گناہ ہے۔ کیا اظہار واقعیت سوسائٹی کا گناہ ہے ؟

(۳)۔ سرکس دیکھنے کا رجحان یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ انسان اب تک بوزینہ نسلی کو بھولا نہیں +

(۴)۔ ملک کے چند تجربہ کار اور لایق اخبار نویس اگر اڈیٹوریل کالم لکھنا موقوف کر دیں تو ۹۹ صدی پالٹیشنوں کی پیداوار رک جائے +

(۵)۔ امریکہ اس لئے دخت رز سے بائیکاٹ کرتا ہے کہ وہ باہوش رہ کر ہلاکت آفرینی اور مردم کشی کے لئے بحث میں کافی گنجایش پیدا کرے +

(۶)۔ باوجود جنسی تبائین کے طبعی اتحاد کی بہترین نظیر بدصورت بیوی کی وفادارانہ خدمت اور ماڈریٹ اصحاب کی بے معنی نقل وحرکت کے درمیان رشتۂ یکسانیت ہے +

(۷)۔ اوصاف ذیل کا حامل لیڈر کامل ہوتا ہے، جو سیال مادہ کی طرح وقت کے قالب میں ڈھل سکے، جو حکومت اور حکام کو بے نقط سنا سکے،

جس کی کوئی ذاتی رائے نہ ہو مگر ساری دنیا کے لئے پالیسی ڈکٹیٹ کرے +

جو فلسفہ اخلاق اور احکام مذہبی میں سیاسی ضامن ڈال کر مناسب موقعہ لچک پیدا کر سکے +

جو سرکاری عزت کھو کر ملک میں عزت پیدا کرے یعنے صرف حب جاہ کا مرکز بدل جائے +

جو ناقابل عمل تحریک پر عمل درآمد کے لئے اصرار کرے،

اور اخیر میں قومی اور ملکی جذبات کو ایوان حکومت کی رسائی کے لئے زینہ بنائے،

(۸)۔ ایک فاترالعقل انسان کو چھٹی صدی کے مسلمانوں نے مذہبی نقطہ نظر سے کیا پوزیشن دیا ؟ کنسرویٹو پارٹی نے مغلوب الغضب ہو کر سولی دیدی۔ اور لبرل جماعت نے اسکو معذور خیال کیا "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ خورند سبوکش" یہ ہاؤس آف کامنس کا فیصلہ تھا۔ مگر جناب اکبر ۶ سو برس بعد گنگا جمنا کے سنگم سے ارشاد فرماتے ہیں ؎

حضرت منصور انا بھی کہہ رہے تھے حق کے ساتھ
دار تک تشریف فرمائیں گر اتنا ہوش ہے

(جادو)

منجملہ اُن جدید اور نئے الفاظ اور محاورات کے جن کو یورپین تمدن نے ہندوستان میں پیدا کیا ہے لیکن یہاں اُنکے کوئی معنی نہیں حقوق نسوان کا لفظ ہے، یورپ کی عیسائی قوموں میں تو اس لفظ کے بے انتہا معنی ہیں، لیکن مسلمانوں کی زبانوں پر آکر یہ لفظ معنی کی ممنونیت سے بے نیاز ہوگیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یورپ کے مسیحی فرقوں کے مذہب میں، عورتوں کے حقوق، فرائض اور واجبات کی مطلق تفصیل بلکہ ذکر نہیں، زن و شوہر کے تعلقات اور اُنکی نوعیت، نفقہ، نکاح، طلاق، عدت، مہر، وراثت، ترکہ، ملکیت اور دیگر مذہبی، تعلیمی، معاشرتی، مالی اور سیاسی حقوق و فرائض کا وہاں نام و نشان بھی نہیں، اس لئے جو کچھ وہاں ہے وہ سلطنتوں اور پارلیمنٹوں کے قوانین ہیں، جو ہر روز بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، اس لئے جدید تعلیم کی اشاعت اور روشن خیالی کے بعد لامحالہ وہاں کی عورتوں کو سلطنتوں اور پارلیمنٹوں سے لڑ لڑ کر وصول کرنا پڑا اور پڑ رہا ہے، بخلاف اس کے اسلام نے ہر چیز کی قانونی اور عملی تفصیل کر کے عورتوں کو اُن کے ہر قسم کے حقوق اول ہی روز مرحمت، اور اپنے پیرووں کی ہر دو جنسوں کے حدود مقرر کر دیئے ہیں،

---

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ مذہب نے بجائے خود گو وہ حقوق عطا کر دیئے ہیں، لیکن عملاً رسم و رواج اور قدیم اصول معاشرت، اور مردوں اور عورتوں کی جہالت اور ناواقفی نے ان کو ہم سے سلب کر لیا ہے، اس لئے ان کے حصول کے لئے، جدوجہد کی حاجت ہے، ہم اس کے جواب میں کہینگے کہ یہ سچ ہے، لیکن اُن کے حصول کے لئے جدید یورپین تمدن کی اشاعت خواتین فرنگ کی کورانہ تقلید ہیچ، ایوننگ واک، ڈنر، بال، سینما، تھیٹر، بے نقابی، اونچی ایڑی کے بوٹ، ریشمی موزوں، لمبی نازک چھتریوں، لیونڈر، سینٹ، اور پوڈر، مردوں سے آزادانہ میل جول اور انگریزی اسکولوں کے سسٹم کی تعلیم، اور ہر مسئلہ کے جواز کے لئے خواتین فرنگ کے اخلاق و آداب کے نظائر پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہ یورپین تمدن کے چوکھٹ پر سر رکھنے کی حاجت ہے، جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ کتاب و سنت سے اور سلف خواتین اسلام کی عملی زندگیوں سے ان تاریکیوں کو دور کرنے کی کوشش کیجائے، ہماری خواتین شوق سے علم

حاصل کریں۔ لیکن اس لئے نہیں کہ یورپ کی عورتوں میں تعلیم پھیلی ہے، اس لئے ہماری خواتین میں بھی پھیلنا چاہیئے، بلکہ اس لئے کہ اسلام نے علم کی طلب ہر مرد و زن پر فرض کی ہے، وہ شوق سے تعلیمگاہوں میں جائیں، مجالس میں تقریریں کریں غزوات اور لڑائیوں میں شریک ہوں، مساجد میں نمازیں ادا کریں، سیاسی، تعلیمی، اخلاقی، جد و جہد میں حصّہ لیں، مگر اسلئے نہیں کہ آج لعبتان فرنگ کا یہ طرز عمل ہے، بلکہ اس لئے کہ عفیفان اسلام کے مقدس کارنامے اس کے لئے ثبوت اور شہادت ہیں،

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

(معارف)

---

رباعی

آبِ خنک از شربتِ انگوری بہ

زنِ زشت وفادار زصد حوری بہ

ایں نکتہ شنیدیم زپیرانِ عراق

صحبت کہ بعزت نبود دوری بہ

# حصۂ نظم

## خطاب

جناب علامہ سر محمد اقبال

جستجوئے پیہم باد صبا آموختی | یا دل بے مدعا را مدعا آموختی
روشناس خندہ کردی غنچۂ پژمردہ را | بلبل خاموش را عشق نوا آموختی
حسن را آگاہ کردی از بہار جنس خویش | سادۂ را عشوہ و ناز و ادا آموختی
تشنہ کامے را نشان دادی ز آب زندگی | بے بسے آزردہ را آہ رسا آموختی
راندۂ درگاہ وقت و ہمچو خاک افتادہ را | سرمۂ تسخیر دادی کیمیا آموختی
قطرۂ شبنم ز فیضت پارۂ الماس شد | فانئ را سر قانون بقا آموختی
قائل اعجاز تو شد واعظ اے پیر مغاں | مسلم کافر منش را یا خدا آموختی
خواجۂ مغرور را آگاہ کردی از جفا | بندۂ مزدور را رد بلا آموختی

زندہ باد اے شمع مہر افروز مشرق زندہ باد!
ہمچو قرآن نقش کلکت تازہ و پائندہ باد!!

امین حزین

---

## مثنوی "عروس وحدت"

"جناب گویا جہاں آبادی کی زیر تصنیف مثنوی کے چند دلکش اشعار شائع کئے جاتے ہیں، مثنوی کے اس نمونہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مثنوی کس پایۂ کی ہو گی یہ سلسلہ شائع ہوتا رہیگا"

غنچۂ صبح خیز میں شکل شمیم کون ہے؟
نکہت عطر بیز میں روح نسیم کون ہے؟

کِس کا خمارِ حُسن ہے ساغرِ ہر دماغ میں ؟
کِس کی بہارِ حُسن ہے ہر دلِ باغ باغ میں ؟

---

کِس کی شرابِ عشق کا جوش وخروش دل میں ہے؟
کون برنگِ نامیہ عنصرِ آب و گِل میں ہے؟

---

ساقی و جام و مے ہے کون، ابر و بہار و ماہ میں؟
سوز و غم و الم ہے کون، شیون و اشک و آہ میں؟

---

چشمِ خیال سے نہاں محفلِ راز کس کی ہے؟
محفلِ عالمِ خیال، محفلِ ناز کس کی ہے؟

---

پوچھے یہ طور سے کوئی، کس نے تجھے جلا دیا؟
کس کے شرارِ حسن نے شعلہ فشاں بنا دیا؟

---

تارو! خموش کیوں ہو تم ڈوبے ہو کس خیال میں؟
بھولے ہوئے ہو آپ کو محو ہو کس جمال میں؟

---

غنچو! تمہیں بتاؤ کچھ پھُول ہیں کس لئے خموش؟
پھُولوں کے بھی اُڑا دئے بادۂ بیخودی نے ہوش؟

---

پھُولوں میں رنگ و بو ہے کون، نظروں میں جستجو ہے کون؟
آئینہائے شش جہت دیکھئے خوبرو ہے کون؟

شمس و قمر کے دور میں مرکزِ دَور کون ہے؟
کیجئے غور ہے "وہی" دیکھئے اور کون ہے؟

---

"خال و خط و شبیہِ دوست ہیں نئے ہر نگاہ میں"
"رنگِ جمال ہے نیا ہر نئی جلوہ گاہ میں"

---

"حسن ہے اور حجاب ہے، مہر اور سحاب ہے"
"جوشِ تموّج خودی مانعِ التہاب ہے"

گویا جہاں آبادی

---

# ایّامِ گذشتہ کی یاد

اے نواحِ کانگڑہ! میرے گلستانِ عدن
جانفزا تیری ہوا تھی۔ تیرے منظر سحر فن
وہ سرِ کہسار سے سرسبز میدان کی ہوا
آبِ سیمیں کے کنارے۔ بستیاں رشکِ ختن
آہ ندی کا وہ فرطِ جوش سے گانا ملار
میری آنکھوں نے جو برسائے کہیں دُرِّ عدن

---

وہ سماں کچھ یاد ہے تجھ کو حصارِ کانگڑہ!
جب ترے کھنڈروں پہ صبحِ آخریں تھی خندہ زن
میں یہ سمجھا اُس پری نے خلد سے بھیجا پیام
جب ہمالہ پر ہوئی قوسِ قزح پرتو فگن
چاندنی راتیں۔ گلابی چوٹیاں کہسار کی

نیلا نیلا آسماں! وادی کا اخضر پیرہن!

دل کو بہلاتی ہے میرے ان پرستانوں کی یاد
خوں رُلاتا ہے مجھے جب سیلئے چرخِ کہن

آہ! کوہستانِ باشوکت! مرا دیرینہ دوست
کچھ عجب منظر تھا جس کی چوٹیوں کا بانکپن

اب نظر آتا نہیں استادہ۔ وہ سمتِ شمال
جنت الماوےٰ کی نُورانی قبا زیبِ بدن

گلشنِ دُنیا میں اب بُوئے وفا باقی نہیں
چاندیں ہوتا کسی وادی میں برگِ یاسمن!

"چاند" ردہتکی

---

# جذباتِ عالیہ

## آزاد سہارنپوری

اے کاش خبر ہوتی، تو دل سے بھلا دیگا
اے کاش سمجھ سکتے، تو دل کے دغا دیگا

سچ ہے کہ ترا سودا ہر خبط مٹا دیگا
حق ہے کہ ترا ملنا اللہ سے ملا دیگا

اک دن گلۂ غفلت سُننے کو ترسیئے گا
اِک دن الم فرقت کچھ دے کے سُلا دیگا

تم جبر کئے جاؤ، ہم صبر کئے جائیں
اللہ تو منصف ہے اللہ جزا دیگا

اُمیدِ سکوں رخصت تسکین دردِ رخصت
اب درد کی باری ہے، اب درد مزا دیگا

اک روز دلِ رہزن، خود راہ نما ہوگا
اک روز یہی دشمن، منزل کا پتہ دیگا

درویش جب آنکلے، آواز لگا نکلے
درویش کو بھی سمجھو، درویش دُعا دیگا

آزاد گدا مشرب مینا سے غرض مطلب
کوئی ہمیں کیا دیگا دیگا تو خدا دیگا

## برق دہلوی

اے عکسِ حسنِ جاناں عالم فروز تو ہے
ذرّوں کے آئینوں میں آنکھوں کے روبرو ہے

پژمردہ زخم دل میں قاتل کی آرزو ہے
بکسی ہوئی کلی میں کچھ تازگی کی بو ہے

چشمِ کرم ہو تیری تو قابلِ رفو ہے
صد چاک سو جگہ سے دامانِ آرزو ہے

پردے میں منہ چھپا کر، در پردہ روبرو ہے
پیدا بسانِ گل ہے۔ پنہاں برنگِ بو ہے

اجڑے ہوئے چمن کی یہ پھول ہے نشانی
پہلو میں دل کے بدلے اب داغِ آرزو ہے

آساں نہ ہوگی مشکل، دشوار ہے یہ منزل
نازک ہے دستِ قاتل پتھر میرا گلو ہے

غرقاب کیا کریگی تو مجھکو تیغِ قاتل
طوفانِ آب تیرا ہے بھی تو تا گلو ہے

محشر میں بھی ہیں مجھ پر نظروں کے تیز خنجر
او فتنہ ساز! یہ بھی کیا محفلِ عدو ہے

گن گن کے لونگا تجھ سے جور و ستم کے بدلے
ہے آج روزِ محشر اب میں ہوں اور تو ہے

قدرت کے زخمیوں تک سوزن کی کیا رسائی
چاکِ قبائے گل کب شرمندۂ رفو ہے

اٹھے دوئی کا پردہ، تو حل ہو یہ معمّہ
تو ہے وہی جو میں ہوں میں ہوں وہی جو تو ہے

چار عنصروں کا ہوں میں مجموعۂ پریشاں
ہستی مری فنا کی تصویر مو بمو ہے

ٹپکا ہے چشمِ تر سے بن کر جو اشکِ خونیں
یہ برق لختِ دل ہے، یا خونِ آرزو ہے

## اکبر حیدری

دیکھا تھا جس کو خواب میں ہائے وہ خواب کیا ہوا
زندگی میری کیا ہوئی۔ میرا شباب کیا ہوا

حسن و ہوس بہم ہوئے عشق نے سر جھکا لیا
ضبطِ وفا پکار اٹھا۔ "کہئیے جناب کیا ہوا"

یہ تو بتا کہ عشق کے مرحلے کتنے طے ہوئے
دل کی حقیقتیں سنا۔ چشمِ پُر آب کیا ہوا

جس کی صدا پہ سر دھنوں جسکی نوا پہ جان دوں
مطربِ خوش گلو بتا اب وہ رباب کیا ہُوا

چارہ گرو ہٹو ذرا۔ ہوش ہیں۔ میں تو آگیا
یہ بھی کسی کو علم ہے زیرِ نقاب کیا ہُوا

ساقی کی چشمِ مست تھی۔ مستِ مئے الست تھی
دل کی مجھے خبر نہیں۔ خانہ خراب کیا ہُوا

اکبر غم نصیب کہہ۔ کہہ یہ غم عجیب کہہ
تیری کتابِ زیست سے دوسرا باب کیا ہُوا

## تسلی

ہجوم یاس سے دل بے قرار بھی تو نہیں
وہ کیسے آئیں یہاں انتظار بھی تو نہیں

جو دینے ہی پہ تُلا ہے تو زہر دے ساقی
وہ گل نہیں نہ ہو ظالم بہار بھی تو نہیں

خلافِ وعدہ نہ ہوگا یقین کون کرے
ہزار بار ہُوا ایک بار بھی تو نہیں

جنونِ عشق ترے سر چڑھاتے ہم سہرا
غضب ہے پیرہن تار تار بھی تو نہیں

مری بلا سے جو غیروں پہ مہربانی ہے
میں کشتۂ ستم امیدوار بھی تو نہیں

الٰہی ایسی اندھا دھند کیوں فریفتگی؟
کچھ ایسا اُس پہ مجھے اعتبار بھی تو نہیں

جو ایک دو ہوں ستم تو گلا کرے کوئی
حساب بھی تو نہیں ہے شمار بھی تو نہیں

ستم اُٹھائیں وفادار کس سہارے پر
وہ محوِ ناز ذرا شرمسار بھی تو نہیں

الٰہی کوئی تسلی کا کیوں نہیں پرساں
جہاں ہے یہ کوئی روزِ شمار بھی تو نہیں

# فہرستِ مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء

**جلد ۴** — **نمبر ۶**

## نثر



## نظم



انور کاتب چوک متی لاہور

# شذرات

اس ماہ کے ختم پر ہمایوں اپنی عمر کے دو سال پورے کر چکیگا۔ اشاعت کے لحاظ سے پہلا سال حوصلہ افروز تھا اور دوسرا ہمت سوز، مگر مالی نقطۂ نظر سے دونوں صبر آزما ثابت ہوئے۔ اس ادبی قمار سے اگر تجارت مقصود ہوتی تو گذشتہ دسمبر کے ساتھ ہمایوں کو بھی خیرباد کہنے کی رسم ادا کرنی پڑتی۔ مگر مقصد یہ نہ تھا، پانسہ اُلٹا پڑے یا سیدھا، یہ کھیل کھیلا ہی جائیگا، پہلے بھی یہی خیال تھا اور آئندہ کے لئے تو قطعی طور پر طے کر لیا گیا ہے۔ کہ ہمایوں کی اشاعت میں مالی، تجارتی، اور مذاقِ عوام کی کوئی مصلحت دخل انداز نہ ہو سکیگی۔

---

ناظرینِ ہمایوں کی بے نیازیوں کے ہم ممنون ہیں کہ آئے دن کے بے اثر دریوزۂ التفات سے ہمارے جذباتِ خودداری کو پامال ہونے سے بچا لیا۔ وہ توجہ فرمائیں تو اُن کا شکریہ، اور نہ فرمائیں تو اُن سے توجہ فرمائی کی درخواست نہیں کیجائیگی، ہمایوں کو جبتک جاری رکھنا ہے ہمدردی کی بھیک کے بغیر جاری رکھا جائیگا۔

---

ہمنے گذشتہ دسمبر میں موجودہ دسمبر کیلئے وعدوں کی کوئی فہرست شائع نہیں کی تھی سو الحمدللہ اب کہ دسمبر حال سے ماضی میں تبدیل ہونیکو ہے، ہم اپنے ناظرین سے اپنی کسی وعدہ فراموشی کی وجہ سے شرمندہ نہیں ہیں۔ اور اسی شیریں تجربہ کی بناء پر ہمارے حال کا دامن بھی مستقبل کے زرّیں وعدوں سے خالی نظر آتا ہے۔ ہم گذشتہ دو سال اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہے ہیں، اور آئندہ کیلئے بھی اسکے سوا کوئی امید نہیں دلا سکتے کہ ہم بساط بھر کام کرتے رہینگے۔

---

حضرات اہلِ قلم کی بیکراں توجہات کا اعتراف کرنا ضروری ہے جنکی متواتر قابلقدر امداد سے ہم اس قابل ہوئے کہ سطحی مضامین سے ہمایوں کے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ انکی گرانمایہ قلمی اعانت بار بار ہمیں میسّر آتی رہی مگر ہم نے ہر بار شکریہ کے اظہار سے قصداً پہلو تہی کی۔ ایک تو اس لئے کہ انکی عظمت ہمارے دل میں غیر محدود تھی اور رسمی تعریفوں کے الفاظ کا ذخیرہ محدود۔ الفاظ کی تنگ دامانی انکی عظمت کی فراوانیوں کو بار بار کیونکر سمیٹ سکتی ہے؟ دوسرے اس وجہ سے کہ مضامین کی گرانمایگی کے مطابق تعریفوں میں تفاوت قائم رکھنا مصلحت کے خلاف ہے، اور بلا امتیاز ہر مضمون نگار

کیلئے تعریف کے آخری الفاظ استعمال کرکے اُسے ادب اُردو کا "رستم داستان" بنادینا یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ "گرفرقِ مراتب نہ کنی زندیقی" اسلئے ہم ہر مرتبہ اپنے دل کو یہ سمجھا کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ہمارے قلمی معاونین رسمی تعریفوں سے مستغنی ہیں اور ہم انکی حقیقی ستایش سے قاصر! "خاموشی در ثنائے تو حدِ ثنائے تست"

---

ہونہار نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کا جو طریقہ ہمنے اختیار کیا تھا ہم خوش ہیں کہ ہمارے بعض معزز معاصرین نے بھی اس روش کو پسند کیا ہے۔ حوصلہ افزائی کا یہ خاصہ ہے کہ پست طبائع کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتی ہے تجربہ اس واقعیت پر اپنی تصدیق کی مُہر لگا چکا ہے۔ اس بارہ میں ہمارا اعلان شائع ہوئے ڈیڑھ ہی سال گذرا ہے مگر اتنے قلیل عرصہ میں بھی ہمنے کئی ہونہار ادیب تیار کر لئے۔ ڈیڑھ سال پہلے جو دو سطریں لکھتے جھجکتے تھے آج وہ اچھے مضمون نگار تصور کئے جاتے ہیں، اُنکے نام ہمایوں میں دیکھ کر دوسرے ادبی پرچوں کی طرف سے انکے پاس مضامین کی درخواستیں آتی رہتی ہیں اُن میں سے بعض تو بلند پایہ رسالوں کے اڈیٹر بھی بن چکے ہیں۔ اس میں نہ ہمارا کوئی کمال ہے اور نہ مستقبل کے ان انشا پردازوں کا کوئی نقص۔ درحقیقت اُن میں ایک ادیب بننے کی صلاحیت موجود تھی مگر اُنکی جھجک اور دو رسالوں کی کم بینی کی وجہ سے اپنی استعداد کے اظہار کا انہیں موقعہ میسر نہ تھا۔ ہمنے کم بینی کو بالائے طاق رکھکر ہمایوں کے صفحات پیش کر دیئے اس سے انکی جھجک دُور ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔

"چھیڑ کی دیر تھی طبیعت کو"

ہمنے حوصلہ افزائی کے متعلق اسقدر دریا دلی سے کام لیا ہے کہ مڈل اور ہائی کلاس کے ہونہار طالب علموں کے مضامین نظم و نثر شائع کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ آئندہ بھی جس تحریر میں ہم ہونہاری کا رنگ دیکھینگے صرف اسوجہ سے اُسے کبھی رد نہیں کرینگے کہ وہ معمولی درجہ کے ایک طالبعلم کی تحریر ہے۔ مگر جہاں ہم طالب علموں کی جماعت کے اس امر میں ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارے ذوقِ جستجو کو کامیاب بنایا وہاں انکی بے صبری سے بھی سخت پریشان ہیں۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ بلا امتیاز ہر طالب علم کی پہلی مشق ہمایوں کے صفحات میں جگہ نہیں پا سکتی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمایوں ہندوستان کے منتخب دو تین رسالوں میں سے ایک ہے، بعض اوقات بڑے بڑے مشہور اہل قلم کے مضامین اس وجہ سے واپس کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ ہمایوں کے بلند معیار کے مطابق نہیں ہوتے تو بھلا طالب علموں کی ابتدائی مشقیں کیونکر شایع کیجا سکتی ہیں۔ باقی اکثر نو مشقوں کا ہمیں یہ لکھنا،

کہ "اُمید ہے آپکی نظرِ کیمیا اثر سے یہ نظم یا نثر اصلاح کے بعد اس قابل ہو جائیگی کہ ہمایوں میں شایع ہو سکے"

تو یہ محض فریبِ عقیدت ہے۔ ہماری نظر یا اصلاح اگر بقول اُنکے ایسی کیمیا ساز ہوتی کہ بیک اصلاح یا بیک نظر کسی نومشق کو اقبال و ٹیگور بنا سکتی تو اپنی کرامت کا پہلے ہم اپنے اوپر ہی کیوں نہ تجربہ کرتے؟ مختصر یہ کہ ہم اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ ہم "گورو شنکر" کی کسی گپھا کے رشی یا ادبی دنیا کے صاحبِ معجزہ پیغمبر ہیں۔ ہم نومشقوں کو اصلاح و مشورہ سے رفتہ رفتہ ادیب بنا سکینگے فوری طور پر انقلابِ ماہیت ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ سرِدست وہ اسی پر قناعت کریں کہ اُنکے مضامینِ نظم و نثر درست کرکے انہیں بھیجدیا کریں کچھ دنوں تک وہ اردو کے دوسرے رسالوں میں ہمارے درست کئے ہوئے مضامین شائع کرائیں۔ جب اُنکی تحریریں کچھ پختگی پیدا ہو جائیگی پھر ہمایوں کے صفحات انکی ادبی شہرت کا گہوارہ بن سکینگے۔

---

اہلِ قلم کیخدمت میں ہم یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ براہ کرم ہمایوں کیلئے مضمون لکھتے وقت امورِ ذیل کو پیشِ نظر رکھا کریں

(۱)۔ مضامین نظمیہ ہوں یا نثریہ عموماً مختصر دلچسپ و نتیجہ خیز ہوں۔ انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت وغیرہ کے مضامین کا ترجمہ کرتے وقت بھی انہیں باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔

(۲)۔ افسانے ہوں یا تخیل کے مضامین عریانی سے قطعاً پاک ہونے ضروری ہیں افسانوں میں عشقیہ جذبات بیان کئے ہی جائیں تو صرف شوہر اور بیوی کے درمیان پھر اس قسم کے جذبات نہایت بلند اور شریفانہ ہونے چاہئیں ناول اور حسن و عشق کے بازاری ولولے ہمایوں کے صفحات میں کبھی جگہ نہیں پا سکینگے۔

(۳)۔ تاریخی مضامین ہوں یا افسانے انکا ہر فقرہ اخلاقی روشنی سے لبریز ہونا چاہئے آپکی مضمون نگاری کا پہلا اور آخری مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ آپ ناظرین ہمایوں کو کوئی اخلاقی ہدیہ پیش کر رہے ہیں۔

(۴)۔ نظمیں ایسی ہونی چاہئیں جو انسانیت کے پاکیزہ جذبات کو ابھاریں غزلیات منتخب یعنی مختصر زیادہ پسند کیجاتی ہیں۔ سات اور زیادہ سے زیادہ نو شعر کی غزل بہت کافی ہوتی ہے مطلع مقطع اور جفت و طاق کی پابندیاں غزل سے دور کردی جائیں تو غزل ایک چیز بن جائے۔ عرب میں صرف ایک ہی شعر شاعر کی شہرت کو پر پرواز لگا دیتا تھا،

(۵)۔ آپکے ساتھ ہم بھی کوشش کرینگے کہ اردو عبارت میں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ کی بجائے ہندی کے سبک اور خوشنما الفاظ استعمال کریں۔ اردو بہت مشکل ہوتی جاتی ہے۔ آپ اسے ہندوستانی زبان کہتے ہیں لیکن اگر اس میں عربی الفاظ کی یہی کثرت رہی تو ہندوستان تو درکنار اُسکے کسی ایک شہر کی زبان بھی نہ رہیگی۔ کتابی اور اخباری زبان بن جائیگی

# جہاں نما

**امن وامان کی امیدیں**۔ ہزاروں برس سے دنیا کے رہنے والے پورے امن واطمینان کے خواب دیکھتے رہے ہیں۔ بلکہ جب کبھی چند سال بغیر لڑائی جھگڑے کے گذر گئے ہیں تو خواب دیکھنے والے کہہ اُٹھے ہیں کہ امن کا دَور شروع ہوگیا لیکن بہت جلد ہی اُن کی پیشینگوئی جھوٹی اور بے بنیاد ثابت ہوئی۔ وہ جو دائمی صلح کا ہونا ناممکن سمجھتے ہیں اسے انسانی فطرت کا اک ضروری جز سمجھتے ہیں کہ وہ لڑے لیتے ہیں کہ صلح بغیر جنگ کے ناممکن ہے کچھ ایسے ہی جیساکہ بُرائی کے بغیر نیکی کا خیال کرنا بھی محال سا امر ہے۔ صلح کے مومن کہتے ہیں یہ درست ہے واقعات یہی بتاتے ہیں لیکن ہمارے احساسات صاف صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ طاقت جو کائنات پر حکمران ہے اسے ایک ایسے رستے پر لیجارہی ہے جو ہمیں آخرکار ہمیشہ کی مصالحت وموافقت کا نظارہ دکھائیگا!

سچ پوچھئے تو انسانوں کی صحیح نجات کی اُمید اگر ہے تو انہیں اُمیدوں میں! وہ انسانیت پر ظلم کرتے ہیں جو اُسے یقین دلاتے ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیری قسمت لڑنے جھگڑنے کے ساتھ وابستہ ہے اگر اُن کا حقیقت میں یہ خیال ہے بھی بہتر ہے کہ وہ خاموش رہیں اور دیانت داروں کو یہ کہہ کر نہ اکسائیں کہ تم پورے دیانت دار ہو نہیں سکتے تم سے خیانت ہونی ضروری ہے آج ہو یا کل۔ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سمجھنا کہ دنیا چند سالوں میں راہِ راست پر آجائیگی کم ازکم ہماری محدود عقل کی رُو سے فقط سبز باغ دیکھنا ہے اَور کچھ نہیں۔ وہ قوت جس نے کمزوری کو پیدا کیا جانتی ہے کہ کیونکر اور کب یہ کمزوری بہترین قوت میں بدل جائیگی۔ اُس کے نزدیک صدیاں لمحوں سے بھی کم طویل ہیں۔ اُس کی نظر میں جو کچھ ہو رہا ہے بہتر ہے انسانیت کی ترقی اِسی میں ہے کہ وہ گری اور اب پھر سنبھلنے کی آرزومند دکھائی دیتی ہے!

جنگِ عظیم جس نے دنیا کے امن کو توڑ کر فساد کا ڈنکا بجایا۔ اتنی ہیبتناک تھی کہ امن پر ایمان لانے والے بھی تھوڑی دیر کے لئے دم بخود ہو گئے کہ جتنا امان ہم ڈھونڈھتے تھے اُس سے دُگنی چوگنی لڑائی آدھمکی۔ اب ہمارے خیالات کا کیا حشر ہوگا؟ ایسا خیال قدرتی امر تھا کیونکہ ہم

عقل کے پیروؤں کو کیا معلوم کہ خدا نے پردۂ غیب میں کیا کیا مصلحتیں چھپا رکھی ہیں جو واقعات کے ہوتے ہُوئے انسانی نگاہ سے دُور مستور رہتی ہیں۔ لڑائی ہُوئی پھر صُلح ہُوئی پھر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ٹھنی رہیں پھر صُلحیں ہُوئیں اب بظاہر امن سا ہے لیکن قوموں کا امن کیا امن ہے اس کی قلعی آج نہیں تو کل کُھل جائیگی کیونکہ جو امن فریب اور زبردستی پر قائم ہو وہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا +

ہاں امن کی اصلی ترقی ہے اگر ہے ہو رہی ہے تو قوموں کے افراد میں ضرور ہو رہی ہے۔ جماعتوں میں نہیں کہ غالباً دُنیا کی آئندہ جنگ جو کچھ مُدت سے بعض مُلکوں میں شروع ہو چکی ہے جماعتوں کی آپس کی لڑائی ہوگی وہ لڑائی جو کبھی کبھی تیر و تفنگ لیکن اکثر بدسلوکی اور بدمزاجی کے ذریعے سے ہوتی رہتی ہے اور جب تک دُنیا میں برابری نہ ہولیگی برابر جاری رہیگی + البتہ جماعتوں سے جُدا خدا کے بندے صلحِ عام کے خواہشمند ضرور نظر آتے ہیں اور عجب نہیں کہ اس صدی کے اخیر تک اس میں اتنی ترقی ہو جائے کہ یہ احساس بہت لوگوں کو اپنے قابو میں کرلے +

اِس ضمن میں یہ ایک نہایت دلچسپ امر ہے کہ جنگِ عظیم کے دَوران میں امریکہ میں بچّوں اور لڑکوں نے ایک چھوٹی سی انجمن صلیبِ احمر کی بنیاد ڈالی جو جنگ کے ختم ہونے پر بند نہیں ہوگئی بلکہ اُس کے کارکنوں نے یہ دیکھ کر کہ دُنیا میں ابھی دُکھ درد بہت ہے اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور آج ممالکِ متحدہ میں پچاس لاکھ لڑکے اور لڑکیاں اس انجمن کے رُکن ہیں + امریکہ سے یہ تحریک یُورپ میں جا پھیلی چنانچہ اس وقت تیئس ۲۳ مُلکوں میں ایسی انجمنیں قائم ہیں + یہ ان انجمنوں کا نتیجہ ہے کہ یورپ و امریکہ کے لاکھوں لڑکے اپنے اور غیر مُلک والوں سے دوستی اور ہمدردی رکھتے ہیں + آسٹریا کا ایک رضا کار لکھتا ہے کہ نوعمر ایک دن دُنیا کی قوموں کو ملائیں گے اور اُن میں محبت پیدا کر کے دُنیا میں امن اور سلامتی قائم کرینگے + وہ کتنا پیارا دن ہو جب بھولا بچپن جوانی اور بڑھاپے کو سیدھے راہ پر لے آئے!

د۔ ب

# بیگناہ مُلزم

ژان دارک وہ غریب کسان لڑکی جو ابھی تیرہ برس کی نہ ہُوئی تھی کہ رحمت کے فرشتے کی روشنی اُس کی آنکھوں کے سامنے چمکی اور خدا کی برکت کی شیریں آواز اُس کے کانوں نے سُنی کہ "ژان نیک بن جا اور اپنے دُکھ بھرے وطن کو مُصیبت سے چھڑا"۔ جس نے دو مہینے اٹھارہ دن میں فرانس کی شکست کھائی ہُوئی فوج کی مدد سے اپنے مُلک کا بہت سا حصہ انگریزوں کی گرفت سے آزاد کرالیا سچائی کی فتح کا نعرہ بلند کیا۔ مُرجھائے ہُوئے دلوں کو نسیمِ بہار بن کر کِھلا دیا فرنساوی شاہزادے کو جسے اپنی حقداری میں آپ ہی شبہ سا پڑ گیا تھا فرانس کا تاجدار بنا یا وہ غریب بھولی بھالی جس کی دلاوری نے دُور دُور تک شہرت حاصل کر لی جب پکڑی گئی جب نام و نمود کی دُنیا سے اوجھل ہوگئی اُن اندھیری ساعتوں میں اُس نے ہمت کے وہ جوہر دکھائے جن کا دیکھنے والا جن کا سراہنے والا اُس وقت صرف خالقِ کائنات تھا اور جس کی کہانی کے سُننے والے اُس پر سر دُھننے والے اب سبھی وہ دل ہیں جو سیدھے رستے پر چلنے کے آرزومند نظر آتے ہیں!

ژان دارک ۲۳ مئی ۱۴۳۰ء کو گرفتار ہُوئی۔ انگلستان کے فرنساوی مددگاروں نے چند ماہ کے بعد اُسے انگریزوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اُسکے مُلکی بھائیوں نے جو اپنے وطن کی بربادی پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اُسے غیروں کے پاس بیچ دیا۔ ۲۱ فروری ۱۴۳۱ء کو رُدآن کے شہر میں ستّر ججوں کے سامنے جن میں صرف دو انگریز تھے اور باقی فرنساوی ژان کو حاضر کیا گیا۔ قیدخانے میں اُس پر طرح طرح کے ستم ڈھائے جاتے تھے۔ اُسے لوہے کے پنجرے میں رکھا گیا اُسکے گلے، کمر اور پاؤں کو زنجیروں سے جکڑ دیا گیا اور پانچ انگریز سپاہی اُس کی کوٹھڑی میں پہرہ دیتے تھے۔ یہ دوشیزہ جس نے اپنی بالی عمر کے ابھی اُنیس برس بھی پورے نہ کئے تھے اپنی جنس کی صحبت سے محروم کی گئی اور اِس خطرے میں ڈالی گئی کہ اکھڑ جنگجوؤں سے اپنی پاکیزگی کو بچائے رکھے۔

عدالت میں مقدمہ شروع ہُوا تو ایک عجیب نظارہ تھا۔ فرانس کے لائق ترین پادری اور عالم ایک ان پڑھ بے یار و مددگار لڑکی پر اپنے ترشے ہُوئے سوالوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں وہ اکیلی ہے کوئی بتلانے

سمجھانے والا نہیں لیکن خدا کی رحمت ہے کہ اپنی راستبازی کے بل پر تین ماہ تک ڈھنڈوں جرح ہوتی ہے مگر وہ اپنی جگہ پر اپنے اصول پر اپنی بات پر برابر قائم ہے۔ اُسکی پچھاڑنے کی خواہش اتنی ہے کہ بعض دفعہ وہ کئی کئی ایکبار بول پڑتے ہیں اور کمرے میں شور سا مچ جاتا ہے ژان کہتی ہے میں سب جواب دونگی لیکن ایک ساتھ نہ بولو" شروع میں جب اُس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا تم سب سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دوگی؟ تو صاف کہتی ہے کہ "ہاں دونگی سوائے اُنکے جو میرے الہاموں سے تعلق رکھیں"۔ یہ بھی کہتی ہے کہ جس قید خانے میں بھی میں رہی ہوں میری یہی کوشش رہی ہے کہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلوں لیکن خدا کی مرضی نہ تھی کہ میں اس طرح رہائی پاؤں" پھر کہتی ہے خدا کی قسم اگر میں قید خانہ کا دروازہ کھلا پاؤں تو یہی سمجھوں کہ خدا کی مرضی ہے کہ میں نکل بھاگوں +

وہ پوچھتے ہیں تو سپاہیوں میں عورت ہوکر مردانہ لباس پہنتی تھی، اس پر ذرا تیزی سے جواب دیتی ہے کہ میرے لباس سے تمہیں کیا واسطہ؟ ہاں تم اس سے مجھے کافر جادوگرنی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم نہیں مانتے کہ یہ میرے خدا کا حکم تھا تو یہی سمجھ لو کہ مردوں میں اکیلے رہنے کیلئے ضروری تھا کہ میں مردانہ لباس پہنوں + پھر سوال ہوتا ہے کہ کیا خدا کو انگریزوں سے نفرت ہے؟ تو جواب دیتی ہے کہ یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ خدا کو اُن سے نفرت ہے یا نہیں ہے لیکن اتنا خوب جانتی ہوں کہ اُنکو فرانس سے باہر نکال دینا لازم ہے سوائے اُنکے جو مر چکے ہیں۔ پھر کہتی ہے کہ فرانسیسیوں کو اُنکے گناہوں کے عوض سزا ملی اور انہیں شکست ہوئی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ وہ انگریزوں پر فتحیں حاصل کریں +

خدا پر اُسے پورا بھروسہ تھا۔ اُس نے کہا کہ قید میں رہنا بھی ضرور اچھا ہوگا کیونکہ یہی خدا کی مرضی تھی۔ پھر کہنے لگی کہ میں نے کچھ نہیں کیا جو کچھ کیا خدا نے کیا۔ مجھ سے کوئی معجزہ نہیں ہوا اور جو کام ہوا سب خدا ہی کے کرنے سے ہوسکا۔ میں پکڑی گئی تو یہ بھی اچھا ہوا میں قید ہوئی تو یہ بھی ٹھیک تھا +

اُسکی آوازیں اُسے یقین دلاتی تھیں کہ خدا تیری مدد کریگا اور اُسے یقین ہوچکا تھا کہ وہ رہائی پائیگی۔ یہ رہائی جلد ہوگی اور ایک معجزہ کے ساتھ ہوگی۔ اُس سے پوچھا جاتا ہے کیا تیرے پیرو مانتے ہیں کہ تو خدا کی بھیجی ہوئی ہے؟ جواب ملتا ہے "میں نہیں جانتی وہ مانتے ہیں یا نہیں لیکن وہ مانیں نہ مانیں میں پھر بھی خدا ہی کی بھیجی ہوئی ہوں" +

اسکا اصول زندگی تھا "تو اپنی مدد کر۔ خدا تیری مدد کریگا" اور اُسے یقین تھا کہ خدا اُسے اِن ظالموں کی گرفت سے چھڑا کر بچا لیگا۔ ابھی پتہ نہ تھا تو اتنا کہ خدا اُسے کیونکر بچائیگا؟ ——— پیاری ژان! یہ تجھے عین اپنی موت کے وقت معلوم ہوا کہ خدا تیرے جسم کو انسانی خونخواری کی آگ میں فنا کرکے تیری رُوح کو بچا لیگا اور تجھے اپنے پہلو میں جگہ دیگا!!

# دول یورپ کے معاہدات

یا

# بین الاقوامی آداب کی حقیقت

آج عنوان بالا کی تخم ریزی سے ہم جس زمین کو شگفتہ دیکھنا چاہتے ہیں اگرچہ اُسکی مخصوص آب و ہوا ہمارے نخل مقصد کو راس آنیکا یقین نہیں دلاتی مگر ہم کوشش کرنے سے دریغ نہیں کرتے کہ لیس للانسان الا ماسعیٰ

تا نہال آرزو کے بردہد
حالیا رفتیم تخمے کاشتیم

یورپ کے مشہور ماہر سیاست پرنس بسمارک نے آج سے پچاس ساٹھ سال پیشتر کہا تھا۔ کہ دول یورپ کے ہر عمل کے دو مقاصد ہوتے ہیں ایک جلی دوسرا خفی جو حقیقتاً مقصد اصلی ہو اور اول الذکر کے لباس میں ملبوس ہوتا ہے اِس لئے اُن کے اعمال کے مقاصد حقیقی دریافت کرنے کے لئے لازمی ہے کہ اُنکے جلی و ظاہری یعنی اعلان کردہ مقصدوں کے پردے کو چاک کر کے اُن سے ورا مقاصد حقیقی کو تلاش کیا جائے۔

اگرچہ اس اصول کو پرنس بسمارک نے ایک ایسے وقت میں بتلایا تھا جبکہ دول یورپ اپنا استعماری جال مشرق پر پھیلا رہی تھیں، اور جس کو اگر مشرق پیش نظر رکھتا تو غالباً یورپ کے آہنیں چنگل میں اس طرح نہ گرفتار ہوتا جیسا کہ آجکل کہ اپنی انتہائی طاقت کے ساتھ ہاتھ پیر مارنے پر بھی غلامی کی ان بندشوں سے رہائی دشوار ہو رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مشرق کو یورپ کے اس ظاہری لباس کی جلوہ آرائیوں، ہمدردی و محبت کی پر فریب نغمہ سرائیوں اور خود غرضانہ داد و دہش نے ایسا حیرت زدہ، مغلوب الحال اور سرشار کیا کہ اُسے اپنی ذات کا ہوش ہی نہیں رہا۔

چنانچہ آج بھی باوجودیکہ گذشتہ ہولناک جنگ نے اپنے خونخوار ہاتھوں سے دول یورپ

کے اعمال کے چہرہ کی اس ظاہری نقاب کو ایک حد تک اُلٹ دیا ہے، اور زمانہ کے واقعات و حوادث پرنس بسمارک کے اس قول کی صداقت کی شہادت دے رہے ہیں مشرق کی غفلت کا کاوہی حال ہے، ہندوستان کی کونسلوں کے اجلاسوں سے اب بھی یورپ کی محبت کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، مصر میں آج بھی یورپ کی ہواخواہی کے آثار پائے جاتے ہیں، حجازیوں کے سروں سے اس وقت تک یورپ کی بارہ لاکھ گنّی کا نشہ ہرن نہیں ہوا ہے[1]، قسطنطنیہ میں اب تک ایسے وجود پائے گئے ہیں جو دول یورپ کے چنگل کو "سایۂ عاطفت" سے تعبیر کرتے ہیں[2] عراق عرب میں اب بھی بعض قبائل و شیوخ یورپ کی غلامی کو مایۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔

حالانکہ اگر آج دول یورپ کے اس قسم کے تمام معاملات، بین الاقوامی معاہدات، ہمدردی و محبت کی صداؤں، اور محکوم اقوام کے ساتھ وعدوں کو کہ جن سے مشرق آجتک اس درجہ مسحور ہے پرکھا جاوے تو اُنکے اندر ذرہ بھر صداقت اور ثبات واستقلال نہیں پایا جاویگا الا تجارتی معاہدات کے کہ جن کی خاص طور سے زیادہ حفاظت کرنیکی کوشش کیجاتی ہے کیونکہ ملک و قوم کی اقتصادی و ثروتی ترقی کے اصلی فوائد اُسی سے وابستہ ہوتے ہیں۔

چنانچہ دول یورپ کے تمام مختلف اعمال اور اُنکے تغیر و تبدل پر جس قدر بھی امعان و دقت کے ساتھ نظر ڈالی جاتی ہے اُن سب کا ابتدا سے ایک ہی محور و مرکز پایا جاتا ہے اور وہ انگریزی زبان کی مشہور ضرب المثل "دی مائٹ از رائٹ" یعنی "قوت بذات خود حق ہے" کا مصداق ہے، یورپ کے مشہور فاتح اعظم نپولین بوناپارٹ کا بھی یہی قول تھا کہ "یورپ میں کوئی دولی قانون نہیں، اُسکی سیادت و قیادت کا صرف ایک راز ہے اور وہ "قوت" ہے"، پس جس طرح سے کہ دول یورپ کے اعمال اس مرکز کے اصل و بنیاد ہونے کی شہادت آج دے رہے ہیں، اُسی طرح سے اُنھوں نے ہزاروں سال پیشتر بھی اس کی شہادت دی ہے کیونکہ تواریخ کے صفحات کا تفحص ہمیں بے شمار ایسے شواہد و نظائر

---

[1] شریف مکہ کو اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے اور اپنی ذاتی فوجی قوت قائم کرنیکی امداد میں فروری ۱۹۲۰ء تک کل رقم ۱۲ لاکھ گنّی یعنی ایک کروڑ اسّی لاکھ روپیہ دیا گیا ہے (دیکھو مسلم اسٹینڈرڈ نمبر ۱۴، ۹ مارچ ۱۹۲۲ء)

[2] ابھی حال میں ترکان احرار نے شیخ الاسلام اور احمد کمال بک ایک اخبار کے ایڈیٹر کو اسی بنا پر قسطنطنیہ میں سزائے موت دی ہے۔

پیش کرتا ہے کہ جس میں ہر قومی سلطنت نے بلا کسی پس و پیش کے اپنے جوار کی ضعیف سلطنتوں کو ہضم کیا ہے، تاریخ قدیم میں روم کی سلطنت کی وسعت و عظمت کا ذریعہ یہی تھا، اور تاریخ حال میں روس کی سلطنت اپنی گذشتہ عظمت و وسعت کو اسی طریقہ سے پہنچی تھی، حقیقت بھی یہی ہے کہ سلطنتوں کے فیمابینی آداب وسلوک افراد کے فیمابینی آداب وسلوک جیسے نہیں ہوا کرتے بلکہ انکے آداب وسلوک کی غایت تو ابتداء سے ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور وہ حصول فوز و کامرانی ہے خواہ جس طریق سے بھی ہو۔

لیکن آجکل جبکہ علم و تمدن کی کم و بیش روشنی تقریباً دنیا کے ہر گوشہ تک پہنچ چکی ہے دول یورپ فتوحات کے وقت اور ضعیف و صغیر اقوام پر مستولی ہوتے وقت اپنی قوت کے حق کا اظہار اظہار نہیں کیا کرتی تھی بلکہ وہ اُس وقت تہذیب و تمدن کے ایک شفیق معلم کے لباس میں ملبوس ہمدردی و محبت کا ایک دلنواز پیکر، اور حریت و آزادی دلانے والا آسمانی فرشتہ بن کر آتی اور اپنے مقاصد و اغراض کے اس ظاہر فریب جال میں اقوام صغیرہ وضعیفہ کو پھانستی ہیں، اور پھر ان میں سے ہر ایک اس طرح سے زیادہ سے زیادہ استعماری وسعت اور اقتصادی کامیابی حاصل کرنیکی کوشش کرتی ہے۔

چنانچہ آج بین الدولی اختلافات کا ایک اہم ترین سبب دول کی یہ استعماری و اقتصادی رقابت بھی ہے، یہی ہے جو انہیں ہتیار بندی و تسلیح کے لئے گرانقدر مصارف حتیٰ کہ بعض کو تو ملک کی کل آمدنی کے یک ثلث سے بھی زیادہ برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔ اور پھر وہ اسکے ذریعہ سے موقع پاکر ضعیف اقوام اور کمزور قبائل پر مستولی ہو جاتی اور اُنکے مال و متاع کو بلا کسی استحقاق کے محض طمع و حرص کی بنا پر زور و قوت سے غصب کر لیتی ہیں۔ نیز اُن کا یہ عمل صرف افریقہ کے وحشیوں کے ہی ساتھ محدود نہیں ہوتا بلکہ متمدن و ترقی یافتہ قوموں اور قبائل کے ساتھ بھی اُن کا یہی حال ہے۔

پس اس بنا پر ہر وہ دولت جو زیادہ سے زیادہ سامان مدافعت و قوت رکھتی ہے اپنے ناموس و شوکت کو زیادہ محفوظ رکھ سکتی، اپنے رقبہ اور دبدبہ و اقتدار کو زیادہ وسیع کر سکتی اور اپنی ہمسایہ سلطنتوں کے شر سے زیادہ مصئون و مامون رہ سکتی ہے۔ لیکن ضعیف و

کمزور قوموں کے لئے کوئی حق نہیں کیونکہ اُنکے نزدیک اپنی مدافعت کے لئے بھی کوئی قوت نہیں اس لئے غاصب و طامع دول کے نزدیک اُنکے اموال و املاک کو غصب کرلینا اور اُنہیں محکوم و غلام بناکر ہی زندہ رکھنا زیادہ مناسب و بہتر سمجھا جاتا ہے، مثالاً افریقہ کے حبشیوں کو دیکھو کہ باوجودیکہ تمدن، و علم کی روشنی اُن تک پہنچ چکی ہے لیکن قوت و طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اکثر محکوم ہی رہتے ہیں اور اُن کے ممالک و اموال سے غیر اقوام فائدہ اُٹھاتی ہیں۔ یہی حال ہندوستان کا ہے ؛

یہ وہ بین حقائق ہیں کہ جنکو پیش نظر رکھنا یورپ کی سیاست کے ہر مطالعہ کرنے والے کے لئے ضروری و لازمی ہے اور جنکو نظرانداز کرنے سے اُس کی رسائی دول کی حقیقی اغراض و مقاصد اور اُنکے مختلف اعمال کے صحیح اسباب و محرکات تک نہیں ہوسکتی۔

ان ہی دول میں بعض سلطنتیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے اس باب میں ظاہر طور سے اپنی معاصر دول سے نسبتاً زیادہ صداقت شعاری کی راہ اختیار کرنا چاہی ہے اور بجائے فریب وہ لباس اختیار کرنے کے اپنی اصلی و حقیقی اغراض کے چہرہ کو ایک حد تک بے نقاب کیا ہے اور ضعیف و کمزور قوموں کو محکوم و غلام بنانے اور اُنکے اموال و ممالک کو غصب کرنے کے لئے ,, قوت کے حق'' کا علی الاعلان دعوےٰ کیا ہے۔ منجملہ انکے ایک سلطنت جرمنی ہے کہ جس نے گذشتہ ہولناک جنگ کا محض اسی بنا پر بیڑا اُٹھایا تھا۔

جرمنی کی اس ہمت و حوصلہ کا اصلی سبب درحقیقت اُسکے اُن عظیم الشان فضلاء و فلاسفہ کا وجود اور کوششیں تھیں کہ جنہوں نے گذشتہ دوصدی کے اندر اپنی مافوق الفطرۃ ذہانت و دماغ اور غیر معمولی قابلیت سے جرمنیوں میں اولوالعزمی و جنگجوئی کی رُوح پھونکی تھی۔ اور جن میں سے بعض کے اس باب میں نہایت مہیج و حماست انگیز اقوال یہاں پر نقل کردینا غالباً ناظرین کرام کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

امن پسندی کے متعلق وان ٹریٹشکی (Von Trietschke) کا قول ہے کہ [1]

,, ہمیشہ سے خستہ، تھکے ہوئے اور فرسودہ زمانوں نے دائمی امن کے خواب کی لذت اُٹھائی ہے''

[1] یہ تمام اقوال جرمنی کے فیلسوف برن ہارڈی کی تصنیف Germany & the next war سے ماخوذ ہیں۔

نیز شیلر Schiller کہتا ہے کہ :-

"پر امن ایام سے آدمی کی ترقی رک جاتی ہے، اُسکی جرأت کاہلی اور تن آسانی سے فرو ہو جاتی ہے، قانون دنیا کو ایک ہی حالت میں رکھتا ہے، لیکن جنگ میں انسان کی قوت ظاہر ہوتی ہے، جنگ ہر ذلیل چیز کو شریف بنا دیتی ہے، حتیٰ کہ بزدل بھی اپنے نام کو جھٹلا دیتا ہے"

جنگ کی نسبت گیٹے Goethe کا قول ہے کہ :-

"ہٹا دینا یا ہٹا دیا جانا زندگی کا جوہر ہے"

وان شیلجیٹ Von Shelget کہتا ہے کہ :-

"جنگ اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ فطرت میں عناصر کا مجادلہ"

فریڈرک اعظم کہا کرتا تھا کہ :-

"جنگ سے تمام خوبیوں کو نہایت زرخیز مقام مل جاتا ہے، ثابت قدمی، رحم، بلند ہمتی، دلاوری، اور ترس اُنکے اندر چمکتے ہیں، ہر لحظہ ان میں سے کسی نہ کسی خوبی کو کام میں لانیکا موقع ملتا ہے"

ولہم وان ہمبل Wilhem Von Humbol کا قول ہے کہ

"جو اثر جنگ کا قومی خصائل پر ہوتا ہے اُس میں میں ایک نہایت صحت بخش عنصر دیکھتا ہوں جس سے نسل انسانی بنتی ہے"

آخر میں مشہور جرمن شاعر و فیلسوف گیٹے Goethe کے اشعار کی حماست انگیزی ملاحظہ ہو

"پر امن دن کے خواب جو دیکھنا چاہے دیکھے۔ جنگ ہمارا نعرۂ اجتماع فوج ہے، فتح کی طرف آگے بڑھو"!

"ہر ایک طاقت کو جنگ کا پیغام دے، ہمیشہ بہادر رہ۔ کبھی بزدل نہ بن۔ بہادر سپاہی کیلئے بہشت کا سنہرا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے!"

یہ اور اسی قسم کے دیگر فلاسفر و فضلا تھے جنہوں نے پوری جد و جہد سے جرمن قوم میں شجاعت و جنگجوئی کی روح پھونکی اور جسکا نتیجہ گذشتہ جنگِ عظیم میں جرمنی کی ہولناک طاقت اور اُس کا حیرت انگیز استقلال و شجاعت تھی۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں ہر قوم کی ترقی و تنزل کا مدار اور اُسکی صلاح و فلاح کی

عند اللہ و عند الناس ذمہ داری اُسکے علماء و فضلاء کے ہی سر عائد ہوتی ہے، مذہب اسلام نے بھی اُنہیں انبیائے کرام کی وراثت کا اہم درجہ اسی بنا پر عطا کیا ہے، اس لئے جس قوم کے علماء و فضلاء خود قاصر التدبیر اور محتاجِ اصلاح ہونگے ضرور ہے کہ وہ قوم بھی قعر ذلت و پستی میں ہوگی ؂

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

چنانچہ جب جرمنی کے حکماء و فلاسفہ، اور علماء و فضلاء نے اپنی پیہم کوششوں اور مسلسل جدوجہد سے اپنی قوم میں اسپرٹ اور قوت پیدا کر دی تو ۱۹۱۰ء میں اُنہیں یہ جرأت ہوئی کہ وہ کارلسروہی Carlsruhe کے جلسہ میں اپنی قوت کے حق کا کھُلم کھُلا دعوے کریں۔ جیسا کہ موقع مذکور پر بڑے بڑے خطیبوں اور لکچراروں نے علی الاعلان اس امر کا اظہار کیا۔ کہ اب جرمنی طاقت و قوت رکھتی ہے اس بنا پر اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے قرب و جوار کی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں پرشل بلجیم و ہالینڈ وغیرہ کے مستولی و قابض ہو جائے، اور ہر ضعیف کمزور کو کہ جو اسکی قوت و عظمت اور ترقی و بقا کے لئے سدِ راہ ہو فنا کر دے، نیز اخبارات نے بھی نہایت زور شور کے ساتھ اس امر کو اُٹھایا کہ اب جرمنی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بلجین کانگو پر یا تو بجبر قبضہ کرلے یا اُسکو خرید لے۔

اِن تمام امور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان تمام تحریکوں و تجویزوں اور اولوالعزمیوں کی اصلی بنیاد اُس کی استعماری و اقتصادی طمع ضرور تھی لیکن وہ اندیشہ بھی تھا کہ جس سے اُسے ۱۹۱۴ء میں سرزمین بلجیم میں برطانیہ سے مقابلہ کی صورت میں دو چار ہونا پڑا۔

**معاہدات**۔ دُنیا میں جب اغراض پرستی، تلون و خداعت نے زبانی قول و قرار کا اعتماد کھو دیا تو یہی قول و قرار مزید مستحکم اور قابل العمل بنائے جانیکی غرض سے تحریری صورت میں منضبط ہونے لگا اور جانبین نے بھی ابتداءً اپنی ذاتی اغراض و مقاصد کو آپس کی ان طے شدہ تحریری شرائط و قیود پر قربان کرنے میں دریغ نہیں کیا، لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور اغراض پرستی و خود غرضی کا نشہ انسان کو زیادہ بدمست و سرشار کرتا گیا تو پھر ان عہود و مواثیق کی بھی کہ جو پہلے سب سے زیادہ ناقابل شکست اور قابل العمل سمجھے جاتے تھے کوئی قیمت نہیں رہی، دُنیا

کے تمام عہدناموں کی گذشتہ تاریخ اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہے۔

آج بھی باوجودیکہ دول یورپ ان عہود و مواثیق کے انضباط و تحریر کے لئے بڑے بڑے اہتمام، اور عظیم الشان جلسے و کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں مگر عملی حیثیت سے اُنکی قدر و قیمت کاغذ کی ردّی سے زیادہ نہیں ہوتی، مثلاً ۱۹۱۲ء کی گذشتہ جنگ بلقان میں اگرچہ دول یورپ نے اسکا عہد کر لیا تھا کہ بلقان کی جنگ سے پہلے کی حالت خواہ اس جنگ میں کوئی ہی مظفر و کامیاب ہو۔ برقرار رکھی جائیگی۔ لیکن جب خلاف توقع بلغاریہ کامیاب ہوئی اور ٹرکی کو شکست ہوئی تو اُنہوں نے اپنے ان عہدوں کو پس پشت ڈال دیا اور بلغاریہ کو اپنی فتوحات کا ثمرہ پوری طرح سے دلوایا۔

اگرچہ دُنیا کے تمام قوانین و قواعد، اور عہود و مواثیق کی موجد و مخترع اور بانی و واضع زیادہ تر ضرورت ہُوا کرتی ہے۔ لیکن اُنکی مبطل و ناسخ بھی ضرورت کے سوا اور کوئی نہیں۔ ضرورت ہی تھی کہ جس نے ۱۸۷۸ء کا برلن کا عہدنامہ۔ بوسینیا و ہرزیگوینیا کو غصب کرتے وقت آسٹریا کے ہاتھوں چاک کرایا، ضرورت ہی تھی کہ جس نے کوریا پر قبضہ جماتے وقت جاپان ہی کے ہاتھوں جاپان کے اُس معاہدہ کو باطل کرایا کہ جو کوریا کی آزادی و خودمختاری کا پوری طرح ضامن تھا۔ ضرورت ہی تھی کہ جس کی بنا پر گذشتہ ہولناک جنگ میں بلجیم پر چڑھائی کرتے وقت جرمنی کے وزیر اعظم نے ریشتاگ (جرمن پارلیمنٹ) میں، اپنے بلجیئم کی غیر جانبداری تسلیم کرنے والے عہدنامہ کو منسوخ کرنے کے لئے کہا کہ "ضرورت کسی معاہدہ و قانون کی پابند نہیں ہے"۔

دُول کے اس قسم کے جبر و استیلاء کو روکنے والی کوئی شئے نہیں ہوتی سوا ایک کے اور وہ عاقبت کی ناکامی کا خوف ہے، مثلاً آسٹریا کہ جو البانیا پر مستولی ہونیکا بہت کچھ ارادہ رکھتی تھی لیکن جب دیگر دول کی دخل اندازی کی وجہ سے اُسے اپنی ناکامی کا یقین ہو گیا تو وہ اپنے اس ارادہ سے دست بردار ہو گئی۔ لیکن جب انہیں ناکامی کا خوف نہیں رہتا تو پھر وہ بلا کسی پس و پیش کے اپنی حرص و آز کو پورا کرنے کے لئے اپنے مقتضائے مصلحت کے مطابق امم صغیرہ پر مستولی ہوتی اور اُنکے اموال و املاک کو غصب کرتی ہیں۔

یہ تمام اتحاد و یگانگت اور دوستانہ تعلقات و ارتباط جو یورپ کی سلطنتیں آپس میں ایک دوسرے سے رکھتی ہیں محض اپنے ذاتی مصالح پر مبنی ہُوا کرتے ہیں، اور اُسی وقت تک قائم بھی رہتے ہیں جبتک کہ جانبین کے مصالح اُس میں مساویانہ مشترک ہوں لیکن جہاں اسی اشتراک کے توازن میں خلل واقع ہُوا کہ اتحاد و دوستی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے، گذشتہ جنگ بلقان میں بلغاریا وسرویا متحد و متفق تھیں لیکن جنگ کے بعد اُنکے ذاتی مفاد و مصالح میں مباینت و اختلاف پیدا ہُوا تو یورپ بھی اُنکے سابق اتحاد کو قائم نہ رکھ سکا اور اُنھوں نے آپس میں ایک دوسری جنگ شروع کردی۔ علیٰ ہذا فرانس اور انگلستان کے درمیان جو اتحاد و دوستی گذشتہ جنگ میں قائم تھی وہ بھی محض اپنے اپنے مصالح پر مبنی اور اپنے مشترکہ دشمن جرمنی کے خوف کی وجہ سے تھی، لیکن جنگ کے بعد جب انگلستان نے تاوان کے معاملے میں جرمنی کی طرفداری کی اور روس سے بھی تجارتی معاہدہ بلالحاظ مصالح فرانس تنہا کر لیا تو پھر فرانس نے بھی مشرقی معاملات میں انگلستان کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن اب جیساکہ اخبارات کا بیان ہے یہ دونوں بچھڑے ہُوئے دوست لاسین کانفرنس میں اپنے مشترکہ مفاد و مصالح کے لئے پھر بغلگیر ہوتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح سے اٹلی کو جب طرابلس بلاکسی کوشش و محنت کے مل گیا تو اُس نے آسٹریا و جرمنی کی دوستی سے قطع تعلق کر لیا اور طرابلس دلوانے والی سلطنتوں سے دوستی کی لیکن جب مشرق قریبہ کی تقسیم میں اُسکے ہاتھ کچھ نہ آیا تو اُس نے اب لاسین کانفرنس میں اپنے اِن دوستوں کا بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

یہ اور اسی قسم کی تمام دیگر تاریخی امثلہ و نظائر پر تدبر و تفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ آج دنیا کا گوشہ گوشہ تمدن و تہذیب کی روشنی سے منور ہوچکا ہے اور افرادِ انسانی نے اپنی تمام دیگر ترقیوں کے ساتھ اپنے مابینی روابط اور آداب وسلوک میں بھی بہت کچھ ترقی کر لی ہے لیکن بین الدولی آداب قدیم ترین زمانہ سے لیکر اس وقت تک ویسے ہی قائم ہیں اُنکے اندر نہ تو کوئی ترقی ہُوئی اور نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ اس لئے یہاں پر خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخروہ کونسے اسباب و وجوہ ہیں کہ جوارباب حکومت و سلطنت کو جو کہ بذاتِ خود مہذب و تعلیمیافتہ اور اپنے ذاتی تعلقات میں بدمعاملہ نہیں ہوتے بحیثیت ایک حاکم کے اپنے فرائض

کی انجام دہی میں ایسے اعمال قبیحہ و افعال شنیعہ پر عمل پیرا ہونیکے لئے آمادہ کرتے ہیں ؟

اسکا جواب فطرۃ انسانیہ پر نظر تعمق ڈالنے سے صاف و واضح ہوجاتا ہے اس لئے کہ طبیعت بشریہ فطرتاً آزاد پیدا ہوئی ہے، وہ کسی قانون و قاعدہ کے آگے سر اطاعت خم نہیں کرتی جبتک کہ خاسر و ناکام عاقبت، ہلاکت بار پاداش، اور ضرر رسان انجام کا خوف اُس پر طاری نہ ہو، اور ظاہراً دنیا میں سلطنتوں سے بالاتر کوئی ایسی قوت بھی نہیں کہ جو اُنکے اعمال کا احتساب کرکے اُنہیں جزا و سزا دے اِلا ذات باری تعالےٰ کے کہ جو ظاہر پرست و غفلت سرشت انسان کی نظروں سے بالکل اوجھل و بعید ہے، اس لئے دول کے ان تمام اعمال قبیحہ و شنیعہ کی اصلی لگام قدرتاً اُنکے مطامع و مصالح کے ہاتھ میں ہوجاتی ہے جن کے حصول کے لئے وہ بلاخوف موانع جس طرح سے چاہتی ہیں قوت کا استعمال کرتی ہیں۔ لیکن افراد کی حالت ان سے بالکل جداگانہ ہے کیونکہ اُنکے اعمال کے احتساب اور جزا و سزا کے لئے دول کے وضع کردہ قوانین و شرائع ہیں۔ جنکا نفاذ وہ قوت کے ذریعہ سے اُن پر کرتی رہتی ہیں اور اسی لئے وہ بمقابلہ دول کے بغاوت و سرکشی، ظلم و استبداد، اور ستمگری و دل آزاری سے باز رہتے ہیں،

**جنگ**۔ دُنیا میں کوئی کام بلا سبب ظہور پذیر نہیں ہوتا اس لئے جنگوں کی نموداری کے بھی متعدد اسباب ہیں جنہیں ہم آئندہ بتلائینگے لیکن اُن سب میں سب سے زیادہ اہم و اعم وہ اعتقاد ہے کہ جو آجکل عام طور سے رائج و شائع ہے کہ فتح و استعمار سے فاتح دولت کو بڑے بڑے اقتصادی و اجتماعی منافع و فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

پس اگر آج جنگجو اقوام کے ذہن نشین یہ امر ہوسکتا کہ آئندہ جنگیں منفعت بخش نہیں ہوسکتیں بلکہ غالب و مغلوب دونوں کے لئے مساوی حیثیت سے مورد آلام و مصائب عظیم ہونگی تو منجملہ دیگر اسباب جنگ کے ایک بہت بڑے سبب کا ازالہ ہوسکتا تھا، اور فتوحات کی جنگیں سطح ارضی سے اُسی طرح سے مٹ سکتی تھیں جس طرح سے کہ مذہبی و دینی لڑائیاں اور خانہ جنگیاں مٹ گئیں۔

افکار و آراء خواہ بہ سرعت یا بہ تاخیر دُنیا کی قیادت کرتی ہیں لیکن افکار و آراء کی قیادت کوئی چیز نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ انسانی جذبات و عواطف کو اپنا موافق نہ بنالے۔ اور اس امر کے لئے ایک مدت طویل درکار ہوا کرتی ہے خصوصاً جبکہ کوئی جدید خیال و رائے

کسی قدیم و موروثی خیال و رائے کے مخالف واقع ہو، اس لئے اگرچہ آج جنگ بلحاظ صنعتی زراعتی اور مالی تعلقات و روابط کے کہ جو سلطنتوں کے درمیان اس حیثیت سے روز بروز ترقی کر رہے ہیں کہ ایک سلطنت کا قلیل ترین اقتصادی خلل فوراً دوسری سلطنتوں پر اثر ڈالتا ہے منفعت بخش نہیں ہے لیکن زمانۂ گذشتہ میں یہی ثروت و دولت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی چنانچہ یہی خیال ہے جو آجتک بعض اقوام کے دلوں میں جاگزیں ہے اور اُنہیں آمادۂ جنگ کرتا رہتا ہے۔

گذشتہ ایک صدی کے اندر سلطنتوں کے حالات میں عظیم الشان انقلاب ہوگیا ہے ہر سلطنت مثل ایک ایسے تاجر کے ہوگئی ہے کہ جو اپنے گاہک کو بلا اپنے آپکو نقصان پہنچائے ہوئے نقصان نہیں پہنچا سکتا اور ہر سلطنت حسب حیثیت دنیا کی تمام سلطنتوں کے ساتھ تجارتی وادبی تعلقات رکھتی ہے۔

بڑے بڑے ماہرین اجتماعیات نے اُس درجہ کی توضیح کی ہے کہ جس پر دنیا آج بلحاظ مابینی تعلقات و روابط کے پہنچ گئی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اب بین الدولی جنگ غالب و مغلوب دونوں کے لئے موجب و بال عظیم و مصیبت کبری ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر مسٹر نارمن اینجل مصنف کتاب "وہم اکبر" ہیں کہ جس کے شائع ہونے کے ساتھ ہی عالم سیاست و صحافت میں غلغلہ مچ گیا اور ایک قلیل مدت کے اندر دنیا کی تمام متمدن قوموں کی زبانوں میں اُسکا ترجمہ ہوگیا، اس کتاب نے مبادیاتِ سیاست اور قواعد اقتصادیات کے اندر انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ اس کتاب کی تصنیف سے مصنف کا مقصود یہ ہے کہ رائے عامہ کی اُس غلطی کو بتلائے جس کی رو سے وہ ابتک اس امر کی معتقد ہے کہ جنگ فاتح کے لئے منفعت بخش ہوا کرتی ہے اور یہ واضح کردے کہ اب زمانۂ موجودہ میں توسیع مملکت و ازدیاد قوت عسکریہ، اور قوم کی سعادت و فلاح کے درمیان کوئی علاقہ ہی نہیں اگرچہ ازمنۂ قدیمہ میں ایسا ہو۔ نیز اس کتاب میں اُس نے بین الاقوامی ارتباط و تعلقات کو جسم واحد سے تشبیہ دی ہے کہ جہاں کسی ایک عضو کو ذرا ٹھیس لگی کہ معاً سارا جسم اُسکو محسوس کرنے لگا، اسلئے اب سلطنتوں کے لئے کسی شہر پر قبضہ کرکے اُسکے باشندوں کو زیر کرنا اور اُنکے اموال و املاک پر مستولی ہونا ذرا مشکل ہوگیا ہے

---

[1] کتاب مذکور کا عربی ترجمہ مصر میں شائع ہوگیا ہے اور مضمون ہذا کا تب کے زیر ترجمہ ہے +

کیونکہ مالی و اقتصادی تعلقات کہ جن سے متمدن قومیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں ہمیشہ تجارتی وثوق پر قائم رہتے ہیں۔ اور اس تجارتی وثوق کو ضعیف کرنے والی جنگ کے سوا کوئی شئے بڑھ کر نہیں، اس لئے جہاں فاتح نے یہ ارادہ کیا کہ مفتوح کی تجارت و اموال پر اپنا قبضہ جمائے کہ مفتوح خود اور تمام دنیاے متمدن فوراً اس عمل کے نتائج کو محسوس کرنے لگتی ہے۔

مصنّف نے ایک جگہ انگلستان اور جرمنی کی دشمنی کی مثال دیکر سمجھایا ہے کہ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ جرمنی انگلستان پر قابض ہوجائے تو سب سے پہلی شئے جو ظاہراً ذہن میں متبادر ہوتی ہے یہ ہے کہ اس سے جرمنی کی دولت و ثروت ترقی کرجائیگی اور اُس کی حالت بھی اُس وقت بہتر ہوجائیگی لیکن یہ امر محض بدیہیات سے ہے اور بدیہیات و ظواہر اکثر خادع و فریب دہ ہُوا کرتے ہیں اس لئے یہ بھی ایک فریبِ دھوکا ہے کیونکہ آجکل یورپ میں کسی ملک پر قبضہ کرلینا اور اُس کے اراضی کی ملکیت کو سلب کرلینا محالات سے ہے، اس لئے اگر جرمنی انگلستان پر قابض بھی ہوجائے تو ناممکن ہے کہ اُس کی تجارت کو قبضہ میں کرسکے اس لئے کہ تجارت ایک لحاظ سے تو زمین اور اُسکے اسبابِ ثروت پر اور دوسرے لحاظ سے اُس جگہ کے لوگوں پر موقوف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جرمنی کے قبضہ کے بعد بھی اراضی اپنے مالکوں کے ہی قبضہ میں رہیگی یہ نہ ہوگا کہ وہ ایک دم سارے انگلستان کو آبادی سے خالی کرالے۔ اس لئے تجارت بھی اُن ہی لوگوں کے قبضہ میں رہیگی۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ جرمنی انگلستان پر قبضہ کرکے اُسکے بچّوں بوڑھوں کو ذبح کرڈالے کہ جو ایک فرض محال ہے تب بھی اُسکو کارپردازوں کی ایک عظیم الشان تعداد کا خسارہ ہوگا اور اُس کا یہ عمل بمنزلہ تجارت کی ہلاکت کے ہوگا۔

بہت ممکن ہے کہ بعض اصحاب یہ کہیں کہ فاتح کے لئے بہتر سے بہتر صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ مفتوح سے عظیم الشان تاوانِ جنگ وصول کرے اور اُس سے مستفید ہو اور ویسے عام طور سے بھی تاوان فاتح کے لئے ایک خاصہ منافع معلوم ہوتا ہے جس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ کیونکہ یہ صاف طور سے ظاہر ہے لیکن حقیقتاً یہ امر بھی ایک ظاہری دھوکا ہے کیونکہ تاوان خود جنگ کے نقصان کی کما حقہ تلافی نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ پبلک سے اُسکا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ آتا ہے اور حکومت کے خزانہ میں داخل کردیا جاتا ہے اور عامۃ الناس میں سے اُس سے کوئی

بھی حقیقی فائدہ نہیں اُٹھاتا برخلاف اسکے خسارۂ جنگ کا اثر تجارت کے توقف اور اقتصادی حالت کے اختلال کی وجہ سے قوم کے ہر فرد پر پڑتا ہے۔

مثالاً ہم فرانس و جرمنی کی ۱۸۷۰ء والی جنگ کا تاوان لیتے ہیں، اس جنگ کے حالات میں مورخین نے حساب کر کے بتلایا ہے کہ فرانس کو اس میں ایک کروڑ ستر لاکھ فرانک کا خسارہ ہوا۔ اور جرمنی کو پچاس لاکھ فرانک کا نفع۔ اس قسم کا حساب ممکن ہے کہ پڑھنے والے کو اول نظر میں مطمئن کر سکے لیکن حقیقتاً وہ اقتصادی قوانین سے عدم وقفیت و جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ حساب کرنے والوں نے اُس استعداد کو نظرانداز کر دیا ہے کہ جو ہر دو ممالک کو جنگ سے قبل حاصل تھی اور نیز اُن مالی مشکلات کو کہ جو جنگ کے بعد دونوں کو مساویانہ حیثیت سے حاصل ہوئیں۔ اسکا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ ۱۸۸۰ء میں یعنی جنگ سے دس سال بعد ہی فرانس کی اقتصادی حالت جرمنی سے بہتر ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس وقت جرمنی نے فرانس سے قرض لینے کی کوشش کی تھی۔ اسی بنا پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ۷۰ء کی جنگ بہ نسبت فرانس کے جرمنی اور تمام دیگر یوروپین سلطنتوں کے لئے زیادہ ضرررساں تھی اگرچہ فرانس خود اُس میں مغلوب و ناکام رہا تھا۔

علاوہ اُس خسارہ کے کہ جو بین الاقوامی ارتباط اور تجارت کے باعث حالت جنگ میں اقتصادی حالات کے توقف سے نتیجتہً ظہور پذیر ہوتا ہے۔ تاوان جنگ کے بھی بہت سے مضر نتائج ہیں۔ تاوان جب آتا ہے تو دو حالتوں سے خالی نہیں رہتا، یا تو ملک میں رکھا جاتا ہے یا ملک سے باہر تجارتی سامان کے لئے بھیجدیا جاتا ہے۔ پس اگر وہ ملک میں رہتا ہے تو لوازمات زندگی گراں ہوجاتی ہیں کیونکہ زرنقد کی زیادتی خود زرنقد کی قیمت کو گھٹا دیا کرتی ہے اس لئے جو شئے کہ پہلے ایک پیسہ میں فروخت ہوتی تھی اب دو پیسہ میں فروخت ہونے لگتی ہے۔ اگر وہ تجارتی سامان کے لئے باہر بھیجدیا جاتا ہے تو جو سامان و مصنوعات اُسکے مقابل میں باہر سے ملک میں وارد ہوتی ہیں وہ ملک کی مصنوعات پر غالب آکر ملکی صنعت و حرفت کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی ارتباط و تعلقات جس طرح سے روز بروز مستحکم و مضبوط ہوتے چلے جارہے ہیں اُنکی قوت کا کامل احساس جمہور کو ابھی تک نہیں ہوا ہے لیکن جب اُسے اسکا

صحیح و کما حقہٗ احساس ہو جائیگا اُسے تو پھر وہ جنگ کو بھی فراموش کردیگی، رقتِ قلب اور احساس انسانیت کی خاطر نہیں بلکہ اقتصادی اسباب کی خاطر جبکہ چھوٹا بڑا ہر شخص یہ جاننے لگیگا کہ جنگ غالب و مغلوب دونوں کے لئے مساوی حیثیت سے ضرر رساں ہے، اور ذاتی مصالح ہی بلا کسی جنگ و جدل کے طبیعت بشریہ کے لئے سب سے زیادہ محرک عمل ہُوا کرتے ہیں۔

پس کیا ان بیّن حقائق کے بعد ہم اسکی اُمید کر سکتے ہیں کہ جنگ کا دُنیا سے عنقریب سدِ باب ہوجائیگا یا یہ کہ دول یورپ آئندہ جنگ سے دست بردار ہوجائینگی؟ ہرگز نہیں!! اسلئے کہ جب تک سیاسی آراء و افکار کی رفتار موجودہ روش پر رہیگی یعنی جبتک یہ عقیدہ شائع و ذائع رہیگا کہ فاتحانہ جنگیں قوموں کے لئے باعث ثروت و سعادت ہوتی ہیں اُس وقت تک کبھی اس امر کا احتمال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جنگی و فوجی مصارف میں ایک پائی کی بھی کمی ہو۔ سب سے زیادہ پر لطف امر تو یہ ہے کہ اہل سیاست کے سامنے زندہ نظریں موجود ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ فاتحانہ جنگوں کے فوائد کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ انگلستان نے ٹرنسوال کی فتح میں ڈو کروڑ ساٹھ لاکھ گنّی صرف کر دی لیکن اُس سے ایک پائی بھی وصول نہ ہوسکی بلکہ حکمرانی کی مشکلات سے مجبور ہو کر مزید براں اُسے اندرونی آزادی دینی پڑی، عراق عرب میں اربوں روپیہ صرف کیا گیا لیکن اب اُسکی وصولی تو درکنار اُس پر حکومت کرنا بھی دو بھر ہو رہا ہے، پس جب اہل سیاست کا یہ حال ہے تو عوام کا کہ جو معقولات پسند نہیں بلکہ محض جذبات پرست ہوتے ہیں کیا کہنا، اسلئے جس دن یہ عقیدہ جذبات و عواطف کی رہنمائی سے معزول کردیا جا دیگا اور عقل کو اُس کی جگہ دیجا دیگی، اُسی دن فاتحانہ جنگوں کا بھی خاتمہ ہوجادیگا +

**اسباب جنگ**۔ عند الاختتام اب ہم چاہتے ہیں کہ جنگ کے اُن دیگر اسباب کو یہاں بیان کر دیں جنکو بین الاقوامی آداب سے نہایت عمیق تعلق ہے:۔

۱۔ اخلاقی اسباب۔ علاوہ اقتصادی اسباب کے جنگ کا ایک سب سے زیادہ عام سبب انسانی طبیعت کی اُفتاد بھی ہے یعنی جس مُلک کے انسان کی جس قسم کی طبیعت ہوتی ہے، اُسی حیثیت سے وہ اپنی زندگی میں عمل پیرا بھی ہوتا ہے مثلاً بعض ملک کی طبائع میں منافست، اور بعض کے کبر، اور بعض کے حسد، اور بعض کے شورش انگیزی وغیرہ فطری جذبات ہوتے

ہیں، اور ان میں جب کوئی جذبہ جمہور کے افراد کے اندر عام طور سے فطرتاً ودیعت ہوتا ہے تو پھر سبب زیادہ قوی ہو جاتا ہے، کیونکہ جمہور کی قیادت زیادہ تر اُنکے جذبات ہی کیا کرتے ہیں۔ بہ نسبت بادشاہوں کے کہ وہ تو اکثر عقل سے بھی کام لیتے اور امور کو رد و قبول و تآل اندیشی کے ساتھ انجام دیتے ہیں ؛

۲۔ قوم کے بعض خاص طبقوں کے مصالح کا لحاظ۔ ہر قوم میں بعض ایسے اراکین بھی ہوتے ہیں کہ جو محض جنگ کی اُمید پر روزی پاتے ہیں قطع نظر فوج یا فوجی افسروں و سرداروں وغیرہ کے مثل اسلحہ کے کارخانوں یا جنگی جہازوں کے کارخانوں وغیرہ کے کہ اُن میں ہزارہا انسان محض جنگ کی خاطر کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جرمنی کا شہرۂ آفاق کرپ کا کارخانہ کہ جس میں ستر ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے پس اگر جرمنی اُن سے اسلحہ بنوانا بند کر دیتی تو سب کے سب بیکار ہو کر باعث فساد ہوتے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی بھی کہ جرمنی اس عظیم الشان و مسلح و ماہر گروہ کے جذبات و مصالح کا بھی خیال کرتی چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم کے محرکات میں اس گروہ کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ اور یہ طبقہ ملک کے بڑے بڑے اخبارات خرید کر اُنکے ذریعہ سے عام رائے کو اپنی خواہش کے موافق بنانیکی کوشش کرتا رہتا تھا۔ نیز صانعین اسلحہ و جنگی جہازات سے طبعاً اسی قسم کی اُمید ہو بھی سکتی ہے ؛

۳۔ تناسل قبائل و تنگی ملک۔ نسلی تعلقات اور تنگی مُلک بھی گذشتہ اور موجودہ زمانوں میں اسباب جنگ میں سے ایک اہم سبب رہا ہے، جاپانیوں نے اس وجہ سے کوریا پر قبضہ کیا۔ اطالویوں نے اسی لئے طرابلس الغرب کو غصب کیا۔

۴۔ تسلسل حوادث اور اُنکا باہمی ارتباط۔ اگرچہ بادی النظر میں دُنیا کے واقعات خصوصاً جنگوں میں آپس میں کوئی تعلق وارتباط نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقتہً کہ ان میں نہایت گہرا تعلق ہے چنانچہ جنگوں کے اسباب میں سے ایک سبب یہ تسلسل حوادث اور اُنکا مابینی ارتباط بھی ہے۔ اگر گذشتہ دس بارہ سال کے واقعات کو اس وقت سامنے لایا جائے تو سب ایک دوسرے سے زنجیر کی طرح مربوط معلوم ہوتے ہیں، مثلاً آسٹریا نے جب ہرزیگوینا اور بوسینیا کو ہضم کیا تو اٹلی اسکو برداشت نہیں کر سکی اُس نے طرابلس کو غصب کیا، طرابلس کی جنگ ختم نہ ہونے پائی

تھی کہ ریاستہائے بلقان نے ترکی کے ضعف کو مغتنم سمجھا اور فوراً ترکی کے ساتھ جنگ بلقان شروع کردی، اس جنگ بلقان کی وجہ سے دول یورپ کے توازن میں فرق آگیا چنانچہ اسی کا تتمہ تھا کہ جو گذشتہ ہولناک جنگ کی صورت میں نمودار ہُوا، اور اس ہولناک جنگ کا باعث ہے کہ جو اناطولیہ کی جنگ ہُوئی اور اسی اناطولیہ کی جنگ کا سبب ہے کہ آج پھر دوسری مشرقی جنگ کے بادل لاسین میں منڈلا رہے ہیں۔

ارباب سیاست واموال اپنے اعمال کے بعید نتائج پر نظر بہت کم ڈالتے ہیں۔ اور خود بھی سیاسی حوادث وواقعات کی تعقید وپیچیدگی انہیں اس سے معذور رکھتی ہے مثلاً جنگ سے پہلے جو قرض فرانس نے روس کو دیا تو اسکو اسکا وہم گمان بھی نہ تھا کہ اُسکا یہ روپیہ سب کا سب اُس کے دشمن جرمنی کے نزدیک چلا جائیگا، چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ کیونکہ اس قرضہ سے روس کی تجارت جرمنی کے ساتھ سہ گُنا ہوگئی تھی۔

**۵۔ مصارف تسلیح**۔ دول کے درمیان ہتیار بندی وتسلیح کے مصارف کی منافست بہت زیادہ رہتی ہے، یعنی ہر سلطنت اس امر کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ فوج اور اسلحہ کے مصارف میں وہ دیگر سلطنتوں سے کسی طرح کم نہ رہے اس لئے کہ ضعف وقوت اور مدافعت وحفاظت کا زیادہ تر دارومدار اسی پر ہے، اور یہ منافست اب روز بروز اس طرح سے بڑھ رہی ہے، کہ عجب نہیں کہ یہی آئندہ سلطنتوں کے لئے باعثِ فقر وافلاس اور تباہی وبربادی ہو۔

یہ وہ اسباب جنگ ہیں جو بین الاقوامی آداب سے عمیق تعلق رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ ہم نے بیان کیا اُن سے ناظرین کرام کو معلوم ہُوا ہوگا کہ بین الاقوامی آداب بین الافرادی آداب سے بہت زیادہ پست ہیں کیونکہ انکے درمیان سوائے قوت ومصالح کے کوئی قانون نہیں اور نہ اُن پر کوئی ایسی قوت کہ جو اُنکے مظالم واعمال سیئہ کا احتساب کرکے اُنہیں سزا وجزا کو پہنچائے۔

ابو النصر سید احمد بھوپالی

# سفرِ سقر

ذیل کا گرانقدر مضمون مشہور ادیب جناب سلطان حیدر جوش کی تراوش قلم سے ہے۔ یہ ایک مسلسل مضمون کی پہلی قسط ہے، جس کا کچھ حصہ "جان بل" کے نام سے نقیب مرحوم (بدایوں) میں شائع ہو چکا ہے، تسلسل قائم رکھنے کی غرض سے مطبوعہ حصہ بھی شائع کیا جاتا ہے ۱۲

## نقطۂ نظر

اشیائے عالم بنفسہٖ نہ اچھی ہیں نہ بری۔ خوشنما و بدنما البتہ کہی جا سکتی ہیں!

خوش نمائی و بدنمائی زیادہ تر ناظر کے نقطۂ نظر پر مبنی ہے!

بیکار و با کار ہونا دوسری تقسیم موجوداتِ عالم ہے، لیکن انسان کسی چیز کو باکار و بیکار محض اپنے دائرۂ استعمال و احتیاج کے لحاظ سے قرار دیتا ہے۔" بقیہ حیوانات کو نظر انداز کر دینے کا حق اُسے حاصل ہے یا نہیں؟" کوئی نہیں بتا سکتا!

دائرۂ استعمال و احتیاج ترقی یافتہ حصّۂ دنیا کے زیرِ اثر رہتا ہے!

تہذیب و ترقی معاشرتِ رائج الوقت کا دوسرا نام ہے!

کسی فردِ واحد کا نقطۂ نظر کبھی مجرد ذاتی نہیں ہو سکتا!

نقطۂ نظر تمامتر دماغ کے معیارِ پسند و نفرت پر مبنی ہے!

تمام دماغی مفروضات و معتقدات عمر کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے اور پختہ ہوتے ہیں پیدا ہونے اور پختہ ہونے کے زمانہ میں معاشرتِ جدید ہمیشہ متاثر کرتی رہتی ہے!

معیارِ پسند و نفرت گرد و پیش کے اثر سے بنتا ہے!

گرد و پیش سے پڑنے والا اثر زیادہ تر انسانی افراد کے ذریعہ سے پڑتا ہے!

گویا۔ معاشرتِ ترقی پذیر کے پختہ کار افراد، ایک اثر پذیر و نوخیز دماغ کو اپنے مفروضات و معیارِ حیات کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں!

کسی فرد واحد کا نقطۂ نظر فی الحقیقت اُس دائرۂ معاشرت کا نقطۂ نظر ہے جس میں اُس نے اسے حاصل کیا!

نقطۂ نظر کا دائرۂ معاشرت کے لحاظ سے صحیح ہونا تربیت کے مکمل ہونے پر منحصر ہے

ہر نقطۂ نظر اپنی ساخت کے زمانہ میں معاشرت کے ساتھ تغیّر پذیر ہوتا ہے!

تغیّر ہمیشہ رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے ہوگا!

رفتارِ زمانہ فی الحقیقت انسانی دسترس سے باہر ہے!

انسانی دسترس کا دائرہ منطق کی زبان میں غیر محدود اور عمل کی حدود میں نہایت تنگ ہے!

حکمران افراد معاشرت پر بھی حکومت کرتے ہیں!

حکمرانی۔ کچھ بھی کہا جائے۔ طاقت و جذباتِ حیوانی کی ایک ملبوس شکل ہے!

اس کا حصول فی الحقیقت ہمیشہ سے "جس کی تیغ اُس کی دیگ" کا پابند رہا ہے!

تیغ اکثر اوقات فولاد کے بجائے قلم اور زبان کی بھی ہوتی ہے!

بُرشِ نیک قلم کی عامل ہو تو اُسے تیغ ہی کہا جائیگا۔ خواہ تیغ قلم ہو یا تیغ زبان۔ خون ہر ایک سے ہوتا ہے، بلکہ تیغ فولاد کی کاٹ چھانٹ ظاہری ہوتی ہے اور زبان کی پسِ پردہ!

حصّۂ حکمران کے ہاتھ میں معاشرت کی تکمیل ہوتی ہے!

حکمران بن جانا کوشش کے ساتھ اتفاقات پر بھی مبنی ہے!

اتفاقات نہایت غیر متیقن چیز!

یہ اور وہ سب غیر متیقن: دلائل، لاطائل!

مسٹر دنیائے مغرب کا ایک بیدار مغز اور آزاد خیال فرد ہے یا اس کا نقطۂ نظر مغربی تمدن میں بنا ہے۔ وہ حکمران اقوام کا ایک پُرزہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سفر پر کمر باندھتا ہے اور "جاہلستان" کو اپنی سیاحی کا تختۂ مشق بناتا ہے!

جاہلستان کے حدودِ اربعہ جغرافیہ کسی اور نام سے بتائے تو بتائے، لیکن ہم بتانے سے قاصر ہیں۔ مسٹر ہی کے الفاظ ہیں کہ آفتاب کی شعاع مسٹر کے وطن سے وہاں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ہوا بعض زمانہ میں گرم ہوتی ہے، آسمان تاروں بھرا ہوتا ہے۔ اور

حرارتِ آفتاب ذی رُوح تک کو پکے رنگ میں رنگ دیتی ہے: اس سے زیادہ اَتا پتا ہمیں معلوم نہ ہو سکا!

جاہلستان کی آبادی ایسی ہی جیسی اس کے نام کے لحاظ سے ہونی چاہیئے! البتہ حکومت کی باگ ایک بیرونی عنصر کے ہاتھ میں ہے جو دُنیائے مہذب سے تعلق رکھتا ہے!

سفرنامہ "مسٹر" نے اپنے رنگ اور اپنے خیالات کے مطابق لکھا ہے: لہذا نقطۂ نظر کا ذمہ دار بھی خود "مسٹر" ہے، نہ مصنف!

مسٹر کا ترانہ مسٹر کی زبان سے سُنئے:-

## اسبابِ سفر

مہذب آباد کی دن دونی رات چوگنی بڑھنے والی سلطنت کی ترقی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے "جاہلستان" اس کی حکومت کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ جاہلستان کو سمجھنے والے "سونے کی چڑیا" سمجھتے آئے ہیں، مگر مدت ہُوئی کہ یہ پر قینچ ہو گئی!

اس چڑیا کی صفت میں نے بھی سُنی تھی کہ نغمۂ دلکش کے ساتھ طبع سادہ رکھتی ہے، اور سادہ لوح کو عقلمند ہمیشہ سادہ لوح یا بیوقوف کہتا ہے۔ اس لئے میں جاہلستان کا شائق تھا۔ موقع ہاتھ آتے ہی جاہلستان پہنچا!

میرے کئی دوستوں نے مجھے دعوتِ سیاحی اپنی تحریر کے ذریعہ سے دی تھی۔ ایک صاحب نے اپنی تحریر میں یہ بھی لکھا تھا۔ اور غالباً کسی قدر شوخی کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ آفتابِ عالمتاب ان کی حدودِ سلطنت سے ۲۴ گھنٹے میں سے ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہیں جاتا۔ دعوے سے تو صحیح مگر میری نظر میں اس کا وہ رُعب نہیں قائم ہُوا جو میرا دوست چاہتا تھا! میرے خیال میں بچارا آفتاب قدرتِ منصف مزاج کی طرف سے متعین ہے کہ موجوداتِ عالم کی افعال کی نگرانی بھی کرے!

چالاک دیر پُر فطرت عنصر کے افعال و حرکات پر چوبیسوں گھنٹے روشنی ڈالنا وہ اپنی نگرانی کا جزوِ اعظم سمجھتا ہے! اس سے کسی عظمت کا استدلال نہیں کیا جا سکتا!

"جاہلستان" کی نسبت جغرافیہ نگاروں نے ضرورت سے زیادہ لکھ دیا ہے، مجھے اُس کے حدودِ اربعہ بیان کرنے میں تضیعِ اوقات کی حاجت نہیں: میں یہ لکھوں کہ وہ کوہستان شمالی کی سر بفلک کشیدہ چوٹی سے اس جنوبی کے نقطۂ انتہائی تک اتنے ہزار میل لمبا ہے، تو گویا بلا ثبوت عینی جغرافیہ کے بیان کی تصدیق کروں! یقین کیجئے، میں نے نہ خود کبھی اس کا طول و عرض ناپا اور نہ مجھے معلوم کہ مجھ سے پیشتر کس کس نے ناپا ہے: میں سیاح تھا زمین ناپنے کا گز نہ تھا!

جاہلستان کی سیاحی میں کم و بیش تمام دنیا کی ہر قوم مجھے ملی مگر اصلی باشندے صرف دو گروہ پر منقسم ہیں اور یہی تقسیم سب سے بڑی ہے! ان دونوں گروہوں کی تقسیم کس بنا پر ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس سے مجھے تعلق نہیں ہے! میری نظر میں ان دونوں میں بہت کم فرق ہے؛ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے، قریب قریب ایک ہی معاشرت کے عادی، ایک ہی طرزِ زندگی کے عامل، ایک سے نقشہ قد و قامت کے ساتھ۔ سب کالے۔ پھر فرق نظر آتا تو کیا آتا؟

بڑے غور کے بعد اس قدر دریافت ہو سکا کہ ایک گروہ دھوتی باندھتا ہے اور دوسرا پائجامہ پہنتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دھوتی اور پاجامہ بھی قطعی طور پر نشانِ امتیاز کا کام نہیں دیتے! اکثر دھوتی بند گروہ پائجامہ میں نظر آتا ہے اور کمتر پاجامہ پوش افراد بھی دھوتی میں دکھائی دیتے ہیں! دھوتی کیا چیز ہے؟ میں اس کی تعریف کے بجائے تصویر کھینچ دوں مگر مجھے خیال ہے کہ میری تحریر "لیڈیز" کی آنکھوں سے بھی دیکھی جائیگی، اس لئے خیال گستاخی مانع ہوتا ہے۔ پائجامہ ایک ایسی جامع و مانع پوشاک ہے کہ رات کے سونے کے ڈھیلے ڈھالے پتلون سے لیکر پنڈلیوں پر چسپت ہونے والی "برجیز" تک ہر کاٹ اور وضع کی ہوتی ہے اور ہوتی ہے!

میرے ایک دوست نے اس تفریق کا نشان امتیاز ڈاڑھی بتائی تھی۔ مگر فی الحقیقت یہ بھی میرے تجربہ کی کسوٹی پر پوری نہیں اُتری! جن کو ڈاڑھی رکھنی چاہیئے وہ آجکل آب و ہوا کے لحاظ سے چہرہ کو صاف رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بعض صورتیں جو منڈی ہوئی ہوتیں اچھی خاصی ڈاڑھی لٹکائے نظر آتی ہیں! ڈاڑھی لگانے یا نہ لگانے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں، ایک شخص کل تک صاف تھا تو آج اچھی خاصی گونچی اُس کی ٹھوڑی پر نظر آرہی ہے اور یہ ہی

کل پھر صاف۔

یہ ہر حال آبادی دو گروہوں میں تقسیم ہے اور ضرور ہے۔ وجہ تقسیم کچھ بھی ہو کوئی امتیاز ظاہری نہیں۔ ممکن ہے کوئی پوشیدہ علامت ہو مگر ظاہر بین نظر کسی طرح "اکس ریز" کا کام انجام نہیں دے سکتی! یا تو وجہ تقسیم میری سمجھ میں نہیں آئی اور یا وہ ایسی موہوم ہے کہ کسی عقلمند کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تاہم اس تقسیم کا وجود ہے اور بین ہے!

جاہلستان کی ہر چیز اسی تقسیم کی طرح عجیب مہمل اور بے بنیاد ہے۔ کم از کم مجھے ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی سرزمین کا سفرنامہ بھی مہمل ہونا چاہیئے! میں نے اپنے اثنائے سفر میں ہمیشہ اُس بات یا اُس چیز کو نوٹ کیا جو مجھے غیر معمولی، عجیب، یا قابل بیان نظر آئی!!

میرا خیال ہے کہ میرے مشاہداتِ سفر کو سمجھنے کے معنی جاہلستان کی اصلیت سمجھ لینا ہے!!

## آسمان و زمین

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں کسی مُلک کے طول و عرض کو لمبے لمبے اعداد میں بیان کرنیکی حماقت کا کبھی مرتکب نہیں ہُوا۔ تاہم اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ جاہلستان اپنے رقبہ کے لحاظ سے یورپ کی چند سلطنتوں کے برابر اکیلا سمجھا جا سکتا ہے!

زمین، پتھریلی سے لیکر ریتلی تک، سرسبز و شاداب سے لیکر بنجر و ویران تک، ہر قسم کی ہے اور ہو سکتی ہے! دریا، تمام ملک میں اٹھلاتے پھرتے ہیں اور کوئی اُن کا پُرسان حال نہیں! پرسانِ حال سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس روش سے وہ عہادیوجی کے زمانہ میں بلا روک ٹوک بہتے تھے آج تک اُسی طرح چڑھتے، اُترتے، گرمیوں میں سوکھتے، برسات میں سینکڑوں جاندار کوڈبوتے، لہریں مارا کرتے ہیں! کہیں کہیں مہذب آباد کے ہاتھ نے اپنی ضروریاتِ آمدنی کے مطابق نہریں نکالی ہیں، مگر خدا کا شکر ہے کہ جاہلستان کی آبادی بذاتِ خود اب تک اِس ضرورت کو کماحقہٗ محسوس نہیں کرتی! زمین کی پیاس عموماً آسمان کی فیاضی سے بجھتی ہے، اور جس دفعہ ملائے اعلےٰ کا محکمۂ آب رسانی کسی پوشیدہ وجہ سے امساک باراں کا اظہار کرتا ہے تو بیچاری زمین پیاسی اور زمین والے بھوکے مرا کرتے ہیں!!

زمین بذاتِ خود سونا سمجھی جاتی ہے اور غالباً صحیح سمجھی جاتی ہے! بیرونی دنیا ہمیشہ سے جاہلستان کو سونے کی کان سمجھتی آئی ہے اور اسی وجہ سے دنیا کی ہر قوم پنجوں پر اُچک اُچک کر دوربین کی امداد سے اس زرخیز زمین کو دیکھا کرتی ہے! اب بھی مہذب آباد کی چند بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف ٹکٹکی باندھے نظر آتی ہیں: بعض زمانہ شناس اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کی رائے ہیں، بھاری بھرکم افراد کی آنکھیں جاہلستان پر نہیں ہیں بلکہ دانت ہے! جو کچھ بھی ہو، اہل الرائے کا اتفاق ہے کہ جاہلستان کی سرزمین اپنی کیفیت وکمیت کے لحاظ سے مشرق کی ناک ہے!

آب و ہوا بھی سمجھ لیجئے کیسی ہوسکتی ہے! افریقہ کے صحرائے اعظم سے لیکر فرانس کے شمالی حصّہ تک جیسی جیسی آب و ہوا نظر آتی ہو وہ سب، جاہلستان کے اندر یا آس پاس، کسی نہ کسی جگہ موجود ہے؛ مگر فرانس جیسے انسان مفقود ہیں! آب و ہوا میں یکسانیت کا پتہ نہیں! کہتے ہیں آج سے کئی صدی پیشتر بارش بکثرت ہوا کرتی تھی، آندھیاں خوب آیا کرتی تھیں، گرمی بہت پڑا کرتی تھی اور اب ہر چیز نسبتاً کم ہوگئی ہے: میں اول تو اس مزخرفات کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اور بفرض محال مان بھی لوں تو مجھے صاف نظر آتا ہے کہ یہ مہذب آباد کے اثر کا نتیجہ ہے! پہلے اس ملک کے موسم بھی یہاں کے باشندوں کی طرح جہالت سے معمور تھے۔ اُن میں افراط و تفریط کا وجود نمایاں تھا! اب سائنس کے ہاتھ نے اُن کو بھی کاٹ چھانٹ کر قابل برداشت حد تک کم کر دیا ہے! تاہم یکسانیت اب بھی مفقود ہے اور مہذب آباد کی رائے ہے کہ ابھی عرصۂ دراز تک مفقود رہیگی یا رکھی جائیگی!

میں نے اکثر بلبل کو گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بولتے سُنا، نغمہ نواز طیور کو بلا کسی پابندیٔ اوقات کے چہچہاتے دیکھا! بہار کے موسم میں ایک ہی درخت میں، ایک طرف برگ و بار کا نمو اور دوسری طرف پت جھڑ، مجھے صاف نظر آیا! یہ سب قدرتی علامات ہیں اُس نااتفاقی کی جو جاہلستان کی رگ و پے میں سرایت کرگئی ہے! مہذب محققین کا خیال ہے کہ بفضلہٖ یہ نااتفاقی نہایت مضبوط اور دیرپا اصولوں پر قائم ہے اور حسب ضرورت غور و پرداخت کے زیر عمل ہمیشہ کے لئے مستقل بنائی جاسکتی ہے! اسی کو بیرونی مدبرین فالِ

نیک سمجھتے آئے ہیں!

جاہلستان کی آب وہوا۔ زیادہ تر۔ اٹلی کے جنوبی حصہ کی آب وہوا سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، اگر جاہلستان کی آب وہوا سے دورنگی یا ناہمواری علیحدہ کرلی جائے تو دونوں جگہ کی آب وہوا میں بہت تھوڑا فرق رہ جاتا ہے! گرمی دراصل اس ملک کا اصلی اور زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والا موسم سمجھا جا سکتا ہے، تاہم بجلی کے پنکھوں کا استعمال صرف چند شہروں کے متعدد نفوس تک محدود ہے؛ عام طور پر برہنگی گرمی کا جائز دفعیہ سمجھی جاتی ہے! جاہلستان کی ۸۰ فیصدی آبادی گرمیوں میں کسی سایہ دار درخت کے نیچے، کھری کھاٹ پر، کروٹیں بدلنے، پسینہ نکالنے اور پھنکارنے ہیں، دوپہر سے شام کرنے کی نسلاً بعد نسلٍ عادی چلی آتی ہے! جسم کا کم وبیش ۱/۸ حصّہ گرمی کے موسم میں ممنونِ لباس ہوتا ہے اور اسی قدر تن پوشی جاہلستان کی تہذیب کے لحاظ سے۔ کافی سے زیادہ سمجھی جاتی ہے!

ہوا گرمیوں میں لُو اور آندھی بن جاتی ہے، جاڑوں میں برفستانی نظر آتی ہے، اور برسات میں اکثر غائب ہو جاتی ہے! لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ برسات کے بعض جھونکے ہاؤس آف لارڈز (دہسکی) کے ایک پورے پگ سے زیادہ اندوہ رُبا اور مسرور آور ہوتے ہیں! ہوا میں تمام وبائی امراض کے جراثیم پیدا کر لینے اور قائم رکھنے کی خاص قابلیت پائی جاتی ہے! ہیضہ اور موسمی بخار جس میں کالا، لنگڑا، لال اور اندھا سب بخار شامل ہیں۔ اس ملک کی ہوا سے ہمیشہ متمتع ہوا کرتے ہیں اور ہر سال اُن کی مجموعی اور معمولی کوشش جنگ یورپ کے کسی مشہور حملہ سے موت کے اعداد میں کم نہیں رہتے! مہذب آباد کے پاس نہ اس قدر ذرائع ہیں اور نہ اتنا وقت کہ اس سالانہ قطع و بُرید کا استیصال مستقل کرسکے: مجبوراً مرنے والے مرتے ہیں اور سخت جان پھر بھی رہ جاتے ہیں! طاعون اور انفلوئنزا نے بھی اس ملک سے ایسا جنگی خراجِ موت لیا کہ شاید حضرت عزرائیل کو برائے چندے عملۂ زاید کی ضرورت محسوس ہوئی ہو!

جاہلستان کا صاف شفاف آسمان، برسات کے ہلکے ہلکے اور رنگ برنگے بادلوں میں، طلوع وغروبِ آفتاب کے ایسے نظرفریب مناظر پیش کرتا ہے جن کے اظہار کے لئے

ریفیل اور ٹیشین کا برش یا معنی و بہزاد کا قلم درکار ہے! اُجالی رات کا چاند اور اندھیری رات کے بیشمار تارے، تخیلات میں ایسی چسک اور شعریت پیدا کرسکتے ہیں کہ دیکھنے اور محسوس کرنے والا لغمہ لب ریز بن جائے! مگر جاہلستان کے ناظم اظہار جذبات سے اور نقاش مصوری فطرت سے عموماً کوسوں دُور ہیں! وہ جس شب ہجر یا شام وصال کی تصویر کھینچتے ہیں مجھے کہیں نہیں ملی! البتہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق بات چیت میں بڑے کمال کی شاعری کرتا ہے! باہر والے اس کو دروغ گوئی سے تعبیر کرتے ہیں مگر یہ فی الحقیقت جاہلستان کی شاعری ہے اور بس!

جاہلستان کی اور چیزیں جہاں مجھے عجیب و غریب نظر آئیں وہاں آسمان و زمین بھی ایک معمّہ معلوم ہوئے: اپنے سفر کے تمام تجربات کی بناء پر میں اس مُلک کے آسمان و زمین کی نسبت صرف اس قدر مختصراً کہہ سکتا ہوں کہ "زمین سخت ہے اور آسمان دور"!!

---

عراق عرب کے ایک قریہ میں قاضیٔ شہر کی عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ عورت مدعی تھی اس نے کہا میرا خاوند مجھ کو مارتا ہے اور تنگ رکھتا ہے قاضیٔ شہر نے خاوند کو بُلایا اور پوچھا تو اپنی بیوی کو کیوں مارتا ہے اور کیوں تنگ رکھتا ہے اس کے حقوق کا کیوں لحاظ نہیں رکھتا۔ خاوند نے کہا سچ بات ہے اور اصلی معاملہ یہ ہے کہ یہ عورت نہایت درجہ نافرمانبردار اور سرکش ہے میری کوئی بات نہیں سنتی اور زبان درازی کرتی ہے۔ قاضی صاحب نے شہادتیں لینے پر عورت کا دعوےٰ خارج کردیا اور اسکو سمجھایا کہ دیکھو خدا اور رسول کا حکم ہے کہ خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ اگر تم ایسا کروگی تو تمہارا خاوند بھی تمکو تکلیف نہیں دیگا۔ عورت نہایت جھلائی اور یہ کہکر چلتی بنی "ہاں صاحب سچ کہتے ہو خدا بھی مرد رسول بھی مرد عورت بچاری کی کون سُنتا ہے"!

(الہلال)

# ہرمن

المانیا کے وسیع میدان جو کل تک پریشانی اور سُنسانی کا وحشتناک منظر پیش کر رہے تھے آج اِنسانی زندگی کی رونقوں اور برکتوں سے معمور تھے۔ خیموں کا ایک سِلسلہ تھا۔ جو دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ اور اس منتظم طریقے ہیں۔ کہ گویا ایک شہر آباد ہے۔ کیونکہ روما کی متمدن مخلوق نے خیموں کی عارضی آبادی کو بازاروں۔ دوکانوں۔ تماشہ گاہوں۔ اور تفریحوں کے تمام سامانوں سے آراستہ کر رکھا تھا۔ عین وسط میں فتحمند سپہ سالار کا عظیم الشان خیمہ تھا۔ جس پر روما کا عقابی جھنڈا فتحمندانہ انداز سے لہرا رہا تھا۔ جب غروب ہونے والے آفتاب کی زرد کرنیں خیموں کی بلند چوٹیوں سے فرطِ عقیدت سے گلے مل رہی تھیں۔ تو ایک بلند قامت خُوشرو نوجوان جس کا سُرخ و سپید چہرہ شباب کی مُسرتوں سے روشن تھا۔ سپہ سالار کے خیمے سے برآمد ہُوا۔ اور مغرور اور سرکش رومن سپاہیوں کی گردنیں تعظیم سے جُھک گئیں۔ وہ مُسکراتا ہُوا بازار میں سے گذرا۔ اور آبادی سے دُور نِکل گیا۔ مگر بار بار پیچھے پھر پھر کر دیکھتا تھا۔ گویا جاننا چاہتا تھا۔ کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا۔ چاند اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ اور اُس کی خنک نُورانی شعاعیں سفید خیموں کے آغوش میں کھیل رہی تھیں۔ دُور کھڑے ہو کر جب اُس نے خیموں کی باقاعدہ قطاروں پر نگاہ ڈالی۔ تو وہ اُن کی شان و شوکت سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا اُس کے جذبات میں ایک غیر معمولی تلاطم پیدا ہُوا۔ اور وہ بے اختیار پکار اُٹھا "مادرِ وطن تیرا سینہ زخمی ہے۔ اور تیرا دل خون ہے۔ کہ تیرے فرزند مغلوب ہیں۔ مگر اب خوش ہو۔ کہ انتقام کا وقت آ گیا۔ اپنی غلامی کی زنجیریں اُتار پھینک۔ کہ تیرے فرزند مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئے المانیا کے احرار اپنے مغرور سروں کو بلند کرینگے۔ اور اب دُنیا کی کوئی طاقت بھی اُنکو جُھکا نہ سکے گی قریب ہے۔ وہ دِن۔ کہ المانیا کے جنگل آزادی کی جنگ کے نعروں سے گونج اُٹھیں گے۔ طالبانِ آزادی کی خون آشام تلواریں نیاموں سے نِکل آئیں گی۔ اور آزادی کے دشمنوں کو

خاک و خوں میں ملادینگی"۔ یہ کہکر وہ اپنے جذبات کو ضبط نہ کرسکا۔ غصے سے دانت پیسنے لگا۔ اور مکہ تان کر بولا"۔ ظالم حکومت کے ظالم کارندو۔ میرے وطن کی سرزمین تمہیں نگلجائیگی۔ دنیا ہماری جدوجہد پر آفرین کہیگی۔ اور تمہاری حماقتوں پر خندہ زن ہوگی وہ دن دور نہیں جبکہ اٹلی کی ہوائیں تمہاری بے وقت موت پر ماتم کرینگی۔ اور مغرور سلطنت کے یتیم فرزند اپنی بے بسی پر نوحہ زن ہونگے۔ مادر وطن" وہ لیٹ گیا۔ اور زمین کو بوسہ دے کر کہنے لگا"۔ مادر وطن۔ وقت آگیا۔ کہ تیرے دشمن تباہ ہوں۔ اور تیرے فرزند فتحمند۔ اب دشمنوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں تیرے نازک سینہ کو زخمی نہیں کرسکتیں۔ اجنبیوں کی تلواریں تیرے فرزندوں کو مرعوب نہیں کرسکتیں۔ میرے آنسوؤں کی نذر قبول کر۔ اور یقین مان لے۔ کہ غلامی کا زمانہ ختم ہوگیا"۔ وہ رونے لگا۔ اُس کی سسکیوں کی آواز ہوا میں گونجی۔ شام کے سکوت کے پردوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ اور ایک جنگجو۔ وحشیانہ لباس میں ملبوس۔ نیزہ تانے نمودار ہوا۔ اُس کی آنکھیں جوشِ غضب سے سُرخ ہورہی تھیں۔ اور اُس کا لمبا طویل قد غصے کی شدت سے لرز رہا تھا۔ وہ کڑک کر بولا"۔ المانیا کی آزادی کے دشمن تیار ہوجا۔ تیرا وقت آن پہنچا"۔ نوجوان اُٹھا۔ اُسکے لبوں پر ایک کمزور سی مسکراہٹ تھی۔ دو قدم آگے بڑھا اور پکارا"۔ میرے باپ۔ کیا بیوفا زمانے نے مجھے اس قدر تبدیل کردیا ہے۔ کہ باپ اپنے بیٹے کو بھی پہچان نہیں سکتا"۔ آنے والا محوِ حیرت رہ گیا۔ اور بے اختیار پکار اُٹھا"۔ میرا بیٹا"۔ یہ کہکر نوجوان کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ دونوں مدتوں بعد ملے تھے۔ فرطِ مسرت سے رونے لگے اور جب دل کا بخار نکل چکا۔ تو باپ نے تعجب سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔" ہرمن میرے بیٹے۔ تو بہت خوبصورت ہے۔ تیئس سال گزرے۔ جب المانیا کو اجنبیوں نے اپنے ناپاک قدموں سے پامال کیا۔ تو اُس وقت ننھا بچہ تھا۔ اور آج خوشرو جوان ہے"۔ ہرمن بولا"۔ بزرگ باپ۔ تب میں اپنے وطن کی غلامی کا پیغام بن کر گیا تھا۔ اور اب اُسکی آزادی کا مژدہ بن کر آیا ہوں۔ یہ سب خیمے جو تم دیکھتے ہو۔ انتقام کی آگ کے منتظر ہیں۔ وہ تمام زندہ مخلوق جو فتحمندی کے غرور میں اپنے انجام سے بے خبر کیڑے کے اِن عارضی گھروں کو آباد کررہی ہے۔ بے بسی کی موت مرنے والی ہے۔ جنگل کے درخت جو آج زندوں پر

جھوم رہے ہیں۔ کُل مُردوں کے آخری مسکنوں پر جھومیں گے۔ اور دُنیا کی تاریخ غلام قوم کی شجاعت
اور جوانمردی کے قصیدوں سے منور ہو جائیگی۔ سردار فخر و غرور سے بیتاب ہو گیا۔ اور پکارا "میرے
بزرگوں کی روحو۔ شادماں ہو۔ کہ تمہیں ایسا بیٹا نصیب ہُوا" ہرمن بولا "میں نے شان و شوکت
کے بہت مناظر دیکھے۔ روما کی آبادی میری مداح تھی۔ روما کا باجبروت شہنشاہ میرا قدر دان تھا۔
اٹلی کی مغرور بیٹیوں کی سیاہ آنکھیں مجھے فراموشی سکھاتی تھیں۔ لیکن اپنی سرزمین کا ناچیز اور
حقیر پھول جو برف کی سرد تہوں میں دبا ہُوا ہے۔ مجھے ان تمام اسباب عیش و تنعم سے زیادہ
عزیز ہے۔ اپنے وطن کی سرد ہوا کی سرسراہٹ میں ایک نغمہ ہے۔ جو مجھے بے اختیار عالم
بالا کی جانب لئے جاتا ہے" سردار نے اپنا نیزہ خیموں کی جانب تانا اور کہا "یہ سرزمین جسکی
مٹی ہرمن سے فدائی پیدا کر سکتی ہے۔ غلامی کی بندشوں میں گرفتار نہیں ہو سکتی" ہرمن چلایا
"باپ۔ اہل روما۔ آ گئے۔ کہ اپنے قیمتی خون سے ہمارے بنجروں کو سیراب کر دیں۔ اُن کے جسم
ہوا کے پرندوں کو مدعو کر رہے ہیں۔ اور اس سرزمین کے گڑھے اُنہیں نگلجانے کے لئے مُنہ
کھولے ہُوئے ہیں۔ میں اُنہیں اُن کی تقدیر بن کر یہاں لے آیا ہوں۔ اُن کا سردار فتحمندی
کے نشہ میں سرشار ہے۔ میری سُنتا ہے۔ اور فال نکلواتا ہے۔ اور دونوں اُسے کہتے ہیں۔
بڑھتے چلو" سردار کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پھر گلے سے لگالیا۔ اور دونو
خاموشی سے پھر خیموں کی جانب دیکھنے لگے۔ گویا کہ وہ دو عقاب تھے جو اپنے شکار پر جھپٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔

## ۲

نوجوان نے کہا "آہ۔ میری آرزوؤں کو نہ ٹھکرا۔ میری تمناؤں کو پامال نہ کر" نازنین
نے اپنا چھوٹا سا نیزہ فوجی خیمہ گاہ کی جانب موڑا۔ اور مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ نوجوان
جذبات سے مجبور ہو کر چلا اُٹھا "میری پیاری۔ کہو۔ کچھ بولو۔ مجھے حکم دو۔ کہ میں اپنے آپکو
تمہارے قدموں پر نثار کر دوں" نازنین بولی "جاؤ۔ اور اُن ظالموں کے خیموں کو آگ لگادو
میں اُس آگ کی روشنی میں تم سے محبت کرنیکا وعدہ کروں گی۔ تم ڈرتے ہو۔ یہ نہیں تو
مجھے روما کے سردار کا سر لا دو۔ تا کہ مجھے یقین ہو جائے۔ کہ تم اپنے مُلک کے دشمنوں کو
چھوڑ چکے۔ مگر تم کانپ رہے ہو۔ لاؤ۔ یہ سونے کی زنجیر جو المانیا کے شجاع فرزندوں

کے لباس کی زینت ہے۔ مجھے دیدو۔ کہ کسی لڑکی کو پہنا دوں۔ یہ پیٹی جسے رومن اجنبیوں کے
ہاتھوں نے ناپاک کر دیا ہے۔ اُتار ڈالو۔ یہ کُتّوں کے پٹکوں کے لئے زیادہ موزوں ہے"
نوجوان نے غصّے اور ندامت سے اپنے ہاتھ کاٹے اور کہا۔ "نہ جانے۔ تو کیوں اہلِ روما
سے اس قدر متنفر ہے۔ وہ مہذب ہیں۔ اُنہوں نے دُنیا کو تہذیب سکھائی ہے معزز باپ
کی معزز بیٹی میں تیرے باپ کے نقشِ قدم پر چلتا ہوں۔ تو بھی اُس کی تقلید کر"۔ مگر نازنین
خاموش تھی۔ اُس کا چہرہ باطنی مُسرّت سے چمک رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں غیر معمولی طور
پر نورانی تھیں۔ اور ایسا دکھائی دیتا تھا۔ کہ وہ مستقبل کے نظاروں میں محو ہے۔ ناگہاں وہ
چلائی"۔ مادرِ وطن بیدار ہو اور دیکھ کہ تیرے دشمن کس طرح سے برباد ہو رہے ہیں۔ فضا جنگ کے
نعروں سے معمور ہے۔ اور پہاڑ آبدار تلواروں کی جھنکار سے گونج رہے ہیں۔ وہ خیموں کو
آگ کے شعلوں نے لپیٹ لیا۔ المانوی تلوار۔ اس طوفانِ آتش میں سرگرم کار ہے۔ اور دشمن
خاک و خون میں تڑپ رہے ہیں۔ بس بس عقابی جھنڈا سرنگوں ہو گیا۔ اور فرزندانِ حُریت
نے اُسے پاؤں میں روند ڈالا۔ اب جنگجو رومن سپاہیوں کی لاشوں پر جانور منڈلا رہے ہیں
اور وہ ہاتھ جو دوسروں کی آزادی غصب کرنے پر آمادہ تھے۔ بےحس ہو چکے ہیں تلواریں
ٹوٹ گئیں۔ نیزے شکستہ ہو گئے۔ اور انتقام کے طوفان نے انسانوں کے سمندر کو تہ و
بالا کر دیا۔ قابلِ پرستش معبودو۔ یہ نظارہ کس قدر دل خوش کُن ہے۔ کیا ہمارا نجات دہندہ
آگیا"۔ بدنصیب عاشق چلا اُٹھا" میری پیاری۔ میری پیاری" ناظرین چونک پڑی۔ اور
یہ منظر اُس کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ وہ اپنے عاشق کی طرف مخاطب ہوئی۔ اور بولی
"میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ کہ ایک نوجوان سردارِ روما کی زریں ٹوپی پہنے میرے
ہموطنوں کا سپہ سالار بنا ہُوا انہیں لڑنے کے لئے اُکسا رہا ہے۔ میں نے اُسے پہچاننے
کی بہت کوشش کی۔ مگر سب بے سود۔ تب کسی دیوتا نے میرے کان میں پھونک دیا
"نجات دہندہ آگیا"۔ کہدو۔ کہ وہ تم ہی ہو۔ وعدہ کرو۔ کہ تم اُس آواز کا حکم مانو گے
جو دیوتا نے مجھے سُنائی۔ اور میں تمہاری ہوں" یہ کہہ کر وہ دوزانو ہو گئی۔ اور دامن پکڑ کر
بولی" کہدو۔ کہ تم میرے ہموطنوں کو آزاد کراؤ گے۔ اور میں تمہاری ہو جاؤنگی" آرام طلب

نوجوان کے مُردہ دل میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ نازنین کی پُرجوش صداؤں نے اُس پر کچھ اثر نہ کیا۔ غالب قوم کا غالب اثر حُب الوطنی کے جذبات کو مُردہ کر چُکا تھا۔ اور آزادی کے احساسات فنا ہو چُکے تھے۔ وہ بولا" پیاری۔ یہ ایک خواب تھا۔ جو تُو نے دیکھا تیری خواہشوں نے ایک شکل اختیار کر لی۔ اور تجھے یقین ہو گیا۔ کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہمارے دیوتاؤں نے خود یہ مُلک اہلِ روما کے حوالے کر دیا ہے۔ اور دیوتاؤں کی مرضی کے خلاف کرنا گناہ ہے۔ یہی بہتر ہے۔ کہ اپنی غریبانہ جھونپڑی روما کے عالیشان محلوں کے سائے میں بنائیں اور اُس چیز کی خواہش نہ کریں۔ جو دیوتا نہیں چاہتے۔ تیرے عقلمند باپ کی بھی یہی تجویز ہے۔ اور ہمیں اُسکی پیروی کرنی چاہیئے۔ نہ کہ اپنے مشتعل شدہ جذبات کی" نازنین کے خوبصورت چہرے پر مایوسی کی تاریکی چھا گئی۔ وہ غضبناک ہو کر بولی" تو اپنے مُلک کی آرزوں کو ٹھکراتا ہے۔ اس لیئے میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔ جا۔ کوئی اپنی جیسی ذلیل رُوح تلاش کر۔ المانیا کی مغرور بیٹی تجھ پر لعنت بھیجتی ہے۔ جا۔ بُزدل انسان۔ تجھے نہ غیرت ہے۔ نہ دیوتاؤں کے قول کا پاس یاد رکھ۔ مادرِ وطن آزاد ہو جائیگی۔ اور تُو ذلیل موت مریگا" نوجوان نے نادم ہو کر جواب دیا" کیا تُو اپنے باپ کی خردمندی کی قائل نہیں" نازنین بولی" اُس کی عقل بوڑھی ہو چکی۔ اس کی کمزور نگاہیں وہ نہیں دیکھ سکتیں۔ جو میں دیکھتی ہوں" اب نوجوان کو بھی جوش آ گیا۔ بولا" تُو اپنے باپ کی خردمندی کی ہتک کرتی ہے۔ تیرا باپ اہلِ روما کا خیر خواہ ہے۔ اور تو دشمن۔ وہ قوم کو تباہی سے بچانا چاہتا ہے۔ اور تُو اُسے بربادی کی تاریکیوں میں گمراہ کر رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ تیری شادی میرے ساتھ کر دے۔ اور تو اُسکی خواہش پر قہقہے لگاتی ہے۔ چل۔ اس خطرناک جگہ کو جہاں تیرے توہمات خوفناک شکل اختیار کر رہے ہیں۔ چھوڑ دے۔ یہ خبیث رُوحوں کا مسکن ہے۔ اُس خیمہ گاہ کی جانب نہ دیکھ۔ اُسکے محافظ فرشتے غضبناک نگاہوں سے تجھے گھور رہے ہیں۔ آ۔ تیرے لئے یہاں ٹھیرنا خطرناک ہے اپنے باپ کے پاس چل۔ کہ اُسکی محبت کی نگاہیں تیری دیوانگی اور وحشت کو دُور کر دینگی" نازنین نے ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالی۔ نوجوان فرطِ غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ اور مجنونانہ جوش میں چلایا" تُو میری ہے۔ میں تجھے زبردستی اُٹھا کر لیجاؤنگا" یہ کہکر وہ بڑھا۔ کہ نازنین کو پکڑے۔

مگر نازنین نے اپنا چھوٹا سا نازک نیزہ اُس کی چھاتی میں گھونپ دیا۔ نوجوان زرہ بکتر پہنے تھا نیزہ لوہے سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اب نوجوان نے اُس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا اور زبردستی لے جانا چاہا۔ مگر نازنین نے مدافعت کی۔ اور مقدور بھر اُس کا مقابلہ کرتی رہی۔ بیچاری کی حقیقت ہی کیا تھی۔ تھک کر مغلوب ہوگئی۔ مگر جب نوجوان نے اُسے اُٹھا کر لیجانا چاہا۔ تو جنگل اُس کی مدافعانہ چیخ پکار سے گونج اُٹھا۔ ناگہان بجلی سی تیزی کے ساتھ ایک مرد من جنگجو نمودار ہوا۔ اور نوجوان ٹھٹک کر رہ گیا۔ نووارد متعجب اور حیران تھا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے اُس نے خیال کیا۔ کہ کوئی عاشق مزاج نوجوان ایک باعصمت لڑکی کو دق کر رہا ہے۔ اُس نے نوجوان پر ایک غضبناک نگاہ ڈالی۔ اور نوجوان کا چہرہ ندامت سے سُرخ اور بعدازاں خوف سے زرد ہوگیا۔ مگر وہ اپنی ندامت کو چھپانے کے لئے پکارا۔ "چلے جاؤ۔ تمہارا کیا حق ہے۔ کہ خواہ مخواہ عاشق و معشوق کی پاک صحبتوں کو برہم کئے دیتے ہو" نووارد نے نازنین کی طرف دیکھا اور اس نگاہ نے حقیقت کو آشکارا کر دیا۔ اُس نے اپنی تلوار نیام سے نکالی۔ اور نوجوان پر جھپٹا ایک جھنکار پیدا ہوئی۔ اور نوجوان کی تلوار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا پڑی۔ اپنے آپ کو بے بس پا کر وہ نووارد سے لپٹ گیا۔ جس نے اُسے اُٹھا کر اس زور سے زمین پر دے پٹکا۔ کہ وہ بیہوش ہوگیا۔ اسکے بعد اپنے مغلوب دشمن کو حقارت سے دیکھ کر گویا کہ وہ اُسے بالکل حقیر اور ناچیز سمجھتا ہے۔ وہ نازنین کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ہرمن تھا۔ آپس میں کیا کیا باتیں ہوئیں یہ کچھ وہی اچھی طرح سے جان سکتے ہیں۔ جن کے دل پہلی ہی نگاہ میں زخمی ہو گئے ہوں۔ یہی کہنا کافی ہوگا۔ کہ اُس وسیع اور سنسان میدان میں دو دل جو ایک ہی جذبۂ وطن پرستی سے بیقرار اور بے چین تھے۔ مل کر ایک ہو گئے۔ نازنین کی آرزوؤں نے ہرمن کے ارادوں میں کامیابی کا مژدہ سُنا۔ اور دو محبت کرنے والے دلوں نے چاند اور ستاروں کی روشنی میں قسمیں اُٹھائیں کہ آزادی کی جد و جہد میں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ اور مادرِ وطن پر قربان ہو جائینگے۔

## ۳

دن ہفتوں میں۔ اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ مگر ظفرمند فوج ابھی تک اپنے خیموں میں عیش و عشرت میں مشغول تھی۔ ہر شام سپاہ سالار کے خیمے میں محفل رقص و

سرود گرم ہوتی۔ شراب نے دور چلتے۔ اور قہقہے بلند ہوتے۔ موسم گرما با امن مشاغل میں گذر ا۔ اور سردیوں کا بے رونق موسم بھی بہار کا پیغام دے کر رخصت ہو گیا۔ گویا جنگ کے دن ختم ہو گئے اور وقت آ گیا۔ کہ رومی شجاع اپنی فتحمندیوں کی یاد کو شراب ارغوانی کی ولولہ انگیز کیفیتوں سے تازہ کریں۔ سپہ سالار کو ہرمن پر کامل اعتماد تھا۔ وہ اُس کے مشوروں پر چلتا۔ اُس کی نصیحت پر عمل کرتا۔ اور سمجھتا کہ حسین المانوی جس کا بچپن رومن تمدن اور تہذیب کے شاندار آغوش میں بسر ہوا ہے۔ اپنا وحشیانہ پن بھول چکا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ روما کا یہ اجنبی فرزند جسے دیوتاؤں کی فیاضی نے حسن اور دانشمندی کی دولت سے بہرہ ور کیا ہے۔ روما کی شان و شوکت کا پُر جوش فدائی۔ اور سرگرم دوست ہے۔ اس لئے اگر کوئی عاقبت اندیش ہمراہی روز کی بیکاری سے تنگ آ کر اُسے آنے والے خطروں سے خبردار کرنے کی کوشش کرتا۔ تو مغرور سپہ سالار ویرس Varus اُسکی کمزوری پر ہنس دیتا۔ اور اُس کی دُور اندیشیوں کو وہم سے تعبیر کر کے ہرمن کی وفاداری اور خردمندی پر نازاں ہوتا۔ المانوی ہر روز رومن فرودگاہ کی پُر رونق منڈی میں اپنے مُلک کے تاریک جنگلوں کی نادر اشیاء لے کر آتے۔ اور اٹلی کے قیمتی عجائبات کے عوض فروخت کر کے خوش خوش واپس چلے جاتے۔

ایک شام بڑا شاندار جلسہ تھا۔ سپہ سالار ویرس نے تمام المانوی سرداروں کو مدعو کیا، ہر ایک اپنے مخصوص طرز لباس میں ملبوس فخر و غرور سے اکڑتا ہوا آتا۔ اور رومن اقتدار کے شاندار مناظر کو لاپرواہی سے دیکھتا ہوا اپنی جگہ پر جا بیٹھتا۔ اگلی صبح کُوچ کا حکم تھا۔ اور رومن سپہ سالار جسے فتح و نصرت کی موہوم اُمیدیں اٹلی کے پُر بہار زرخیز میدانوں سے وحشی مخلوق کی سُنسان اور تاریک سرزمین میں کھینچ لائی تھیں۔ چاہتا تھا۔ کہ آخری سفر پر روانہ ہونے سے پیشتر المانی سرداروں کو رومن سطوت و جبروت کا ایک ایسا تابدار جلوہ دکھائے۔ جو اُن کی تیز وحشی آنکھوں کو خیرہ کر دے۔ اپنے انجام سے غافل سپہ سالار کیا جانتا تھا۔ کہ یہ تاریک اور سُنسان جنگل مستقبل نزدیک میں ایک وسیع قبرستان بننے والے ہیں۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ موت کا دروازہ کُھلنے کو ہے۔ اور وہ وقت قریب ہے۔ کہ عیش و مسّرت کے قہقہے۔ ماتم اور بے بسی کی دردناک چیخوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اور آج کی لاپرواہیاں کل کی کس مپرسی

پُرخون کے آنسو روئیں گی۔ دربار آراستہ ہوگیا۔ شرابِ ارغوانی کے دَورِ پیہم نے چہروں کو شگفتگی اور زبانوں کو روانی عطا کی۔ اور وحشیانہ جوشِ مسرت نے بھولے بھالے سپہ سالار کو یقین دلا دیا۔ کہ المانوی سرداروں کے دل کدورت سے پاک ہیں۔ اور اُن کی سرزمین قیصر روم کی اطاعت اور فرمانبرداری کی برکتوں کو قبول کرنے کے لئے بے چین ہے۔ بے فکری کی اس محفلِ عظیم میں جہاں شرابِ لالہ گوں کی ندیاں بہ رہی تھیں۔ صرف ایک مخلوق تھی جس کی زبان نشہ کی لرزشوں سے پاک۔ اور جس کا دماغ مستانہ کیفیتوں سے عاری تھا۔ یہ نازنین کا باپ دانشمند بزرگ المانوی تھا۔ جب پیالے کی لگاتار گردشوں نے سنجیدگی اور متانت کو شکست دیدی اور رومن دماغ جو اپنی دانشمندی پر نازاں تھے۔ نشہ کے غلبہ سے تاریک ہوگئے۔ اُس وقت کہ انسانی ہوش و حواس اور سیال آتشیں کے غلبہ میں آخری کشمکش جاری تھی۔ دانشمند المانوی اُٹھا۔ اُس کا چہرہ شک و شبہ کے جذبات سے افسردہ تھا۔ اور اس کے ہونٹ مایوسی کے تبسم سے لرزاں تھے۔ اُس نے سپہ سالار اور اُس کی فوج کو مخاطب کیا۔ اور کہنے لگا۔ "کیا وجہ ہے۔ کہ مَیں آج یہاں اس بزمِ عیش و عشرت کا نوجوان دیوتا نہیں دیکھتا۔ اہل روما کے وفادار ساتھی۔ اور اپنے ہموطنوں کے پُرجوش شیدائی کو کیا ہوگیا۔ میری بوڑھی آنکھیں جرمنی کے ہرمن۔ اور روم کے آرمینیس Arminius کو دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔ ویرس بولا کل صبح ہم فتح و ظفر کا سفر شروع کرنے والے ہیں۔ اس سفر میں ہرمن ہمارا رہنما ہوگا۔ اسلئے وہ کہیں دُور و دراز وادیوں میں مصروفِ کار ہے۔ کہ قیصر روم کی فتح مند فوج کے فاتحانہ سفر کا انجام مبارک ہو"۔

دانشمند بوڑھا ہنسا۔ اور بولا "غافل انسان۔ اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے انجام سے خبردار ہوجا۔ میری وفاداری کو بدگمانی کی آنکھوں سے نہ گھور۔ اور جان لے۔ کہ دور و دراز کے گھنے جنگل موت اور تباہی کی خوفناک تاریکیوں سے مسلح ہو چکے۔ ہوا کی آبادی کی مُسرّت کی چیخیں سُن۔ جو تیرے ہمراہیوں کی لاشوں کے انتظار میں پر تول رہی ہے۔ اور جنگلوں کے چوپائوں کی عاجلانہ تگ و دو مشاہدہ کر۔ جو کل کی ضیافت کے انتظار میں ابھی سے ہونٹ چاٹ رہے ہیں۔ وہ سُنسان وادیاں جن کی شادابی کی فرضی داستانوں نے اہل روما کی ہوسِ ملک گیری

میں ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ زخمیوں اور مرنے والوں کی آخری چیخ اور پکار سُننے کی آرزومیں چشم براہ ہیں۔ دیوتا تمہاری تقدیر کا فیصلہ کرنے کے انتظار میں ہیں۔ کیونکہ ہرمن سب قوموں کو متحد کر چکا تم بیکاری کی زندگی سے تنگ آ گئے ہو۔ تو واپس چلے جاؤ۔ پیشتر اس کے کہ اٹلی کی فضا ماتم کی جگر دوز صداؤں سے گونج اُٹھے،" ویرس نے حقارت سے منہ پھیر لیا۔ ہرمن۔ خوبصورت ہرمن جس کی عقلمندی پر روم کا بچہ بچہ نازاں ہے۔ کبھی دھوکا نہیں دیگا۔ دانشمند سردار کی تقریر سُن کر کئی لوگ چونک پڑے۔ اور اُن کی روشن آنکھوں کے سامنے اپنے انجام کی دُھندلی سی دردناک تصویر کھنچ گئی۔ سردار نے اپنی تقریر کے اثر کا احساس کیا۔ اور زیادہ جوش میں آکر کہنے لگا" میرے ہموطنوں پر اعتبار کرنا نادانی ہے۔ کیا اُنھوں نے تمہارے ساتھ کوئی وفاداری کا عہد باندھا ہے۔ جو تمہیں اُن کی دوستی پر اعتبار ہے۔ آہ۔ ویرس۔ دُنیا کی مہذب ترین مخلوق کو تباہ نہ کر۔ شائستگی کے پیغامبروں کو دُنیا سے نہ مٹا۔ جا۔ ایسا نہ ہو کہ آج سے چند دن کے بعد کی قیصر روم کے سنہری عہدِ حکومت کے مورخ کو تمہاری ناعاقبت اندیشیوں کی داستان حسرت واندوہ کے آنسوؤں سے لکھنی پڑے" ویرس ضبط نہ کر سکا۔ وہ چلّایا۔ "روم کا محبتی ہرمن۔ قیصر کا معتبر ہم نشین۔ دغابازی نہیں کر سکتا۔ رومن تلوار وہ کچھ نہیں کر سکتی جو خوبصورت ہرمن کی شیریں کلامی نے کر دکھایا ہے۔ برسوں کے دشمن۔ ہمیشہ کے دوست بن گئے ہیں۔ عقابی جھنڈا جرمنی کے پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر لہرائیگا۔ اور اٹلی کے تمدن و تہذیب کے فسانے یہاں کی بے رونق زمینوں کو آباد کر دینگے۔ اب دانشمند سردار فرطِ غضب سے بے تاب ہو گیا۔ وہ پکارا" بدبخت انسان جا۔ مکمل بربادی تیرے انجام پر ہنس رہی ہے۔ دُور دراز کی زمینوں میں جرمنی کی قومیں جمع ہو رہی ہیں۔ کہ تجھے دامِ فریب میں لاکر تباہ کر دیں۔ ہرمن شجاع ہے۔ جری ہے۔ وہ ہر قوم میں گیا ہے۔ ہر کان نے اُس کی خاموش مگر پُرمعنی آواز سُنی ہے۔ اور سرداروں نے اُسکے پیچھے چلنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ تیرا اور تیری فوج کا بے صبری سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ تاکہ انتقام کے ہتیار اپنا مُہلک کام شروع کریں" ویرس نے اس ڈرا دینے والی پیشینگوئی کی پرواہ نہ کی۔ اور رومن خطروں سے ڈرتے بھی کب تھے۔ شراب سے مدہوش مخلوق نے بوڑھے سردار کی خیراندیشیوں کی

تحقیر کی۔ اور ہرمن کی بجائے اُس کو باغی قرار دیا۔ سردار نے محفل کے رنگ کو دیکھا۔ کہ عارضی جوش غالب ہے۔ اور دُور اندیشی رُخصت ہو چکی۔ اُس نے کہا "میں جاتا ہوں۔ کہ تمہارے ماتم کی تیاریاں کروں" اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

۴

دانشمند سردار کی تقریر اکارت گئی۔ اور اگلی صُبح کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خیمے اُکھاڑ دئے گئے۔ اسباب لاد اگیا، اور پچاس ہزار مخلوق کا عظیم الشان لشکر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہُوا۔ فوج کی اتنی سی تعداد نے بسا اوقات بڑے بڑے لشکروں کو تباہ کیا تھا۔ رومن حملوں نے کئی سرکش سرداروں کو نیچا دکھایا تھا۔ اس لئے کار آزمودہ سپاہیوں کے سپہ سالار کو خوف ہی کیا تھا۔ وہ دُنیا بھر کی بہترین سپاہ کا افسر تھا۔ اور زمین کی کوئی طاقت بھی رومن فوج کے حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ جرمنی کے وحشیوں کی بساط ہی کیا تھی۔ نہ انہیں فنونِ جنگ سے آگاہی تھی۔ اور نہ اُنہیں اپنی شجاعت کا صحیح استعمال ہی معلوم تھا۔ اتنی بڑی حکومت کا مقابلہ۔ جس کا صرف نام ہی دشمنوں کو لرزا دیتا تھا۔ ناممکن اور ناممکن محض تھا۔ ہرمن کی راہ نمائی میں لشکر کہیں کا کہیں نکل گیا۔ چلتے چلتے وہ اُس سرزمین پر وارد ہوئے جہاں ابھی تک کوئی رومن نہ پہنچ سکا تھا۔ راستے میں ارد گرد کے سردار آتے۔ اور اطاعت بجا لاتے۔ رومن سپہ سالار اپنی کامیابی پر پھُولا نہ سماتا۔ اور ہرمن کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ اور مُسکرا کر دل ہی دل میں بوڑھے دانشمند پر نفرین بھیجتا۔

ہرمن ایک بے قرار رُوح کی مانند اِدھر اُدھر حرکت کرتا نظر آتا۔ کبھی رومن سپہ سالار کا دل بڑھاتا۔ اور کبھی جرمن کے غیر مہذب اقوام کے سرداروں سے مصروفِ گفتگو دکھائی دیتا اُس کا دل لُبھانے والا تبسم اُسکے محبتی دل کی پاکیزگی کا پتہ دیتا۔ اور ویرس۔ آہ۔ بدبخت ویرس اُس مُسکراہٹ میں رومن شان وشوکت کے جلوے دیکھتا۔ ایک شام جب فوج دن بھر کے سفر کے بعد رات گذارنے کے لئے خیمے ڈیرے لگانے میں محو تھی۔ ہرمن لشکر سے علیحدہ ہو کر گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔ شاہ بلُوط کے ایک بلند و بالا درخت کے نیچے نازنین اُسکی منتظر تھی۔ اُس وقت سے کہ وہ دونوں پہلی دفعہ ملے۔ اب تک کئی مُلاقاتیں ہو چکی تھیں۔

اور نازنین کی وحشت محبت اور عشق کے شیریں مگر گہرے جذبات میں تبدیل ہو چکی تھیں۔
ہرمن نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور فرطِ جوش سے بولا "مادرِ وطن تجھے مُبارک ہو۔ کہ تیرے فرزند آزادی کا جلوہ دیکھنے والے ہیں۔ آسمان کے مقدس دیوتاؤ۔ زمین پر نگاہ ڈالو۔ ظالم برباد ہونے کو ہے۔ المانیا۔ کمربستہ ہوجا۔ اپنے خنجروں کو چمکا کہ وقت آگیا۔ جانِ من سُن۔ سیاہ زمین اور نیلا آسمان پُکار رہے ہیں۔ ہواؤں کی حرکت، آزادی کے شیریں گیت گا رہی ہے۔ زندوں کی رُعب دار صداؤں کو سُن۔ مُردوں کی خائف کر دینے والی آوازوں پر کان دھر۔ مادرِ وطن کا ذرّہ ذرّہ پکار رہا ہے" کہ وقت آگیا۔ وقت آگیا" نازنین فرطِ محبّت سے بیتاب ہوگئی۔ اور چلّا اُٹھی "ہرمن۔ پیارے ہرمن" نوجوان جوشِ انبساط سے کانپ اُٹھا اور بے اختیار ہوکر نازنین سے لپٹ گیا۔ نازنین شیریں اور محبت بھرے لہجہ میں بولی "ہرمن تُو مجھے بہت عزیز ہے۔ کہ اپنے وطن سے محبت کرتا ہے" ہرمن نے جواب دیا "نازنین مَیں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ ایسی محبت جو لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ تُو میرے وطن کی زندہ اور مُبارک رُوح ہے۔ تیرے حوصلے بلند اور تیرے ارادے عالی ہیں۔ آئندہ زمانے کی جرمنی کا مؤرخ تیرے پاکیزہ نام کو زریں حروف میں درج کریگا۔ اور تیرے کارناموں کو فخر سے تحریر میں لائیگا" نازنین نے کہا "مجھے باپ نے جلاوطن کر دیا۔ تو کیا پرواہ مجھے قوم نے اپنی حدود سے باہر نکال دیا۔ تو کیا مضائقہ۔ میں نے اپنا دلی مقصد حاصل کر لیا۔ ایک عورت جو کچھ چاہتی ہے۔ وہ مجھے ہرمن میں میسّر ہے۔ اور میرا ملک آزاد ہونے والا ہے" ہرمن نے جواب دیا "پیاری نازنین۔ اب میرا وطن تیرا وطن ہوگا۔ اور میری قوم تیری قوم بنے گی۔ میرے بزرگ باپ کے پناہ دینے والے ہاتھ تیری حفاظت کرینگے۔ اور میں میدانِ جنگ میں آزادی کی لڑائی لڑوں گا۔ نازنین۔ پیشتر اس کے کہ کل کا سُورج مغرب کے پرے کی نامعلوم زمینوں کو روشن کرے۔ ہم آزاد ہوجائیں گے۔ اور تُو اُس وقت میری سلامتی پر مسرور ہوگی۔ یا میری بے وقت موت پر ماتم کُناں" نازنین بولی۔ تیری موت اور تیری فتح دونوں میری ہونگی جرمنی کی آزاد کنواری لڑکی۔ اٹلی کی بُزدل لڑکیوں سی نہ سمجھ۔ میں میدانِ جنگ میں آزادی کے پُرجوش گیت گا کر المانیا کے فرزندوں کے حوصلے بڑھاؤں گی۔ اور جہاں تو گرے گا

وہیں میں بھی گر کر جان دیدوں گی۔" "لے تیری آرزو ابھی پوری ہوتی ہے۔" ایک غضبناک آواز نے کہا۔ اور تلوار ہرمن کے بازو کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ "بزدل۔ نامرد۔ دشمن" ہرمن چلّایا۔ اور آواز کی طرف جھپٹا۔ نامعلوم دشمن نے گھوڑا دوڑایا۔ کہ بچ کر نکل جائے۔ مگر ہرمن نے اُسے جالیا۔ اور اپنے لمبے نیزے کے وار سے اُسے گھوڑے سے نیچے گرا کر چھاتی پر چڑھ بیٹھا اور قریب تھا۔ کہ تلوار سے اُس کا فیصلہ کردے۔ جو اُس نے اُسے پہچان لیا۔ یہ اُس کا رقیب تھا۔ ہرمن کے دِل میں خونِ رقابت نے جوش مارا۔ تلوار کو پرے پھینک دیا۔ اُٹھا۔ حقارت سے ایک ٹھوکر لگائی۔ اور یہ کہکر واپس ہوگیا۔ "ملعون۔ میں اپنے خنجر کو تیرے ناپاک خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔" رقیب نادم ہوگیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہوکر جنگل میں غائب ہوگیا۔ اس واقعہ کے پورے تین گھنٹے کے بعد عین اُس بلند ٹیلے کے دامن میں جہاں جرمنی کے دونوں بیتاب فرزند عشق و محبت کی شیرینیوں سے بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ وسیع جنگل کے ایک تنہا کونے میں جرمنی کے دانشمند اور جنگجو سردار اکٹھے ہوئے۔ کہ مادرِ وطن کی فلاح و بہبود کے طریقوں پر غور کریں۔ اس کام کے لئے آدھی رات کا خاموش اور سنسان وقت مقرر کیا گیا تھا۔ تاکہ سونے والے پرندے بھی سُننے نہ پائیں۔ اور اُن کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کہیں دُشمن کو پرستارانِ آزادی کی جدوجہد سے خبردار نہ کردے۔ جلسہ گاہ اُس وقت سے بھی زیادہ تاریک تھی۔ جو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ ایک بڑا وسیع رقبہ صاف کیا گیا۔ درختوں کے تنے جو اس غرض کے لئے نذرِ آتش کئے گئے تھے۔ اندھیرے کی تاریکی میں ابھی تک سُلگ رہے تھے۔ جنگ کے دیوتاکو انتقام پر آمادہ کرنے کے لئے قربان کرنے کے لئے قربانی کا سامان مہیا تھا۔ اور بلند قربانگاہیں جو انسانی سروں سے آراستہ کی گئی تھیں۔ اُن خوفناک رسموں کا پتہ دیتی تھیں۔ جو دیوتاؤں کی پرستش کے موقعہ پر ادا کی جانے والی تھیں۔ کفرستانِ ظُلمت کے جاہل مذہبی رہنما گروہ در گروہ ان قربان گاہوں کے طواف میں مشغول تھے۔ اُن کے قد لمبے اور اُن کے جسم عریاں تھے۔ اور اُن کے سروں کے گھنگھریالے بھورے بال چاند کی مدہم روشنی میں غضبناک سانپوں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ کہ سر اُٹھائے فرطِ غضب سے اپنی زبانیں باہر نکالے تُنکا

کی جستجو میں پریشاں ہیں۔ وہ مجنونانہ انداز میں دیوتاؤں کی تعریف میں گیت گاتے تھے۔ اور ہر گیت کے اختتام پر آزادی کے دشمنوں کو کوستے تھے۔ جنگل رفتہ رفتہ انسانوں سے آباد ہو رہا تھا۔ کیونکہ مختلف قبائل کے سردار اپنے ملازموں کے ہمراہ آتے۔ اور مقررہ جگہوں پر بیٹھتے جاتے تھے۔ جب سب آچکے۔ تو قربان گاہوں کے آتشکدے روشن کئے گئے۔ حتیٰ کہ ہر صورت نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔ اب خاموشی چھاگئی۔ اور جنگ کے دیوتا کے جنگجو پرستاروں کی عبادت شروع ہوگئی۔ جب سب رسم ادا ہوچکے۔ تو جنگ کے دیوتا کا بلند مرتبہ پجاری کھڑا ہوا۔ اور بلند آواز سے جس کی گونج نے درختوں کے پتوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا کردی۔ پکارا "اے جرمنی کے بہادر فرزند۔ ہم تیری التجا پر اکٹھے ہوئے ہیں۔ کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" ہرمن اٹھا۔ اور یوں گویا ہوا "اے جنگ آزما بزرگوں کے بہادر فرزندو۔ تم اُن کی اولاد ہو۔ جن کے شجاعانہ کارناموں کے گیت اس بدبخت ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ کیا تم بھی ایسی موت مرنے پر آمادہ ہو۔ کہ اُن کی طرح تمہارے نام بھی روشن ہوجائیں۔ یا کیا تم یہ پسند کروگے۔ کہ بدنامی کی موت مرو۔ بدنامی کے گڑھے میں گاڑے جاؤ۔ اور آنے والی نسلیں تمہیں فراموش کردیں۔ میری تقریر خوف وخطر سے لبریز ہوگی۔ اور اس لئے وہی سُنیں گے۔ جو موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیا تم سُنو گے؟" اس مختصر مگر پُرجوش التجا کے بعد تمام مجمع اچانک کھڑا ہوگیا۔ اور ایک آواز ہوکر بولا "ہم سنیں گے۔ ہم مرنے پر تلے ہوئے ہیں" اُسی وقت ہر دایاں ہاتھ تلوار کے قبضہ کی جانب بڑھا۔ اور ہتھیاروں کی جھنکار سے تمام جنگل گونج اٹھا۔ پُرجوش ننگی مخلوق کا نرالا مجمع بالکل دیووں کی ایک غضبناک فوج کی مانند تھا۔ جنہیں حضرت سلیمان اعظم کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد کردیا گیا تھا۔ کہ دنیا کی کمزور مخلوق کو اس کے مقبوضات سے بیدخل کردیں۔ سپاہیانہ جوش کے اس مختصر سے مظاہرے کے بعد جب خاموشی چھاگئی تو ہرمن بولا "میں تمہاری آزادی کے دشمنوں کو اپنے خردمندانہ حیلوں سے تمہارے دروازے پر لے آیا ہوں۔ اپنی تلواروں کی برش کا ملاحظہ کرو۔ اور اپنے خنجروں کی آبداری کو دیکھو۔ روما کا عروج وزوال قضا وقدر نے تمہارے ہاتھوں میں دیدیا ہے۔ تم مغلوب ہوگئے۔ تو یاد رکھو۔ دنیا میں کوئی جگہ باقی نہیں رہیگی جہاں آزادی اور مسرت پناہ گزیں ہوسکیں۔ انسانی امیدوں کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اور غلامی کی

زنجیریں انسانوں کی آزادیوں کو مقید کریں گی۔ آزادی بے بسانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ نسل انسانی کی بہتری تمہاری مدد کی محتاج ہے۔ کیا تم انہیں مایوس کردو گے؟" ہرمن کی تقریر نے آگ لگا دی۔ اُس کی اپیل نے سامعین میں تلاطم بپا کر دیا۔ دل تڑپ اُٹھے۔ تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ سامعین جھپٹے۔ گویا کہ دشمن نزدیک آگئے۔ اُن کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ وہ غصے سے دانت پیسنے لگے۔ اُن کے پریشان بال کھڑے ہو گئے۔ اور انہوں نے ایک ایسا جنگی نعرہ لگایا۔ کہ زمین اور آسمان تھرا اُٹھے۔ پجاری وحشیانہ گیت گانے لگے۔ اور اگلی دنیا کی مسرتوں کی تصویر لفظوں میں کھینچ دی۔ ہر ایک جنگ آزما وحشی کو ایسا معلوم ہوا۔ کہ وہ میدان جنگ میں مرنے کے بعد بگولے کے کندھے پر سوار ہے۔ بہشت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور اُس کی مقدس دہلیز اُس کے پاؤں کے خون سے چمک اُٹھی ہے۔ پھر اُسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ بہشت میں داخل ہونے کے بعد وہ ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار ہے اور ہوا کی تیزی بھی اُس کی سرعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ تمام دن وہاں شکار کھیلا کریگا۔ اور شام کو آسمانی دعوت میں شریک ہوگا۔ جہاں نیند کے نہ ختم ہونے والے دَور چلا کرینگے۔

گیت ختم ہو گئے۔ آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور دل اُس گھڑی کے لئے بیتابی سے دھڑکنے لگے۔ جب دشمن اُن کے مقابلہ پر ہونگے۔ بلند مرتبہ پجاری نے پھر سر اُٹھایا۔ اُسکے اشارے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ پکارا: "اس مقدس کام میں تمہارا سردار کون ہوگا؟" نگاہیں بے ساختہ ہرمن کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور جنگل "ہرمن۔ ہرمن" کی بلند صداؤں سے گونج اُٹھا۔ جب انتخاب ہو چکا۔ تو ہرمن کی قوم کے چند بہادر آگے بڑھے۔ انہوں نے ہرمن کو ڈھال پر بٹھا کر اپنے شانوں پر اُٹھایا۔ تا کہ سب لوگ اپنے سردار کی زیارت کریں۔ اسکے بعد تمام سرداروں نے ہرمن کی بیعت کرکے قسم اُٹھائی۔ کہ وہ آخری دم تک اُس کا ساتھ دیں گے یہ کام بھی ہو چکا۔ تو پجاری نے قربانی کی رسم ادا کی۔ اور جنگ کے دیوتا کے ہونٹ ایک رومن قیدی کے خون سے سیراب ہو گئے۔

# ۵

اگلے دن کی روشن صبح نمودار ہوئی۔ بہادر رومن سپاہی حسبِ معمول خوابِ شیریں سے بیدار ہوئے۔ اُن کے دل مطمئن تھے۔ اور اُن کے چہرے تسکین کے نور سے چمک رہے تھے۔ اُنہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ کہ اُن کا وقت آپہنچا۔ وہاں اُن سے لڑنے والا تھا ہی کون۔ ہرمن کی موجودگی میں کس کی مجال تھی۔ جو اُن کے مقابلہ پر آتا۔ گھنے جنگل کا سفر درپیش تھا۔ راستہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اور قدم قدم پر ٹھیرنا پڑتا تھا۔ تیشے اور کلھاڑے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اور عظیم الشان درخت کاٹ کاٹ کر گرائے جاتے تھے کہ عظیم الشان فوج کا فتحمندانہ راستہ صاف ہو جائے۔ مگر دشواریاں اس قدر تھیں کہ دوپہر تک صرف پانچ کوس ہی طے کئے جا سکے۔ سپاہی گھنٹوں کی لگاتار محنت سے چُور ہو چکے تھے۔ اس لئے اُنہیں اجازت دی گئی۔ کہ چندے سستا لیں۔ ابھی بیچاروں نے آرام کرنے کے لئے کمریں کھولی ہی تھیں۔ کہ اچانک جنگ کے نقارے پر چوٹ پڑی۔ بگل بجنے لگے۔ اور سپاہی بدحواسی کے عالم میں دوڑے۔ کہ اپنی اپنی جگھوں پر کھڑے ہو جائیں۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے کی جانب دیکھتے تھے۔ تاکہ دریافت کریں۔ کہ اس غیر متوقعہ واقعہ کی وجہ کیا ہے۔ ویرس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے افسروں سمیت گھوڑا اُڑائے پھرتا تھا۔ کبھی صفیں درست کرتا۔ کبھی فوج کے ایک حصّہ کو ایک جگھہ سے دوسری جگہ لے جاتا۔ اور بار بار مایوسی سے اُس زمین کو دیکھتا۔ جہاں اُس کی فوج ایستادہ تھی۔ بدقسمت تھی رومن فوج۔ کہ اُسے دشمن سے مقابلہ بھی پیش آیا۔ تو کس جگہ۔ جہاں وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلا سکتے تھے۔ چند لمحے اس تذبذب میں گزرے تھے۔ کہ فضا جنگی نعروں سے معمور ہو گئی اور گرد کے ٹیلے وحشی۔ ننگے انسانوں سے ڈھپ گئے۔ جو حملہ کرنے کے لئے ہزار ہا کی تعداد میں دیوانہ وار جھپٹے۔ ویرس کو اُس وقت بھی کہ تباہی سامنے تھی۔ ہرمن کی وفاداری اور دوستی پر پُورا پُورا اعتماد تھا۔ اور اگرچہ ہرمن کے رقیب نے اُس کے دل کو پھیرنے کی کوشش کی مگر اُسے پھر بھی یقین نہ آیا۔ ایک سوار فوراً عقب میں روانہ کیا گیا۔ کہ ہرمن کو ساتھ لے آئے مگر ویرس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اُسے بتایا گیا۔ کہ ہرمن آنے سے انکار کرتا ہے

اور عقب کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ مگر یہ آہیں بھرنے کا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ رومن فوجیں بڑھیں۔ کہ موت کی وادی میں سے گذر کر اُن چوٹیوں پر قبضہ کر لیں۔ مگر خونخوار وحشیوں نے بڑی بڑی چٹانوں کو دھکیل دیا۔ اور آدمیوں کی ایک کثیر تعداد اُن کے نیچے دب کر رہ گئی۔ لڑائی ہر جگہ جاری تھی۔ مگر میدانِ جنگ کی صورت کچھ ایسی تھی۔ کہ ایک جگہ جم کر لڑا نہ جا سکتا تھا۔ کاش کسی طرح سے ایک پہاڑی پر ہی قبضہ ہو جاتا۔ حملے پر حملے ہوتے۔ مگر تقدیر خلاف تھی۔ ہر کوشش ناکام رہتی اُس وقت کے بہترین ہتھیار۔ اور اعلیٰ درجے کے وسائلِ حرب سب بیکار تھے۔ اِس طرف کامیابی کی کوئی صورت نہ پاکر ویرس نے عقب میں قسمت آزمائی کی ٹھانی۔ اور اُس راستہ پر قبضہ حاصل کرنیکا ارادہ کیا۔ جس راستے سے کہ وہ اس تباہی کی ولایت میں داخل ہوا تھا۔ مگر ہرمن چیدہ بہادروں کی ایک جماعت کے ہمراہ مقابلے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ مایوسی نے جذبۂ شجاعت کو اور بھی اُبھار دیا تھا۔ اس لئے رومن سپاہیوں نے اپنے واحد راہِ نجات پر قبضہ کرنیکے لئے غیر معمولی بہادری سے کام لیا۔ مگر اُنکی جرأت کام نہ دے سکی۔ مسلح سپاہی اس سرعت اور تیزی سے حرکت نہ کر سکتے تھے۔ جو ننگے اور چست جرمنوں میں پائی جاتی تھی۔ اس لئے کئی دلدلوں میں پھنس کر رہ گئے۔ ایک اور نئی مُصیبت کا سامنا ہُوا۔ کہ آسمان سے پانی برسنے لگا۔ اور جنگل کی زمین تھوڑے عرصے میں ہی ایک وسیع دلدل بن گئی۔ جہاں پیدل جرمن بڑی آسانی سے اِدھر اُدھر گھُوم سکتے تھے۔ جبکہ سواروں کے لئے سوائے اسکے اب اور کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ کہ اپنی تقدیر کے انتظار میں جہاں ہیں۔ کھڑے رہیں۔ اسی حالت میں شام ہو گئی۔ تاریکی نے دونوں فریقوں کو لڑنے سے روک دیا۔ اور سپاہی گیلی اور کیچڑ والی زمین پر بے اختیار لیٹ گئے۔ تھکے ماندے سونے کے لئے اور زخمی مرنے کے لئے۔

ویرس اپنے ہمراہیوں سمیت ایک ٹیلے پر بیٹھا اپنی حماقت کا ماتم کر رہا تھا۔ بہتیرا سر مارتا۔ مگر کوئی چارۂ کار دکھائی نہ دیتا۔ لاکھ سوچتا۔ مگر نجات کا راستہ دکھائی نہ دیتا۔ ہر سمت موت ہی موت نظر آتی تھی۔ اور اب اُسکے پنجہ سے نکلنا ناممکن تھا۔ کسی نے مشورہ دیا۔ کہ عقب کے پہاڑی راستوں پر قبضہ کرنیکے لئے جانیں لڑا دی جائیں۔ مرنا تو ہے ہی۔ کیوں نہ اس طرح سے مریں۔ اگر کامیاب

ہو گئے۔ تو بچ جائینگے۔ ورنہ تاریخ عالم میں نام تو رہیگا۔ سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اور آرام کرنیکے لئے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ ویرس نے مُنہ سر لپیٹ کر سونے کی کوشش کی۔ مگر بدقسمت سپہ سالار کو نیند کہاں۔ قوت متخیلہ دن بھر کے واقعات کو خوفناک شکلوں میں اُسکی آنکھوں کے سامنے پیش کرتی۔ اور وہ لرز کر آنکھیں بند کر لیتا۔ رات کروٹوں میں گذری۔ اُدھر صُبح ہُوئی۔ بگل بجا۔ اور سپہ سالار نے ایک پُرجوش تقریر کے ذریعہ سے فوج کو سلامتی کی آخری جدوجہد کے لئے آمادہ کیا۔ اُس نے اُنکی شجاعت کی تعریف کی بیوطنی کی تلخیوں کا ذکر کیا۔ اور کہا۔ "روم کی عزت اور خودداری کا انحصار آج تمہاری آبدار تلوار و کی برش پر ہے۔ دیکھتے ہو۔ کہ تم ہر جانب سے گھر گئے۔ وطن دُور ہے۔ مگر شجاعانہ موت قریب۔ بچ گئے۔ تو وطن پہنچ جاؤ گے۔ اور مارے گئے۔ تو نام پاؤ گے۔ دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ جب موت اب کسی طرح سے ٹل نہیں سکتی۔ تو آؤ۔ مردانہ وار لڑیں۔ تلواروں کی دھاروں اور نیزوں کی انیّوں سے اپنا راستہ بنائیں۔ اور اپنے وحشی دشمنوں کو دکھادیں۔ کہ رومن شجاعت مغلوب نہیں ہو سکتی" سپاہیوں کے خون میں حرکت پیدا ہُوئی۔ اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ اُدھر جرمنوں نے جب فوج کو بڑھتے دیکھا۔ تو تیروں کی بے پناہ بارش سے اُسکا استقبال کیا۔ بہادر رومن اس حملہ کی تاب نہ لاکر لڑکھڑا گئے۔ مگر فوراً سنبھلے۔ اور دشمنوں پر بجلی کی سی سُرعت سے ٹوٹ پڑے۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ اور گھنٹوں کی لگاتار محنت کے بعد رومن فوج کا دلدل کے ایک حصّے پر قبضہ ہو گیا۔ اب دل اُمیدوں سے بھر گئے۔ تھوڑی سی کامیابی نے مایوس سپاہیوں کے حوصلے بڑھا دیئے۔ اور سب جنگل کے اُس حصّہ کی جانب بڑھے۔ جس پر اُنکا قبضہ ہو چکا تھا۔ یہ حملہ اس قدر سخت تھا۔ کہ جرمنوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اور اُنھوں نے دیکھا۔ کہ تواعد دان جرمن فوج کا مقابلہ میدان میں کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ وہ بھاگ کھڑے ہُوئے۔ مگر نازنین نے جو اُس وقت عورتو کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ میدانِ جنگ کے ایک طرف آزادی اور استبداد کی جنگ کا نظارہ کر رہی تھی۔ راستہ روک دیا۔ اور مفروروں کو پھر واپس ہونا پڑا۔ اس اثناء میں ہرمن کو بھی پتہ چل گیا۔ کہ دشمن جان سلامت لے جانے میں کامیاب ہُوا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے قبیلے کے آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا۔ اور دشمنوں سے اُلجھ گیا۔ جنگ لحظہ بلحظہ زیادہ خطرناک ہوتی گئی۔ اور جوں جوں جرمنوں کو کمک پہنچتی گئی۔ رومنوں کے ہاتھ سُست ہوتے

گئے۔ ہزار ہا دلدلوں میں دھکیل دئے گئے۔ سینکڑوں گھوڑوں کے پاؤں میں کچلے گئے۔ یہاں تک کہ انکی تعداد نصف رہ گئی۔ اور اس نصف تعداد کی سلامتی کے متعلق بھی کون کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ اگرچہ رات کی تاریکی کی وجہ سے لڑائی بند ہو چکی تھی۔ تاہم وہ اس قدر سخت گھرے ہوئے تھے۔ کہ بچ کر نکل جانیکا راستہ کوئی نہ تھا۔ ہزیمت خوردہ سپاہی روتے تھے۔ اس لئے نہیں۔ کہ موت کھڑی گھور رہی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ روم کا اقتدار خاک میں مل گیا تھا۔ سب سے زیادہ مایوس ویرس تھا۔ وہ شہنشاہ کو کیا جواب دیگا۔ لوگ سنیں گے۔ تو لعنتیں بھیجیں گے۔ کہ ویرس نے روم کی عزت و شوکت کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ طرہ یہ سوچ کر وہ ندامت سے بیتاب ہو گیا۔ آخر اُس نے عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ زخمی اور کمزور ہاتھوں کو آخری کوشش کیلئے آمادہ کیا۔ اور خنجر نیام سے نکال کر اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ مصیبت اور موت کے تیسرے دن کی صبح نمودار ہوئی۔ اور مایوس سپاہیوں نے اپنے آپکو اُس خطرناک جد وجہد کے لئے تیار کر لیا۔ جس کا انجام یا فتح ہوا کرتی ہے۔ یا موت۔

جنگ حسب دستور شروع ہوگئی۔ صبح دوپہر میں۔ اور دوپہر شام میں تبدیل ہوگئی۔ مگر لڑائی کا کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ آخر شام کو ویرس کے جانشین سپہ سالار کو ایک ترکیب سوجھی۔ اور اُس نے حکم دیا۔ کہ فوج کے سامان رسد وغیرہ کو آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ جب جرمنوں نے آگ کے شعلے دیکھے۔ تو انہوں نے لوٹ مار کو آزادی پر ترجیح دی۔ اور بھاگے۔ کہ جو کچھ بھی آگ سے بچ سکے۔ بچا لیں۔ اب راستے صاف ہو گئے۔ اور بچی کھچی فوج معمولی رکاوٹوں کا مقابلہ کرتی ہوئی وطن کی جانب روانہ ہوئی۔

ہرمن نے بہت پیچ و تاب کھایا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ اُسی میدانِ جنگ میں جو دوستوں اور دشمنوں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ نازنین کا عقد ہرمن سے ہو گیا۔ اور تمام ملک آزادی کے فاتحانہ گیتوں اور شادی کے سرور انگیز نغموں سے گونج اٹھا۔

(ماخوذ) امیر حسن ناز۔ سیالکوٹ

# ایک شام

دن تھوڑا ہی باقی تھا کہ ایک زور کا چھینٹا پڑا۔ اور پھر کچھ ہوا چلی، ہوا کیا چلی کہ قدرت کے اسٹیج پر سین بدل گیا۔ یا تو شام سے پہلے شام ہو چکی تھی یا سُنہری روپہلی دھوپ بنتی ہُوئی تنتی ہُوئی درختوں کو چھُوتی، مسجد کے میناروں سے لپٹتی، گھروں کی چھتوں کو روندتی سب جگہ پھیل گئی۔ دُنیا جگمگا اُٹھی۔ پانچ منٹ برابر یہی عالم رہا۔ سلطنت عجب چیز ہے، سُورج گویا اِترا اِترا کر کہہ رہا تھا "دیکھا!! حکومت اسکا نام ہے کہ ایک نگہ گرم سے سیاہ بادلوں کو کافور کر دیا۔ یہ جو ایک لکہ ابر قبلہ رُخ رہ گیا ہے اسے ابھی آگ لگا کر تماشہ دیکھونگا!" یہ تماشہ بھی واقعی ہُوا، جو بادل بچ رہا تھا وہ شعلہ بن کر بھڑکا۔ "آتش برستی تھی گلستان پر" کا نقشہ بندھا۔ زرد چہرے بھی تمتما اُٹھے جو پہلے ہی گلرنگ تھے ان کا تو کیا کہنا۔ انار کے پھُول کو شرماتے تھے۔ عجب شام تھی کہ مغرب مشرق دونوں دُولہا دُلہن کے رنگ میں تھے۔ سُورج غروب ہُوا ہی تھا کہ چودھویں کا چاند نکلا، درختوں کی چھاؤں اس حملہ کی کیا تاب لاتی۔ ابھی ابھی مشرق کی طرف میلوں پھیل رہی تھی مگر پسپا ہُوئی اور بھاگ کر مغرب کی طرف پناہ لینے لگی مگر کب تک چاند ہے کہ بڑھتا چلا آتا ہے گویا کہہ رہا ہے کہ آج نہیں چھوڑونگا، تاریکی کو جہاں پاؤنگا لوٹونگا۔ گھروں میں، باغوں میں، دلوں میں جس جگہ اندھیرا ملیگا اسے مٹا دُونگا۔

ہلکی ہلکی ہوا کی مہرو سے باغ میں چاندنی نے پتہ پتہ پلٹ کر دیکھا، بالائے بام سوتے جاگتے سب بچوں سے کھیلی۔ شرمیلی سے شرمیلی آرزو کو بے نقاب کرکے رہی۔ شوخ چنچل چاندنی ابھی اور کیا کیا کرتی مگر اُف۔ غضب! وہ چاند جو ابھی بقعۂ نور بن رہا تھا جس کی بیدھڑک شکاری کرنیں۔ بلوں میں گھس گھس کر تاریکی کو مجروح کر رہی تھیں خود سائے میں آگیا۔ درختوں کے نیچے سے کامرانی کا جال مٹ گیا۔ دریا کا دھلا دھلایا مُنہ پھر گدلا گیا۔

---

اے زمین تجھے خدا سمجھے! کمبخت آج ہی تجھے مہ و مہر کے درمیان حائل ہونا تھا او بخیل تجھے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اور لوگوں کے تجھ پر قلعے محل باغ شکارگاہیں، کسی کی کانیں،

کوئیلے کی، لوہے کی، سونے کی، ہیروں کی، کسی کے کھیت کسی کے نخلستان، کسی کے کنوئیں کسی کی نہریں، تیرے چپے چپے پر مہریں میری نہیں اور لوگوں کی تو کیا تجھ سے اتنا بھی میرے لئے نہ ہوسکا کہ آج شام تو دل کھول کر چاند کو چمک لینے دیتی۔ سُن او بے پروا ظالم سُن! مَیں اُسے خط لکھنے والا تھا کہ "اے میری مہ پارہ۔ اے مہ جبینوں کی ملکہ . . . ." مگر اب کس مُنہ سے اسے چاند سے تشبیہ دوں۔ تیرا ستیاناس ہو کہ تو نے میرا مضمون بگاڑ دیا۔

اری او جوتی خوری تجھے جاٹ ہی سیدھا کرتے ہیں کہ اونے پونے داموں بنئے کے پاس گروی کرتے ہیں۔ میں نے نہ تجھے خریدا نہ تجھے کھودا باوجود اسکے تو نے میرا بنتا ہُوا استعارہ تباہ کیا۔ خیر! آنے دے کسی دُمدار ستارے کو۔ بس چلا تو اس میں تجھے جھونکو نگا۔

فلک پیما

---

# میرے دِل کی دُنیا

ایک بیوہ کی زبان سے

پانی برسا، باغوں اور کھیتوں میں بہار آئی، کلیاں ہنسیں، حسین و خوشنما پھول کھلے، مناظرِ قدرت میں ایک دلکشی پیدا ہوگئی، مگر آہ میری مایوس نگاہیں ان نمائشی چیزوں سے مانوس نہیں..... آہ اب میرے دل کی دنیا تاریک ہے، اس میں دُنیائے فانی کے ولولہ انگیز مناظر منعکس ہی نہیں ہوتے ؎

۲

بلبلوں کے مسرور کُن نغمے میرے لئے جگر دوز تیر ہیں، کلیوں کی بہار آفریں مسکراہٹ میرے مجروح قلب کیلئے نمک پاش جراحت ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، کالی کالی بدلیاں میری ناکام آرزؤں کو چھیڑتی ہیں، مگر آہ وہ سوئی ہیں، اُن میں ذرا بھی جنبش نہیں پیدا ہوتی گویا وہ بھی اپنے قدرشناس کے ساتھ مرچکی ہیں اور مجھ غم نصیب کیطرح قیامت کا انتظار کر رہی ہیں ؎

۳

پپیہے کی دلکش آواز (جب کبھی درختوں کے کنج سے نکل کر پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں اپنی بلند و پست پرواز کیساتھ "پی کہاں" کہتا ہُوا فضائے خموش میں اُڑتا چلا جاتا ہے) مجھے تڑپا دیتی ہے اور میرے دل کی خاموش دنیا میں بھی آواز گونجنے لگتی ہے، مجبوراً میں اُس سے خطاب کرکے کہتی ہوں۔

سُن اے بادۂ محبت کے متوالے اور اے اپنے محبوب کے پکارنے والے ننھے پکھیرو! تجھے قسم ہے اپنے اس لفظ کی کہ تو شوق سے درختوں کے کنج میں بیٹھ کر اس دلخراش لفظ کی پیہم رٹ لگا..... لیکن وہاں جہاں سے میں تیری آواز نہ سُن سکوں۔ سُن او اضطراب فروش طائر سُن! میں ستم رسیدہ ہوں اور تو ستم آرا، میرے جذبات مُردہ ہیں اور تیرے جذبات متحرک، میں نا اُمید ہوں اور تو سراپا اُمید۔

آہ اب اُمید کو مجھ سے کوئی تعلق نہیں، میں تو اُمید کو بھی "نہیں" کے ساتھ سپردِ خاک کرچکی ہوں میرے پہلو میں دل ہے مگر اُس میں مسرتوں کی گنجائش نہیں، میں جیتی ہوں مگر جینے کے لائق نہیں..... دُنیا جن کے لئے دلچسپ ہوگی ہوگی۔ میرے لئے تو اسکے دلفریب مناظر ختم ہوگئے ؎

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

# محفلِ ادب

(از مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

اسکو اندھیرے نے بنایا۔ جب وہ کعبہ میں ڈھونڈا جا رہا تھا، جب اس کی کاشی اور ہردوار میں تلاش ہو رہی تھی۔ جب آتش خانوں میں شعلۂ نار سے اسکو دریافت کیا جا رہا تھا، جب بیت المقدس کے بڑے گرجا میں مسیح مصلوب کو دیکھ کر باپ کا نور دیکھنے کی جستجو ہو رہی تھی،

تو نے اپنے مرکز طلب کو سب سے ہٹا کر دھیان جمایا، شاعر ٹیگور تصور کی لہر میں نظر آیا، اور بولا میں تو نغمہ میں اسکو ڈھونڈھتا ہوں۔ تو نے کہا میرا بھی یہی خیال تھا، مگر جب تم نے یہ راستہ ہی لے لیا تو اب میں نغمہ کو بھی ترک کرونگا، اور کوئی دوسرا طریقہ اس کی تلاش کا نکالونگا۔ کہ مجھ کو کسی کی تقلید گوارا نہیں ہے،

اسکو یکتائی عزیز ہے، تیرے ارادے کی یکتائی اور تیری تلاش کا نرالاپن اسکو پسند آیا۔ اور اس نے کہا او حسن نظامی ادھر دیکھ موسیٰ کو روشنی کی زبان سے پکارا تھا اور جوتیاں اُتروائی تھیں، تجھ کو اندھیرے کی صدا میں قرب عطا کیا جاتا ہے عینک اُتار ڈال۔

موسیٰ نے دونوں جوتیاں اُتاری تھیں یعنی انکو دین دنیا کی خیالی آسائش و حفاظت سے دست برداری کا حکم دیا گیا تھا، تجھ سے کہتے ہیں عینک اُتار ڈال یعنی منکر زمانہ کے طریق دید کو ترک کردے تو نے تعمیل کی آدھی رات کو تاریکی میں تصور جما کر بیٹھ گیا، اور تجھ پر واردات طاری ہوئی کہ تاریکی ہی مظہر نور ذات ہے۔ سورج چاند ستارے اور زمین کی سب روشنیاں مظہر انوار ذات کہی جاتی ہیں مگر یہ سب غلط ہے مگر یہ تو نور ذات کا عکس ہیں اصلی نور تو اندھیرا ہے اور روشنی اس کا حجاب بنائی گئی ہے۔

پھر قلب پر مثالیں طاری ہوئیں (۱)۔ ابر رحمت آتا ہے۔ سورج کا چہرہ ڈھک جاتا ہے اندھیرا ہو جاتا ہے، جب کہیں قطرات رحمت زمین پر نازل ہوتے ہیں (۲) سورج کی تیز دھوپ میں جبکہ تیرا کمرہ خوب روشن ہو، کواڑ بند کرکے تاریکی آجائیگی، سمجھ کہ تاریکی اصلی تھی۔ اور روشنی عارضی، جب عارضہ کو رد کا اصلیت ظاہر ہوگئی (۳) روشنی پردہ فاش کرتی ہے اس واسطے وہ مظہرات نہیں ہو سکتی، کہ ذات الہٰی پردہ پوش ہے، تاریکی کو دیکھ وہ سب کی پردہ پوشی کرتی ہے

(۴) یورپ روشنی کا دلدادہ ہے، سمجھ لے کہ یہ دلیل بھی تاریکی کی منظہر نورذات ہونیکی ہے، کیونکہ یورپ منکر ذات ہے اسی لئے تو وہ عکس نورذات کا شیفتہ ہے (۵) یورپ بھی جب سوتا ہے روشنی کو دُور کرتا ہے، کیونکہ سکون تاریکی سے پیدا ہوتا ہے، اور روشنی نیند کے سکون میں حارج ہوتی ہے، تو جان لے کہ تاریکی مظہر ذات ہے، جب ہی تو وہ سکون بخش نظر آتی ہے،

اے انسان آفتاب و ماہتاب کو نورانی ہونے کے سبب جو معبود بنایا جاتا ہے یہ بڑی غلطی ہے کہ روشنی تو جمال جاناں کی نقاب ہے، اصل چہرہ تو ہیکل تاریکی میں مخفی ہے، مگر یاد رکھ کہ تاریکی خدا نہیں ہے بلکہ مظہر ذات الہی ہے، پس تاریکی کو اسکے قرب کا اور اس کے تصور کا آئینہ سمجھ، خود تاریکی کو اصل سمجھنے کی خطرناک غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیو؎

(درویش دہلی)

---

مسلمانوں میں ترک وہ قوم ہے، جو یورپ کے پڑوس میں آباد ہے، جدید تعلیم و تمدن سے آگاہ ہے، یورپ کی ہر چیز جو تم صرف سُن کر نقل کرتے ہو وہ اُسکا مشاہدہ ہے، وہ محکوم نہیں، حاکم ہے، بااین ہمہ ٹرکی کا نامور مصلح، جدید ترکی نشوونما کا بانی، اور ترکی قوم کے لئے آئندہ شاہراہِ عمل تیار کرنے والا مہندس اور قوموں کی ترقی و تنزل کے اسرار کا رازدان، یعنی عزیز اسلام غازی مصطفیٰ کمال پاشا جس نے یورپین تمدن کے سرخط و خال کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے، اُس نے انگورہ کی مجلس ملی کے سامنے کچھ دن ہوئے کہ خلافت، تمدن جدید، یورپین تمدن، اصلاحات دینی، اور علمائے اسلام کے فرائض کے متعلق ایک نہایت مصلحانہ تقریر کے خاتمہ میں غازی موصوف نے فرمایا:-

"ہم کو چاہیئے کہ اپنے تمدن کو اپنے ملک کی حالت، اور اپنی تاریخ، اور اپنی ضرورتوں اور عادتوں کے مطابق بنائیں، اور اس طرح زیادہ بہتر طریق سے ہم متمدن قوموں میں ایک خاص امتیاز حاصل کر لینگے، اگرچہ ہمارے ملک کے روشن خیالوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ملک و ملت کی بھلائی اسی میں ہے کہ متمدن قوموں کی ٹھیک ٹھیک تقلید کریں، لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ممکن ہے کہ ایک چیز جو ایک قوم کی خوش قسمتی اور ترقی کا ذریعہ ہو، وہ دوسری قوم کی بدبختی اور بربادی کا باعث ہو جائے؎

غازی موصوف کا کہنا بالکل درست ہے، ہر قوم کے تمدن کا مزاج اُس قوم کے ملک، جائے سکونت، آب و ہوا، خصوصیات نسلی، گذشتہ رسم و رواج، احکام مذہبی، اور سینکڑوں عنصروں سے مل کر صدہا سال میں تیار ہوتا ہے، اس لئے ایک قوم کو دوسری قوم کی تقلید محض تباہی اور بربادی ہے، "نیچری لوگ" ہر چیز کو "نیچر کے مطابق" ہونے کو سب سے بڑی دلیل سمجھتے ہیں، اس لئے اُن سے یہ عرض کرنا ہے کہ ایشیا اور یورپ کی حیوانی اور نباتاتی مخلوقات میں جب باہم فطرۃً اس درجہ بُعد اور شکل و صورت کا تناقض ہے، تو ان دونوں براعظموں کی انسانی مخلوقات کیوں ایک دوسرے کی یکسانی اور تقلید محض کی جویاں ہیں؟

(معارف)

---

# توریت سے بارہ ہدایات

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے توریت شریف سے بارہ کلمات انتخاب کئے ہیں۔ اور ہر روز تین مرتبہ ان میں غور کرتا ہوں اور وہ بارہ کلمے یہ ہیں:۔

**کلمہ اول**۔ حق عز و جل فرماتے ہیں کہ اے آدم کے بیٹے تجھے کسی حاکم کسی دشمن حتیٰ کہ جن اور شیطان سے بھی جب تک میری بادشاہی ہے ہرگز نہ ڈرنا چاہیئے۔

**کلمہ دوم**۔ اے آدم کے بیٹے تو کسی کی قوت اور طاقت اور اس کا باعث روزی ہونے سے خوف نہ کھا۔ اس وقت تک کہ میرے خزانہ میں تیرا رزق ہے اور میں تیرا محافظ ہوں اور میری طاقت غیر فانی اور میرا خزانہ ہرگز خالی نہ ہونے والا ہے۔

**کلمہ سوم**۔ اے آدم کے بیٹے۔ جب تو ہر طرف سے درماندہ۔ عاجز لاچار اور مجبور ہو جائے اور کہیں سے تجھے کچھ نہ ملے اور نہ کوئی تیری فریاد کا شنوا ہو۔ ایسی حالت میں اگر تو مجھے یاد کرے اور مجھ سے مانگے البتہ میں تیری فریاد کو پہنچونگا۔ اور جو تو مانگیگا دونگا۔ کہ میں سب کا حاجت روا اور ان کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہوں۔

**کلمہ چہارم**۔ اے آدم کے بیٹے تحقیق میں تجھے دوست رکھتا ہوں۔ تجھے بھی لازم ہے کہ تو میرا

ہوجا اور مجھے دوست رکھ +

**پانچواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے میری جانب سے امن میں نہ رہ جبتک تو پلصراط سے پار نہ ہوجائے +

**چھٹا کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تجھے مٹی سے بنایا۔ اور نطفہ کو مادر رحم میں ڈال کر اسکا خون جما ہوا کر کے گوشت کا لوتھڑا کیا۔ پھر صورت و شکل رنگ تجویز کر کے اس میں ہڈیاں بنائیں اور اپنی روح اسمیں ڈالی پھر تجھے بعد مدت معہودہ اس عالم اسباب میں پیدا کیا۔ تیرے بنانے اور پیدا کرنے میں مجھے کسی قسم کی دشواری نہ ہوئی۔ پس تو یہ سمجھ کہ جس نے ایسے ایسے عجیب امور کا انصرام کیا۔ کیا وہ تجھے دو روٹی نہ دے سکیگا۔ پھر تو مجھے چھوڑ کر کیوں غیر سے طلب کرتا ہے۔

**ساتواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تمام اشیا جو روئے زمین پر ہیں تیرے واسطے پیدا کی ہیں اور تجھے خالص اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ حیف ہے کہ تو نے اپنی ذات کو ان اشیا پر مبتلا کیا جو میں نے تیرے لئے بنائی تھی۔ اور تو مجھے بھول گیا۔

**آٹھواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے سب چیزیں اور تمام آدمی مجھے اپنے لئے چاہتے ہیں اور میں تجھے صرف تیرے لئے چاہتا ہوں اور تو مجھ سے بھاگتا ہے +

**نواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے تو اپنے نفس کی اغراض کے واسطے مجھ پر غصہ کرتا ہے اور اپنے نفس پر میرے لئے غصہ نہیں کرتا +

**دسواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے میرے حقوق تجھ پر ہیں اور تیرا حق مجھ پر روزی رسانی کا ہے تو اکثر میرے فرائض بجا نہیں لاتا۔ بلکہ انکے خلاف عمل کرتا ہے لیکن میں تیرے کردار پر خیال نہ کر کے برابر تجھے رزق دیتا ہوں

**گیارھواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے تو مجھ سے آنیوالی کل کی روزی طلب کرتا ہے اور میں تجھ سے اس روز کے فرائض کی بجا آوری نہیں چاہتا +

**بارھواں کلمہ** ۔ اے آدم کے بیٹے۔ اگر تو اپنی قسمت پر جو میں نے تیرے لئے مقسوم کی ہے۔ راضی رہے تو بہت آرام اور آسایش سے رہیگا۔ اور اگر تو اسکے برخلاف میری تقدیر سے جھگڑا اور اپنے مقسوم پر راضی نہ ہوا۔ میں تجھ پر دنیا کو مسلط کر دونگا۔ وہ تجھے خراب خستہ کریگی اور تو کتے کی طرح دروازوں پر مارا مارا پھریگا اور اس سے زیادہ کبھی نہ پائیگا۔ جو میں مقدور کر چکا ہوں +

(الصالح دہلی)

# حصۂ نظم

## بے قافیہ

### "یہی جی چاہتا ہے اور جی لیں"

نہ جانیں کیا کشش ہے زندگی میں!　　کہ بھرتا ہی نہیں جی زندگی سے!!

نہیں پروا فلک کی دشمنی کی!　　غم و اندوہ نازل ہوں بلا سے!

بلا سے بر نہ آئے کوئی امید!　　بلا سے حسرتوں سے سامنا ہو!

نہیں پروا نہ نکلیں دل کے ارماں!　　تمنائیں مٹیں ایک ایک کر کے!

نہالِ آرزو مرجھا کے رہ جائے!　　امنگیں پھولنے پھلنے نہ پائیں!

بلا سے ولولے ہوں زندہ درگور!　　تڑپتی ہوں ترنگیں خاک و خوں میں!

بلا سے برقِ خرمن سوز ہو یاس!　　بلا سے نا امیدی ہو بغلگیر!

یہی جی چاہتا ہے اور جی لیں!　　شرابِ تلخ ہستی اور پی لیں!

"چہ لذت یارب اندر ہست و بود است!
کہ ہر کس کشتۂ تیغِ نمود است!"

امینِ حزیں

---

# جذباتِ عشق

اب وہ نہ صدماتِ فرقت۔ اب نہ وہ آفاتِ عشق　　ہو چکا ترکِ تعلق۔ مٹ گئے جذباتِ عشق

اب نہ وہ ربطِ محبت۔ اب نہ وہ خبطِ دفا　　رہ گیا اک داغِ دل منجملۂ برکاتِ عشق

میں فنا ہو کر۔ کرونگا طے۔ بقا کی منزلیں　　درحقیقت ہے نہاں اس نفی میں اثباتِ عشق

ایک کو دو دیکھنا تھا۔ چشمِ ظاہر کا قصور　　ایک نکلیں ایک بالکل ذاتِ حسن و ذاتِ عشق

اے اُمیدِ لُطفِ جاناں۔ مرحبا صد مرحبا
زندہ کردی زندہ تو نے حسرتِ مافاتِ عشق

خونِ دل آنسو بنے اور آنسوؤں سے آہِ سرد
منتشر ہو کر فضا میں رہ گئے ذرّاتِ عشق

داغ جو تم نے دئے ہیں سب کے سب محفوظ ہیں
میں نے سینے سے لگا رکھی ہے یہ سوغاتِ عشق

اور کیا باقی رہا ہے۔ اکبرِ محزوں کے پاس
چند آہیں رہ گئی ہیں حاصلِ نغماتِ عشق

اکبر خاں حیدری

---

# تتلی

یہ تیرے پر ہیں یا ہیں نامۂ پرشوق کے پُرزے
جنھیں اک حسن بے پروا نے لیکر اپنے ہاتھوں سے

کیا ہے بازوؤں کی جا بصد موزونیت چسپاں
پھر اُن میں جذبۂ بیتابیٔ الفت نے ڈالی جاں

نہیں گر اشتہارِ عشق تو پھر تو بتا کیا ہے
سواد نور سے کیا بازوؤں پر تیرے لکھا ہے

نہیں ہرگز پے دفعِ گزندِ چشم یہ نقطے
کہ ہیں خوش وضع تر خالِ ملیحِ روئے خوباں سے

میں سمجھا پر نہیں کہتا کہ ہو گی اس کی رسوائی
کہ جس کے حسن انداز آفریں کو یہ ادا بھائی

ہے تیرا حسن پرتو افگنی سے نور یزداں کی
مگس سے نوشِ گل کی یا سکونت سے گلستاں کی

ملا یہ فیض تجھ کو کیا گلوں کی میزبانی سے
کہ جیسے ماہ تابندہ ہے خور کی ضو فشانی سے

نہیں یہ بھی نہیں پھولوں سے ہے تیری جدا خوبی
کہ واں اک سادگی ہے اور بلا کی تجھ میں پرکاری

ہوا کے بازوؤں پر حسنِ گل بُو بن کے اڑتا ہے
صبا پر حسن تیرا نقشِ نیکو بن کے اُڑتا ہے

جھلکتا ہے تو بھی اُس حُسنِ ازل کی جس نے دے ڈالے
چمن کو پھول اور پھولوں پہ تجھ سے بیٹھنے والے

عبد الجلیل خاں رامپوری

---

# غم نہ کر

دُنیا تو رات بھر کا ٹھکانہ ہے۔ غم نہ کر!
اور زندگی ہماری فسانہ ہے۔ غم نہ کر!

اِس کارگاہ میں ہو ٹھہرنے کا کیوں خیال؟
آنا یہاں کبھی کبھی جانا ہے۔ غم نہ کر

مٹی سے بن کے مٹی میں پلتا ہے تیرا جسم
مٹی کے نیچے اُس کو سمانا ہے۔ غم نہ کر

تُو تھا خدا کے پاس خُدا ہی کے پاس ہے
تجھ کو خدا کے پاس ہی جانا ہے۔ غم نہ کر

---

آیا ہے تجھ کو حکم کہ سُن آ کے میری بات
قدرت کا بھید تجھ کو بتانا ہے۔ غم نہ کر

دُنیا کی شورشوں میں بُلاتا ہے وہ تجھے
اِک گیت تیری رُوح کو گانا ہے۔ غم نہ کر

جو مر گئے یہ رو کے نہ کہہ "وہ کدھر گئے"؟
گھر میں خدا کے اُن کا ٹھکانا ہے۔ غم نہ کر

آتی نہیں جہاں میں کبھی زندگی کو موت
خود موت زندگی کا نشانہ ہے۔ غم نہ کر

اللہ کے پاس زندگیوں کی کمی نہیں
دے دے کے موت تجھکو جِلانا ہے غم نہ کر

---

غم کر کے کون دہر میں غم کو مِٹا سکا؟
آ کر رہیگا غم بھی جو آنا ہے غم نہ کر

جس زندگی میں تجھ کو ملی ہیں یہ نعمتیں
اُس زندگی میں دُکھ بھی اُٹھانا ہے غم نہ کر

جو غم کرے وہ دی ہوئی نعمت کو کم کرے

جو کچھ ملا ہے اُس کو بھی پانا ہے غم نہ کر
غم میں بھی خوش ہو غم ہے اُسی کا دیا ہُوا
کچھ تجھ کو رنج و غم میں دکھانا ہے غم نہ کر
غم نے وضو سے اشک سے دھوئے ترے گناہ
غم تیرا اک نمازِ دوگانہ ہے غم نہ کر
دینِ خدا میں رنج و الم اک گناہ ہے
گر اس گنہ کو دل سے مٹانا ہے غم نہ کر
غمگیں وہی ہیں جن کو خدا پر نہیں یقیں
گر مُنہ تجھے خُدا کو دکھانا ہے غم نہ کر

---

ہمدرد کون؟ درد ہی ہمدرد ہے ترا
مرہم یہ زخمِ دل پہ لگانا ہے غم نہ کر
سمجھے ہیں کچھ جو رہتے ہیں ہر حال میں وہ خوش
دُکھ سُکھ میں جی جہاں میں لگانا ہے غم نہ کر

---

فرمانِ حق ہے خلق کی خدمت ہے زندگی
جو رو رہے ہیں اُن کو ہنسانا ہے غم نہ کر
دوزخ بھی تیرا دل ہو تو آدروں کو شاد کر
دُنیا کو گر بہشت بنانا ہے غم نہ کر

---

مقصود ہے بُرائی میں نیکی کا ہو ظہور
اے دل! بُرائی ایک بہانہ ہے غم نہ کر
ہر آئینے میں ایک ہی چہرے کا عکس ہے
دُنیا بھی ایک آئینہ خانہ ہے غم نہ کر

---

شُکرِ خدا کہ پیار کو چاہت ہے پیار کی
مشتاق تیرا ایک زمانہ ہے غم نہ کر
اے زار نیک بن جو خدا کی تلاش ہے
نیکی ہی میں خدا سے یگانہ ہے غم نہ کر

# درسِ عمل

نہ طوافِ کعبہ کا عزم کر، نہ جبیں کو نذرِ صنم بنا!
ترا دل ہے دیر و حرم اسی کو حریفِ دیر و حرم بنا!

یہ ہے انتقامِ ستمگری کہ ستم پذیر نہ بن کبھی!
جو مٹے تو پیکرِ پائمال کو یادگارِ ستم بنا!

تری قوم ہے تری آبرو، اسی آبرو کو تلاش کر!
کبھی "تو" سے "آپ" بھی بن ہی جائیگا پہلے "میں" کو تو "ہم" بنا!

ترے دل کا جامِ سفال جامِ جہاں نما ہے ترے لئے!
اسے اپنا ساغرِ جم سمجھ، اسے اپنا ساغرِ جم بنا!

مٹے دیر و کعبہ کی کشمکش، یہی شیخِ کعبہ تو کام کر!
کہ صنمکدہ کے پجاریوں کو شریکِ بزمِ حرم بنا!

تاجور

# جذباتِ عالیہ

## جلیل

لاکھ دل مست ہو مستی کا عیاں راز نہ ہو
یہ وہ شیشہ ہے کہ ٹوٹے بھی تو آواز نہ ہو

دل بہت بلبلِ شیدا کا ہے نازک گلچیں
پھول گلزار کے یوں توڑ کہ آواز نہ ہو

آفریں طرزِ ستم پر کہ ستم پر اُن کے
آہ کرتا ہوں تو کہتے ہیں عیاں راز نہ ہو

ہاتھ رُکتا ہے دمِ ذبح خدا خیر کرے
نذرِ شمشیرِ اجل آپ کا جانباز نہ ہو

قفس و دام کی آفت غمِ بے بال و پری
سب ہے آسان اگر حسرتِ پرواز نہ ہو

لطفِ توبہ شکنی کیا اگر اپنی توبہ
ٹوٹ کر قلقلِ مینا کی ہم آواز نہ ہو

قطرۂ خوں پہ جو آنکھوں سے ٹپک جاتا ہے
تم تو ہنستے ہو تمہارا ہی کہیں راز نہ ہو

تھام لینے دو کلیجہ مجھے ہاتھوں سے جلیل
قصّۂ دردِ جگر کا ابھی آغاز نہ ہو

## خورشید

مری آہ خروشاں میں فنا کا رنگ پنہاں ہے
مرا تارِ نفس گویا شعاعِ شمعِ سوزاں ہے

ضیائے داغِ دل سے روشن اب اپنا شبستاں ہے
جہاں ظلمت ہی ظلمت تھی وہاں بزمِ چراغاں ہے

نشاطِ آہنگ ہر ہر ولولہ اُٹھتا تھا جس دل میں
وہاں اک نالۂ شبگیر اپنا مرغِ شبخواں ہے

ملی وارستگی جب رشتۂ وابستگی توڑا
دلیلِ راہِ آزادی، مرا چاکِ گریباں ہے

خیالِ یار اک شئے ہے تصور دوسری شئے ہے
وہ غم افزا ہے، اور یہ غمگسارِ دردِ پنہاں ہے

سراسر اسکی حالت سے ہے ثابت خونِ پروانہ
ہے گو ثابت قدم لیکن زبانِ شمع لرزاں ہے

اسیرِ دامِ دنیا اپنے ہاتھوں آپ رہتا ہوں
خیال اپنے سلاسل ہیں، دل اپنا کنجِ زنداں ہے

کئے جا ظلم او بیدادگر، اب کچھ نہ بولوں گا — بروز حشر، میرا ہاتھ ہے اور تیرا داماں ہے

سفر خورشید کی قسمت میں ہے ہر دم وہ کیا جانے
کسے صبح وطن کہتے ہیں، کیا شام غریباں ہے

## احسن مارہروی

تجھے ڈھونڈینگے ہم باہر نہ گھر میں — جو آنکھیں ہیں تو سب کچھ ہے نظر میں
بہم ہیں خیر و شر اک فتنہ گر میں — کہ اعجاز آنکھ میں جادو نظر میں
شب فرقت کی اللہ رے درازی — ہوئی عمر اپنی آخر رات بھر میں
تری حسرت لئے پھرتی ہے دل کو — مکیں کے ساتھ ہے گھر بھی سفر میں
بدل منظور اگر ہوں یوں نظر بند — کہ تم رکھو ہمیں اپنی نظر میں
سن او نقش قدم مٹوانے والے — پڑے ہیں ہم بھی تیری رہگذر میں
نہ دیکھا عمر سا کوئی مسافر — کہیں منزل نہیں جس کے سفر میں
وہ ہم سے لیکے دل دشمن سے چھوٹے — یہ اچھا نفع ہاتھ آیا ضرر میں
ہماری آبرو اے ضبط رکھ لے — کہ ہے اک بوند باقی چشم تر میں
لچک نے اس کی ہم کو مار ڈالا — بڑے دم خم کی سیفی ہے کمر میں

غضب تھا ضعف راہ شوق احسن
اٹھا اک قدم دو دوپہر میں

## آزاد سہارنپوری

تلوّن دکھانے سے کیا فائدہ — تحیر بڑھانے سے کیا فائدہ
لبھا کر ستانے سے کیا فائدہ — لگا کر بجھانے سے کیا فائدہ
محبت جتانے سے کیا فائدہ — پتنگے لگانے سے کیا فائدہ
جو آنا ہے، دکھ کی دوا بن کے آ — قضا بن کے آنے سے کیا فائدہ

ستانا روا ہے تو بے شک ستا — مگر بھول جانے سے کیا فائدہ
جو خوفِ خدا ہے، تو غافل نہ ہو — غلط قسم کھانے سے کیا فائدہ
کہیں اہلِ طاعت کی پرسش نہیں — جبینیں گھسانے سے کیا فائدہ
اب آنکھوں کے آگے وہ جلوے کہاں — اب آنکھیں اٹھانے سے کیا فائدہ
مقاصد کے در زورِ بازو سے کھول — فقط کھٹکھٹانے سے کیا فائدہ
بس اے فتنۂ قامتِ یار بس — بہت سر اٹھانے سے کیا فائدہ
بس اے جلوۂ محشر آثار بس — بہت قہر ڈھانے سے کیا فائدہ
تھم اے گردشِ چشمِ مخمور تھم — پیالے پلانے سے کیا فائدہ
تھم اے بارشِ بادۂ نور تھم — دمادم چھکانے سے کیا فائدہ
جنونِ تجسس کہاں لے چلا — پریشاں پھرانے سے کیا فائدہ
نظامِ دو عالم بگڑ جائے گا — غمِ دل سنانے سے کیا فائدہ
سزا کے مزے لوٹنے دیجئے — خطا بخشوانے سے کیا فائدہ
اوائل میں یعنی دمِ جوشِ عشق — عواقب سمجھانے سے کیا فائدہ
اب آزاد اٹھو اور سوئے راہِ حق — بڑھو ہچکچانے سے کیا فائدہ

## حسرت موہانی

تجھ سے جو دردِ دل کا بھی ہوتا نہیں علاج — ہے کس مرض کی اور تو اے نازنیں علاج
اہلِ ہوس کے دردِ تمنا کا برمحل — کرتی ہے خوب وہ نگہِ خشمگیں علاج
بیمارِ غم ہوئے ہوں جو تیرے فراق میں — ایسوں کا تو ضرور ہے اے مہ جبیں علاج
پایا کہیں کسی نے بھی ہے دردِ عشق کا — کوئی بھی اے طبیب ترا دلنشیں علاج
اس دل کو اب گداز کرے فکرِ عاشقی — جسکا نہ کر سکے غمِ دنیا و دیں علاج
پھر کیوں دوائے درد کے درپے ہے چارہ گر — جب خود ہی چاہتی نہیں جانِ حزیں علاج
حسرت شرابِ وصل سے صحت جو ہو تو ہو — دل کا نہیں ہے ورنہ مے و انگبیں علاج